سچ کا سفر

صدرالدین ہاشوانی

سچ کا سفر
صدرالدین ہاشوانی

JUMHOORI

سچ کا سفر

صدرالدین ہاشوانی

جمہوری پبلیکیشنز

SADRUDDIN HASHWANI

TRUTH
ALWAYS PREVAILS
A Memoir

First Published in English, 2014

Urdu Version " **Such KA Safar** "

Published by Jumhoori Publications - Pakistan

November 2014

Publisher : Farrukh Sohail Goindi

انتساب

میرے شفیق والدین

زیور بائی اور حسین ہاشوانی

کے نام

فہرست

عرضِ ناشر		09
اظہارِ تشکر		11
تعارف		13
دیباچہ		27
باب 1	مشکلات اور رکاوٹیں	38
باب 2	میری تربیت	53
باب 3	1960ء کی ہنگامہ خیز دہائی	64
باب 4	کپاس کا بادشاہ	77
باب 5	ذوقِ میزبانی	88
باب 6	اپنے ہی وطن میں مفرور	105

باب 7	موتیوں کی لڑی	118
باب 8	دلکش نظارہ اور نیا منصوبہ	130
باب 9	سیاستدانوں کی دہائی	152
باب 10	جنگی جنون	175
باب 11	آگ کے حلقے میں!	191
باب 12	نئے افق، پرانے خواب!	210
باب 13	ایک نئے دور کا آغاز	221

عرضِ ناشر

''مجھے اپنے لوگوں کی لائقِ رشک صلاحیتوں پر بھروسا ہے، میں پاکستان کی بقا اور مستقبل پر یقین کامل رکھتا ہوں، اور سب سے بڑھ کر میں ذات باری تعالیٰ پر غیر متزلزل ایمان رکھتا ہوں۔''

یہ تین انمول موتی اور حیات آفریں اصول پاکستان کی اُس عظیم کاروباری شخصیت کی خودنوشت سوانح عمری کا نچوڑ اور خلاصہ ہیں جسے دنیا صدرالدین ہاشوانی کے نام سے جانتی ہے۔ اس سوانح عمری کے ابتدایے میں محترم ہاشوانی صاحب کی مخاطب پاکستان کے نوجوان اور نسلِ نو ہے۔ یہ امر پاکستان کی نوجوان نسل سے ان کی بے پناہ محبت اور الفت کا مظہر ہے اور اسی مقصد کے پیشِ نظر انہوں نے پاکستانی عوام، خصوصاً نوجوان نسل کو محنت کی عظمت سے روشناس کرانے کی حقیقت پسندانہ اور عملیت پسندانہ کوشش کی ہے۔

جناب صدرالدین ہاشوانی نے اپنی زندگی کو بطور مثال پیش کرتے ہوئے نوجوانوں کو یہ بتانا چاہا ہے کہ زندگی میں ایمان داری، غیر متزلزل عزم اور اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان انسان کی ذاتی، اخلاقی، مذہبی اور پیشہ ورانہ زندگی میں پیش ہر رکاوٹ کو دُور کر دیتا ہے۔ یقیناً وہ ان معمارانِ قوم میں سے ہیں جنہوں نے اپنا جہان خود پیدا کیا...... اپنی کدال سے اپنا راستہ خود تراشا ہے۔

بچپن میں گلی ڈنڈے ایسے روایتی کھیل سے شغف، نوعمری میں کرکٹ کا بڑا

کھلاڑی بننے کی آرزو، والدہ کی خواہش کی تکمیل کے لیے پری میڈیکل میں داخلہ جناب ہاشوانی کی زندگی کے کچھ ایسے پہلو تھے جو آنکھ کی جھپکی میں نمودار ہوئے لیکن پھر کاروباری اور تجارتی سرگرمیوں پر توجہ ان کی زندگی کا اہم موڑ بنی، اس پیشے میں عروج حاصل کرنے کا مقصد اور پھر اس راستے میں پیش آنے والی رکاوٹوں کا جناب ہاشوانی نے صبر وتحمل، جرأت و بہادری اور اللہ تعالیٰ پر بھروسے جیسے طاقتور ہتھیاروں سے لیس ہو کر مقابلہ کیا۔ یہ تمام حالات، ان پاکستانی نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ہیں جو اپنی زندگی کے عملی سفر کا آغاز کرنا چاہتے ہیں یا کر رہے ہیں۔

پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں جہاں مادی وسائل کی کمی ہے، وہاں بلاشبہ اس کی سرکاری اشرافیہ بھی ذہنی افلاس میں مبتلا ہے اور یہ حقیقت ان رکاوٹوں اور مشکلات کے ذکر سے بخوبی اجاگر ہو جاتی ہے جو جناب صدرالدین ہاشوانی کو اپنے کاروبار کے قیام وترقی کے راستے میں پیش آئیں، لیکن انہوں نے ایک سچے مسلمان اور پاکستان کے ایک وفادار محنتی شہری کی حیثیت سے اپنی والدین کی تربیت کو اپنی زندگی کا اثاثہ سمجھتے ہوئے، ان مشکلات اور رکاوٹوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ راہ کی ہر مشکل نے انہیں ولولہ تازہ دیا۔ وہ پُر خار راستے پر چلتے رہے، تلوے سہلاتے رہے مگر رُکے نہیں۔ نتیجتاً، کامیابی کی روشن منزل پر پہنچ کر دم لیا۔ جناب ہاشوانی نے اپنی اس سوانح عمری میں خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی ذات سے محبت اور اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان کے باعث اس قدر ذہنی سکون کی دولت سے مالا مال ہیں کہ وہ جب دن بھر کی سرگرمیوں کے بعد پُرسکون نیند کی نعمت سے مستفید ہوتے ہیں تو مطمئن ہوتے ہیں کہ انہوں نے دن بھر اپنے ضمیر کے مطابق کام کیا اور کسی انسان کو انہوں نے دُکھ نہیں پہنچایا۔ ''سچ کا سفر'' یہی درس اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

فرخ سہیل گوئندی

اظہارِ تشکر

میں خاص طور پر اپنی پیاری بیٹی سارہ ہاشوانی کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جس نے یہ خود نوشت لکھنے کے لیے مجھے مائل کیا، میں نے اسی کی خواہش کی تکمیل میں نوجوان نسل کو اپنے تجربے اور اپنی زندگی کی جدوجہد سے مستفید کرنے کے لیے یہ یادداشتیں تحریر کی ہیں۔

میں مدثر شہزاد اور نصراللہ ملک کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے پاکستان کے نوجوانوں کی خاطر ''سچ کا سفر'' کی اشاعت میں مجھے معاونت فراہم کی۔

میں اشوک ملک کا خصوصاً شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے ان یادداشتوں کو مرتب کرنے میں میری مدد کی۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے زندگی بھر کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ انہوں نے میری اس پہلی کتاب کی تکمیل کے سلسلے میں میری بے پناہ مدد کی۔ میں جانتا ہوں کہ لکھنے کا یہ سلسلہ اب جاری رہے گا۔

تعارف

پاکستان کے نوجوانوں کے نام.....

میں کون ہوں اور مجھے یہ کتاب سپرد قلم کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ یہ کتاب میری زندگی کے نشیب وفراز کی گواہ اور بھرپور عکاس ہے، اسے میں نے اسی بھرپور جوش، توانا جذبے اور خوش امیدی سے سرشار ہوکر تحریر کیا ہے جن کے سہارے میں نے اپنی ہمہ رنگ اور متنوع زندگی بسر کی ہے۔ ایک ایسی زندگی جو خیر خواہوں کے جھرمٹ اور بدخواہوں کے ہجوم میں گھری ہوئی تھی۔ ایک طرف دنیا کی خوش رنگ رعنائیاں مجھے مہمیز دے رہی تھیں تو دوسری جانب اس کی منفی توانائیاں قدم قدم اور سانس سانس میری راہ میں پہاڑ بن کر کھڑی تھیں۔ اس کے باوجود میں شاہراہ زندگی پر رواں دواں رہا۔ میں رکا نہیں..... ٹھہرا نہیں..... تھکا نہیں..... اور..... بھٹکا نہیں۔ نتیجتاً اپنے اہداف تک رسائی کی منزل میں نے بخیر وخوبی سر کی۔ میں نے زندگی کا سفر کامیابی سے طے کیا۔ میں یہ سب کچھ ان تھک محنت اور جہد مسلسل کی بدولت حاصل کرنے میں کامران رہا۔ اسی تناظر میں اپنی اس کتاب کو اس ملک پاکستان کے نوجوان مرد وخواتین کے نام کرتا ہوں جو جنوبی اور وسطی ایشیا کے سنگم پر واقع ہے۔ میری دعا ہے کہ میری یہ کتاب انہیں شعور وادراک کی روشنی عطا کرے۔ میری یہ بھی دعا ہے کہ میری یہ کوشش زندگی کے ہر نشیب وفراز میں ان کے لیے رہنما اور مددگار ثابت ہو۔ میری یہ دلی خواہش اور تمنا ہے کہ یہ کتاب مایوسی میں گھرے نوجوانوں کے لیے امید کی روشنی

ثابت ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اُمید اور رجائیت کی وہ کرن جس سے میرا من منور ہے، نوجوانوں کو ایک بہتر پاکستان اور روشن مستقبل کی نوید سے ہمکنار کرے۔ ایک ایسا بہتر پاکستان اور روشن مستقبل جہاں 20 کروڑ انسان عادلانہ، صاف ستھرے اور خوشحال معاشرے کی تشکیل کے لیے سرگرمِ عمل ہوں کیوں کہ یہ ان کا استحقاق ہے۔

یادداشتیں بالعموم زندگی کی فتوحات کے ذکر پر مبنی ہوتی ہیں۔ میں اس کتاب کو اپنی کامیابیوں کا اشتہار نہیں بنانا چاہتا بلکہ اس کتاب کے ذریعے اپنے ملک، عوام اور سب سے بڑھ کر خدائے بزرگ و برتر کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جس نے میری آرزوؤں، امنگوں اور نیک خواہشات کے صدقے مجھے میرے استحقاق سے کہیں بڑھ کر اپنی عنایات اور نعمتوں سے نوازا۔ میں لاکھ کوشش بھی کروں تو اس عطا کرنے والے رحیم وکریم رب کا شکر ادا نہیں کرسکتا۔

اگر پاکستان کے حالات سازگار، حکمرانوں کے عزائم مخلصانہ اور اقدامات عوام دوست اور ریاست نواز ہوتے تو اس مملکت کے عوام کی زندگی کہیں آسودہ اور خوشحال ہوتی۔ مگر بدقسمتی سے پاکستان میں کبھی صورت حال اتنی خوشگوار نہیں رہی۔ یہ کتاب محض میری کامیابیوں اور کاروباری فتوحات کی البم اور مجموعہ نہیں بلکہ یہ ایک ایسے کاروباری شخص کی داستانِ حیات ہے جسے ایک کاروباری ادارہ قائم کرنے کے لیے بدعنوان سیاستدانوں، آمر حکمرانوں اور حالات کے جبر کے خلاف سینہ سپر ہونا پڑا۔

میرا ایمان ہے کہ کسی بھی کاروباری ادارے کے قیام واستحکام اور فروغ کی اوّلین شرط اور حتمی ضمانت شفافیت ہے۔ شفافیت ہی کی کوکھ سے روزگار کے فروغ کے مواقع جنم لیتے ہیں۔ شفافیت اور مواقع، وہ عناصر نہیں جو سیاستدانوں اور آمروں کو ان کی عوامی زندگی میں درکار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شفافیت کے ذریعے روزگار کے پُرکشش مواقع کی تخلیق کبھی بدعنوان سیاستدانوں اور آمروں کی اولین ترجیح نہیں رہی۔ وہ ذاتی مفادات کی تکمیل کے لیے ملازمتوں کی فراہمی کے نعرے لگا کر نوجوان نسل کو سیاسی مقاصد کے لیے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وہ محض جھانسا دیتے اور خوش نما وعدے کرتے ہیں۔ وہ جان

بوجھ کر روزگار اور ملازمتوں کے مواقع پیدا نہیں کرتے تا کہ معاشرے میں غربت پھیلے اور وہ ''غربت مکاؤ'' جیسے سستے اور جذباتی نعرے لگا کر اپنے مخفی مقاصد حاصل کر سکیں اور سیاسی دکان داری چلا سکیں۔ مقام افسوس کہ گزشتہ ساڑھے چھے عشروں سے زائد عرصے سے پاکستان کا مقدر یہی ناخوشگوار صورت حال بنی رہی ہے۔

مجھے مسلمان اور پاکستانی ہونے پر فخر ہے۔ میرا گھرانہ گزشتہ سات نسلوں سے پاکستان میں مقیم ہے۔ میں جب یہ کہتا ہوں کہ میری شعوری زندگی نے ایک آزاد قوم کے فرد کی حیثیت سے پاکستان کی تاریخ رقم کی تو یقیناً یہ کوئی مبالغہ اور خود ستائشی نہیں۔ میں اس سوہنی دھرتی کی تاریخ کے معاشی عروج و انحطاط، سماجی نشیب و فراز، کھیلوں کے شعبے میں کامیابیوں اور ناکامیوں اور عاقبت نااندیش حکمرانوں کی پیدا کردہ کساد بازاریوں کا چشم دید گواہ ہوں۔ میں پاکستانی عوام کے معصوم خوابوں، اُن کے باطن میں جنم لینے والے بے نام خدشوں اور بھیانک ڈراؤنے خوابوں سے پیدا ہونے والے محسوسات اور خیالات سے بھی بخوبی آگاہ ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں پاکستان کے بغیر کچھ نہیں۔ میں اس ملک اور اس کی تاریخ سے محض اس لیے واقف نہیں ہوں کہ میں یہاں پیدا ہوا یا مجھے اس ملک سے پیار ہے بلکہ اس ملک اور اس کی تاریخ سے میں اس لیے آشنا ہوں کہ میں اس ملک کے قدم بہ قدم اور شانہ بہ شانہ پلا بڑھا اور جوان ہوا۔ اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں اور پاکستان ہم عمر ہیں۔

1947ء میں پاکستان ایک آزاد ملک کی حیثیت سے وجود میں آیا اور اس کے قیام کے ساتھ کروڑوں عوام کی سنہری توقعات اور آرزوئیں وابستہ تھیں۔ یہ انسانی اور قدرتی وسائل سے مالا مال خطہ تھا اور یہاں اَن گنت زرعی وسائل بھی تھے۔ یہ صنعتی بنیاد کا حامل اور معدنی ذخائر سے بھرپور ملک تھا۔ اس کے پاس کراچی میں دوسری عالمگیر جنگ کے بعد وجود میں آنے والے ایشیا کی ایک نہایت ہی شاندار بندرگاہ تھی۔ کراچی اس نوزائیدہ مملکت کا ایک اہم شہر تھا، جو رنگوں، روشنیوں، گیتوں اور خوشیوں کا گہوارہ تھا۔ اس کے شہری اپنی ذمہ داریوں سے بخوبی آگاہ تھے اور وہ جواں ہمت بھی تھے اور ایک ایسا ملک تعمیر کرنے کے لیے پُرعزم تھے جہاں کسی بھی پس منظر سے قطع نظر امیر و غریب، تمام شہری یکساں احساس تحفظ کے

ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ متحد تھے اور کراچی کو منی پاکستان کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ تب یہاں کسی قسم کا کوئی تعصب اور نفرت نہیں تھی۔ محبّ وطن شہریوں کی خواہش تھی کہ یہ شہر یونہی محبتوں کا مٹھن کوٹ بنا رہے۔ یہ اُن کی خواہش بھی تھی اور خواب بھی۔

بدقسمتی سے یہ خواب محض جزوی طور پر شرمندۂ تعبیر ہوا۔ آج پاکستان کو تعلقات عامہ کے لحاظ سے بڑی مشکلات اور مسائل کا سامنا ہے اور عالمی سطح پر اب تشدد، عدم استحکام، گہری جڑیں رکھنے والی بدعنوانی، بیروزگاری کے مہیب سائے، بجلی کی بندش اور معاشی انحطاط ہی اس کی پہچان ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میرے ملک کا یہ تشخص کیوں بنا؟ گزشتہ 40 برس سے ہمسایہ ملک افغانستان میں بحرانی صورتِ حال پاکستان کے لیے مصائب اور پریشانیوں کا باعث بنی ہوئی ہے۔ 1979ء میں افغانستان پر سوویت یونین اور 2001ء میں امریکیوں اور اس کے اتحادیوں کی جانب سے یکے بعد دیگرے حملوں کے باعث پاکستان ان قوتوں کا تختۂ مشق بنا رہا ہے جس کی وجہ سے وسائل و ذرائع، معاشی استحکام اور امن و امان کے شعبوں میں پاکستان کو ناقابل تلافی نقصانات اٹھانا پڑے۔ خواہ یہ نقصان 30 لاکھ افغان پناہ گزینوں کی دیکھ بھال ہو یا پھر گولیوں، بموں، دہشت گردی اور خودکش حملوں کے ذریعے ہزاروں شہریوں اور فوجیوں کی زندگیوں کے تلف ہونے کی شکل میں ہو۔ یہ ایک کڑوا سچ ہے کہ بین الاقوامی دہشت گردی کی جنگ میں پاکستان نے دنیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ قربانیاں پیش کی ہیں۔

دنیا کی سپر پاورز کے لیے 1979ء کی جنگِ افغانستان اور وہ جنگیں جن کا آغاز 2001ء میں ہوا، محض شطرنج کی بھرپور چالیں ہیں۔ اگر مجھے اشارے کنایے میں بات کرنے کی اجازت دی جائے تو ایک ویڈیو یا کمپیوٹر گیم کے مانند منظرنامے پر ایک نامانوس اور اجنبی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس کھیل کا مقصد پاکستان کو ایک میدانِ جنگ کا روپ دینا ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ پاکستان کے لیے یہ جنگیں اور لڑائیاں عملی اور جذباتی طور پر نقصان دہ ہیں۔ ان طویل جنگوں اور لڑائیوں نے ہمارے عوام کی دو نسلوں کی توانائیاں نگل لی ہیں۔ ان تمام حالات کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پاکستان کا تشخص عالمی سطح پر مجروح ہوا۔ یہ ایک دردناک

حقیقت ہے کہ پاک سرزمین دنیا کے منظرنامے پر ایک ایسی مجروح اور مسخ شدہ شکل میں ابھری جس کا کسی سچے پاکستانی اور اسلام کے حقیقی پیروکار نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

ہم اس ناپسندیدہ صورت حال تک کیسے پہنچے اور ہم کس طرح اس صورتِ حال سے باہر نکل سکتے ہیں؟ یہی سوالات میں نے اس کتاب میں اٹھائے ہیں اور اپنی زندگی کے مشاہدات اور پیشہ ورانہ تجربات کے ذریعے ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ مجھے اعتراف کرنے میں کوئی مشکل نہیں کہ میں کوئی دانشور نہیں۔ میں نے دنیا کے متعلق کتابوں اور ڈاکٹریٹ کے مقالوں کے ذریعے نہیں سیکھا۔ میں نے عملی تجربات کے ذریعے دنیا سے آشنائی حاصل کی۔ میں نے بلوچستان کے ٹھنڈے صحراؤں میں ٹرکوں کے عقبی حصے میں بھی نیند کا ذائقہ چکھا ہے اور فائیو سٹار ہوٹلوں کے کمروں میں بھی سویا ہوں۔ الحمدللہ! مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے ان دونوں تجربات سے علم اور آگاہی حاصل کی اور میں نے خود پر سیکھنے اور علم کے حصول کا دروازہ کبھی بند نہیں کیا۔ بلاشبہ اگر آپ نبی اکرم حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں، مادی آسائشوں کو ترک کر دیں اور اپنی روح کی بالیدگی پر ہی اپنی توجہ مرکوز کریں، تو پھر اس سے واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ خواہ کھلے آسمان تلے سوئیں، ایسے صحرا میں سوئیں جہاں حالت نیند میں ریت آپ کے چہرے پر پڑ رہی ہو یا پھر کسی ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں نرم گدے پر محو استراحت ہوں۔

میں یہ کتاب اس لیے نہیں لکھ رہا کہ آپ کو یہ بتایا جائے کہ میں نے صحرا سے ہوٹل کے کمرے تک کا سفر کیسے طے کیا، انتہائی منکسر اور متوسط طبقے کے ایک فرد سے ایسا مقام کیسے حاصل کیا جہاں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مجھے ہر چیز بافراط حاصل ہے۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر فخر کیا جائے یا پھر اس حوالے سے کچھ تحریر کیا جائے۔ یہ سب کچھ بے سود ہی ہے۔ میں یہ وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا کہ میں اگرچہ بہت سی کمپنیوں اور کاروباری اداروں کے ساتھ وابستہ رہا لیکن جو ادارہ میرے لیے انتہائی طمانیت کا باعث ہے، وہ باشو فاؤنڈیشن ہے، جس کی چیئرپرسن میری بیٹی سارہ باشوانی ہے۔ اس فاؤنڈیشن نے بے شمار شعبہ ہائے زندگی، تعلیم، صحت عامہ، دودھ اور دودھ سے بنی اشیا کی تیاری اور شہد کے

حصول کے لیے شہد کی مکھیوں کی پرورش جیسے شعبوں میں کام کیا ہے۔ اس فاؤنڈیشن نے پاکستان میں افغان پناہ گزینوں کے لیے ہنرمندانہ مہارتوں کی تربیت کے کامیاب منصوبوں میں بھی اپنا سکہ منوایا۔ ہاشو فاؤنڈیشن کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس نے غربت کے خلاف جنگ کے دوران محروم طبقوں کو اپنی زندگیاں بہتر بنانے کا گر سکھایا اور اس ضمن میں تقریباً نصف ملین افراد کو مدد فراہم کر کے انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔

مجھے ہاشو فاؤنڈیشن کی کامیابیوں کی مدح سرائی کرنے کی کوئی خواہش نہیں۔ بلاشبہ میں اپنی اس خاص حیثیت اور خاص مقام کے لیے اللہ تعالیٰ کا شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھے اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے علاوہ پاکستانی بھائیوں اور بہنوں کی مدد کے لیے منتخب کیا۔ قرآن کے الفاظ میں، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ میں نے یہ کام، نام اور حیثیت بنانے کے لیے ہرگز نہیں کیا اور اس حقیقت کے باوجود دوستوں کا اصرار تھا کہ میں اس کتاب میں ہاشو فاؤنڈیشن اور اس کی انسان دوست سرگرمیوں کے متعلق ذکر کروں مگر میرا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ کام تو محض باطنی تسکین اور گہری طمانیت کے لیے ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کو جواب دہی اور اس کے حضور اظہار تشکر ہے۔ اسی طرح مجھے یہ بھی کہنا چاہیے کہ میری پیشہ ورانہ زندگی اور جو کمپنیاں اور کاروباری ادارے میں نے قائم کیے اور جو میری نگرانی میں چلتے ہیں، مجھے طمانیت اور تسکین مہیا کرتے ہیں کیوں کہ کسی نہ کسی طرح یہ کمپنیاں اور کاروبار، میرے ساتھی انسانوں کو مدد فراہم کرتے ہیں۔ میرے ان اداروں سے لوگوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہیں، مقامی معیشت کی نشوونما ہوتی ہے اور ان ہوٹلوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے ان عام آدمیوں کا معیارِ زندگی بلند ہوتا ہے۔ میرے نزدیک کسی بھی کاروبار کا یہی حتمی مقصد ہوتا ہے۔ یہ سرمایہ کاری نظام کی غرض و غایت اور اس کا نچوڑ ہے۔ میرے غیر مسلم دوست یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ اسلامی تعلیمات کا بھی خلاصہ یہی ہے۔

مجھے کسی مشہور مینجمنٹ سکول جانے اور بزنس ایڈمنسٹریشن میں ایک اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کا ''شرف'' حاصل نہیں ہوا۔ میں نے اپنے تجربات کے ذریعے مینجمنٹ کے

طریقے اور کاروباری رموز سیکھے۔ اس ضمن میں اگر کسی چیز کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس سے میں متاثر ہوا اور میں نے تحریک حاصل کی، وہ اللہ کی عظیم کتاب قرآن عالی شان ہے...... یہ عقل و دانش اور حکمت کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ اس کا میں اکثر مطالعہ کرتا ہوں اور اس کے مطالعہ سے ہر بار مجھے مزید ذہنی سکون اور طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری ایک چیز جس سے میں متاثر ہوا اور میں نے اپنی زندگی میں اس سے کامل رہنمائی حاصل کی، وہ دین کامل اسلام ہے، جو ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، جس کے متعلق مجھے تعلیم دی گئی کہ اسے ہی میری عقیدت کا مرکز ہونا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ مجھے اپنی جان سے بھی عزیز ہے حالاں کہ ناواقف حلقوں میں لاعلمی کی وجہ سے اس کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور ان غلط فہمیوں کو مسلمانوں کی بداعمالیوں اور منفی کردار نے جنم دیا ہے۔ درحقیقت، اسلام ایک نہایت ہی آسان اور سادہ دین ہے۔ جو لوگ اس پر عمل کرتے ہیں، اسلام ان سے کسی بھی چیز کا بہت کم تقاضا کرتا ہے۔ اسلام خدا کی وحدانیت کے عقیدہ اور انسانوں کے مابین مساوات، برابری، انصاف، رواداری، برداشت اور غیر جانبداری کی تعلیم دیتا ہے۔ حقیقت میں یہی اسلام کا پیغام ہے، ایک سادہ، سمجھ آنے والا اور خوبصورت پیغام۔ یہی تو وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک عملی مذہب ہے اور انسانی زندگی کو ایسے طرز زندگی میں تبدیل کر دیتا ہے جسے نہایت آسانی سے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اس حقیقت کی بجا طور پر ایک وجہ موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک گھر کے سربراہ تھے اور روحانی حکمت کا ایک ایسا مرقع تھے جن کی روزمرہ زندگی سوداگر اور تاجر کے طور پر نہایت ہی بصیرت افروز تھی۔ آپ ﷺ کا تعلق بنو ہاشم جیسے معزز قبیلے سے تھا اور آپ ﷺ کے پردادا مکہ میں تجارت کے بانی تھے۔ نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا یہ پہلو مجھے ہمیشہ ہی حیرت زدہ اور متاثر کرتا رہا۔ اپنی زندگی کے چھوٹے سے راستے پر میں نے آپ ﷺ کے نقوش قدم پر چلنے کی ہمیشہ کوشش کی۔ میرے نزدیک کمپنیوں کی تشکیل، اپنے ساتھیوں، شراکت داروں اور ملازمین کے لیے دولت کی تخلیق جس طرح ایک دنیاوی فریضہ رہا ہے، عین اسی طرح میرے لیے ایک روحانی ذمہ داری بھی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی کو اسلام

کی خدمت اور بطور مسلمان، اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل کے لیے وقف کر رکھا ہے۔

اسلام نے مجھے یہی سکھایا ہے کہ میں کاروبار کو بذاتِ خود ایک مقصد کے بجائے ایک سماجی تقاضا سمجھوں۔ میرے بہت سے کاروباری فیصلوں کی بنیاد فوری طور پر حاصل ہونے والے منافع کے شمار اور حصول کے بجائے پاکستان کی بہتری اور اس کا تابندہ مستقبل رہی ہے۔ میں اس وقت انتہائی سنگین خطرات مول لینے سے بھی نہ گھبراتا جب مجھے یہ یقین ہو جاتا کہ میرے منصوبے کی کامیابی سے پاکستان لازمی مستفید ہوگا۔ یہ کوئی شیخی یا خالی خولی دعویٰ نہیں ہے۔ اپنے ملک، اپنے ہم وطنوں کے لیے گاہکوں سے خالی اور کم آباد شہر گوادر میں ہوٹل کی تعمیر سے لے کر تیل نکالنے اور گیس کی تلاش، ہمیشہ ہی میرے کاروباری منصوبوں کا محور و مرکز رہے۔ ایک دفعہ میں نے اپنے ایک غیر ملکی دوست کو بتایا کہ پاکستان میرے پاسپورٹ پر تحریر محض ایک نام نہیں، بلکہ یہ میری قوتِ محرکہ، جذبہ، ولولہ اور جوش ہے۔ جب مجھے اپنے اس عزیز از جان ملک سے زبردستی دبئ میں پانچ برس کی جلاوطنی پر مجبور کر دیا گیا اس وقت بھی پاکستان میرے خیالوں، سوچوں اور خوابوں میں بدستور ایک جذبہ، شوق اور جوش کی حیثیت سے موجود رہا۔ اس جلاوطنی میں ایک دو نہیں درجنوں بار میں نے محسوس کیا کہ پاکستان سے محبت کا جوش و جذبہ میرے وجود میں زندہ و بیدار رہے۔ باوجود اس کے کہ میرا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل کر دیا گیا۔ ایک ایسی فہرست جس میں شامل پاکستانیوں کے ملک چھوڑنے پر پابندی عائد ہوتی ہے۔ یہ صرف پاکستان سے میری اٹوٹ محبت اور لازوال وابستگی ہی تھی کہ میں نے بیرون ملک بدستور مقیم رہنے کے بجائے وطن واپسی اور نتائج بھگتنے کا فیصلہ کر لیا۔ واضح رہے کہ میرا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں اُن دنوں شامل کیا گیا جب میں بیرون ملک تھا۔

بیرون ملک بھی میں نے ہمیشہ خود کو پاکستان کا ترجمان، محافظ اور از خود تقرر شدہ سفیر سمجھا۔ میں گزشتہ دہائی میں اس وقت اپنی فوج اور سیکیورٹی اسٹیبلشمنٹ کے شانہ بہ شانہ کھڑا رہا جب مغربی میڈیا نے غیر منصفانہ طور پر اسے اپنے حملے کا نشانہ بنایا۔ 1998ء میں جب بھارت نے اشتعال انگیز انداز میں جوہری بم کا دھماکا کیا، اس وقت میں واضح طور پر سمجھتا تھا

کہ پاکستان کو جوابی کارروائی کے طور پر اپنی طرف سے جوہری دھماکے کر دینے چاہئیں۔ یہ درست تھا کہ ایسا کرنے سے معاشی پابندیاں عائد ہونے کا امکان تھا اور اس سے میرا کاروبار بھی متاثر ہوتا...... لیکن میرا یہ پُرزور اصرار جاری رہا کہ پاکستان کے لیے یہ جوہری دھماکے ناگزیر ہیں۔ مجھے اپنی ذاتی کامیابیوں اور ناکامیوں کی کوئی پروانہ تھی بلکہ پاکستان کی بقا، سلامتی اور ناقابل تسخیر دفاع میرے نزدیک ضروری اور ناگزیر تھا۔

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں لگی لپٹی رکھے بغیر اپنے خیالات کا اظہار کر دیتا ہوں۔ میں مصلحت پسندی اختیار نہیں کرتا بلکہ جو کچھ میرے دل میں ہوتا ہے کہہ دیتا ہوں۔ میں بغیر خوف اور بغض کے ہر وہ بات جسے سچ سمجھتا ہوں بے دھڑک کہہ دیتا ہوں۔ میں دلیل کے ساتھ اور کھلے الفاظ میں سب کچھ کہہ دینے کا عادی ہوں۔ یہ سب کچھ ہمیشہ اچھا نہیں سمجھا جاتا اور اس کے باعث مجھے مقتدر افراد، کاروباری حریفوں اور بعض اوقات اہم سرکاری ملازموں، طاقتور اور انا پرست آمروں اور سیاستدانوں کی طرف سے مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ خاص طور پر وہ انتہائی مشہور اور کامیاب کاروباری، تجارتی اور سیاسی شخصیتیں (جنہوں نے مجھے نوجوانی کے ایام سے ترقی کرتے دیکھا) وہ بھی میری اس بے باکانہ حق گوئی پر اعتراض کرتی رہیں۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ پاکستان میں ایسے لوگ ہیں جو پاکستان کی وجہ سے محب وطن شہریوں پر بھروسا کرتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو شہریوں کے اس اعتماد اور بھروسے کو دھچکا پہنچاتے ہیں انہوں نے مجھے جس طرح نقصان پہنچایا، یہ ایک الگ داستان ہے۔ یہ نقصان دراصل انہوں نے مجھے نہیں بلکہ پاکستان کو پہنچایا ہے۔

مجھے ان سے کوئی پرخاش اور دشمنی نہیں۔ میری نواسی مجھے بتاتی ہے کہ میں بہت جلد غصے میں آجاتا ہوں لیکن جلد ہی میں اپنے اشتعال پر قابو بھی پالیتا ہوں۔ جب میں رات کو سونے کے لیے اپنے بستر پر دراز ہوتا ہوں تو یقین کیجیے میں انتہائی پُرسکون ہوتا ہوں۔ یوں دن بھر کے جھگڑوں اور اختلافات کا نئی صبح طلوع ہونے تک سرے سے کوئی وجود نہیں رہتا۔ یہ وہ سبق ہیں جنہیں میں نے اپنی ابتدائی زندگی میں اپنے والدین سے سیکھا۔ انہوں نے میرے ذاتی اور پیشہ ورانہ معاملات میں مجھے بہترین رہنمائی مہیا کی۔ اگر کوئی میری پشت میں

خنجر گھونپ دیتا ہے یا مجھے نیچا دکھانے کی کوشش کرتا ہے تو میں یہ معاملہ اپنے رب کے سپرد کر دیتا ہوں اور یوں ہر معاملہ بخیر وخوبی حل ہو جاتا ہے۔

بہر حال میری یہ مشکل ہے کہ میں پاکستان کے غداروں کو معاف نہیں کر سکتا۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور آفاقی صداقت کے مطابق ہم سب اپنی قبروں میں خالی ہاتھ ہی جائیں گے۔ یہ ایک ایسا جملہ ہے جسے میں اپنے بچپن سے سنتا آیا ہوں اور یہ ہمیشہ میرے ذہن میں تازہ رہتا ہے۔ میرے سامنے نبی اکرم ﷺ اور اسلام کے عظیم داعی کی زندگی کا یہ روشن پہلو رہتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے بعد طمع، لالچ اور مادی فوائد سے ہر لمحہ اجتناب برتتے رہے۔ اس قوم کی پسماندگی اور درماندگی کے تناظر میں میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ بدقسمتی سے پاکستان کے ارب پتی سیاستدان یہ عظیم سچائی فراموش کر چکے ہیں کہ یہ مملکت اسلام کے عظیم نام پر وجود میں آئی۔

متوسط اور محنت کش طبقہ ہی اقوام اور معاشروں کی تعمیر کی بنیاد ہے جو ایک بہتر زندگی کے لیے ہمیشہ ایمانداری کے ساتھ جدوجہد کرتا ہے۔ بدقسمتی سے محنت کش طبقے کی اس جدوجہد کو پاکستان میں پنپنے کی اجازت ہی نہیں دی گئی۔ سماجی اور معاشی طور پر پاکستان ہمیشہ ہی ایک اہرام کے مانند رہا جہاں اوپر بیٹھے ہوئے چند افراد نیچے بیٹھے ہوئے لوگوں کو ظلم و ستم اور استحصال کا نشانہ بناتے ہیں۔ میڈیا کی زبان پر ''اسٹیبلشمنٹ اور 40 خاندانوں'' کا ذکر رہتا ہے جنہوں نے ملک کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ یہ تو دراصل اس بات کا اعتراف ہے کہ نئی خوشحالی، متوسط طبقے کی وسعت پذیری، چھوٹے اور درمیانے درجے کے کاروباری ادارے، پہلی نسل کے سفید پوش محنت کش، اعلیٰ اور فنی تعلیم یافتہ افراد کو ترقی نہیں کرنے دی گئی۔ اسلام عقیدہ مساوات کا قائل ہے اور پاکستان اسی عقیدے کے نام پر وجود میں آیا۔ لیکن عملی طور پر ہم اپنے دیس کے بانی قائداعظم کی تعلیمات پر عمل کرنے میں ناکام رہے اور انتہائی واضح امتیازات کے ساتھ نہایت ہی غیر مساوی معاشرہ تعمیر کیا۔

یہ صورتِ حال جسے جمود کہنا چاہیے، مجھے اشتعال، تشویش اور کرب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ تشویش، یہ مثبت اشتعال، یہ جائز غصہ اور داخلی کرب و

اضطراب ہی اس کتاب کی تصنیف کا اصل محرک رہا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ میں پاکستان کے اولوالعزم اور محنتی نوجوانوں کے لیے مواقع کے فقدان کے متعلق کیوں اس قدر شدید جذباتی ہو جاتا ہوں؟ اس لیے کہ میں اُن کے دکھ کو اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتا ہوں؟ میں ایک ایسا شخص ہوں جس نے تقریباً دنیا بھر کا سفر کیا ہے۔ میں اپنے مشاہدے کی بنیاد پر پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ دنیا میں چند ہی ایسے ملک ہیں جو پاکستان کے مانند جوہرِ قابل سے مالا مال ہیں۔ اپنے جوہرِ قابل اور صلاحیتوں کا زیاں ایک المیہ ہی نہیں بلکہ ایک جرم بھی ہے۔ میں نے اپنی ذاتی کوششوں سے اپنا زندگی کا راستہ بنایا ہے۔ میں کسی جاگیردار خاندان کا چشم و چراغ نہیں جو صدیوں سے وسیع اراضی کا وارث تھا۔ ایک سادہ سے گھر میں میری پرورش ہوئی اور مجھے ورثے میں کوئی وسیع جائیداد، سرمایہ یا کاروباری ادارہ ودیعت نہیں ہوا۔ میں نے محنت اور قسمت اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اپنے لیے موافق حالات پیدا کیے۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا لیکن یہ سب کچھ آسان ہو سکتا تھا، بشرطیکہ ہمارے حکمرانوں نے پاکستان کے لیے ایک منصفانہ اور کھلا نظام تشکیل دیا ہوتا۔ یہ وہ مقدمہ ہے جسے میں اس کتاب کے ذریعے تاریخ کی عدالت میں ٹھوس شواہد و حقائق کی روشنی میں لانا چاہتا ہوں۔

پاکستان میں ایک کاروباری ہونا سرنگ کھودنے کے مترادف ہے۔ بدعنوانی اور اقربا پروری ہمارے سیاستدانوں اور سرکاری ملازمین کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ چند سینئر فوجی جرنیل بھی اسی فطرت کے حامل ہیں۔ وہ نئے نظریات یا تخلیقی عمل کو کچل دینے کے علاوہ اسے ابھرنے کا موقع بھی نہیں دیتے۔ ہماری حکمران اشرافیہ نے تسلط اور قواعد و ضوابط کا ایک ایسا نظام تشکیل دیا ہے جو مراعات یافتہ طبقہ کے تحفظ کا ضامن ہے اور اس نظام کے تحت جوہرِ قابل یا جرأت مندی کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔ بلاشبہ بدعنوانی دیگر ممالک میں بھی موجود ہے لیکن جس سطح پر ہمارے ملک میں زیادتی کی جاتی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ دوسرے لوگوں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا اور شکست تسلیم کر لی مگر میں نے ہرگز ایسا نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ میں کراچی جیسے اہم معاشی مرکز یا اسلام آباد میں اپنے

گھر کے بجائے دبئی میں موجود ہوں۔ کسی کو اپنی جنم بھومی، یادوں اور خوابوں سے الگ کر دینا اس کا گلا گھونٹ دینے کے مترادف ہے۔ میرے ہوٹلوں پر مسلسل دہشت گردانہ حملے، میرے گھر میں مجھ پر قاتلانہ حملہ، میرے بچوں کو اغوا کرنے کی کوششیں اور مسلسل دھمکیوں جیسے بدنما واقعات اور مذموم حرکات کی وجہ سے مجھے اپنے بچوں کو فوری طور پر بیرون ملک سکولوں میں داخل کروانا پڑا۔ مجھے اس بلا جواز دشمنی اور حاسدانہ مخاصمت کی ہرگز توقع نہ تھی۔ یہ وہ زندگی نہ تھی جس کے میں نے خواب دیکھے تھے۔ تحریک آزادی کے آغاز میں جب میں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا تب میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ پاکستان کے بہترین مستقبل کو اس بدترین اور گھناؤنے انداز میں نقصان پہنچایا جائے گا۔

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اگر پاکستان میں میرے سخت مخالف موجود ہیں تو یہاں میرے بے شمار خیر خواہ بھی ہیں۔ میں نے روزگار کے مواقع کی تشکیل میں اپنا حصہ ڈالا اور دیہی آبادی کو ہاشو گروپ سے استفادہ کرنے والا ایک ایسا گروہ بنانے کی کوشش کی جو سماج اور مملکت کا ایک فعال اور کارآمد حصہ بنے۔ میں نے کوشش کی کہ انہیں ایک روشن مستقبل فراہم کیا جائے تاکہ وہ پاکستان کی ترقی اور تعمیر کے شعبوں میں ایک معمار کا کردار ادا کرسکیں۔ ان بے شمار لوگوں اور پوشیدہ ہاتھوں کو میں جانتا تک نہیں جو میرے لیے دعا کرنے کے لیے بارگاہِ خداوندی میں بلند ہوتے ہیں۔ یہ ان دعاؤں ہی کی برکت اور کرامت ہے کہ میرے راستے کی ہر وہ رکاوٹ دور ہو جاتی ہے جو میرے دشمن بڑی چابکدستی اور تندہی سے قدم قدم پر کھڑی کرتے ہیں۔ یہ کوئی خالی خولی الفاظ نہیں بلکہ ان الفاظ کی بنیاد میرے سچے جذبات ہیں اور یہ الفاظ عین میرے دل سے نکلے ہیں۔ ان الفاظ کی بنیاد صداقت و سچائی ہے۔ اس ضمن میں ایک عملی مثال یہ پیش کی جاسکتی ہے کہ جس طرح مجھے مفادات کی حامل مختلف حکومتوں نے مسلسل اور بے تکان خوف زدہ کیا کسی دیگر پاکستانی کو ان حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں نے بے پروائی سے کندھے جھٹک کر ان حالات کا سامنا کرنا سیکھ لیا۔ تاہم مجھے یہ اقرار کرنا ہوگا کہ بحیثیت انسان کبھی کبھار مجھے شدید ٹھیس پہنچتی اور تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

جیسا کہ قارئین میں سے کچھ صاحبان کے علم میں ہے کہ میں پاکستان میں ہوٹل کی صنعت کے سب سے بڑے سلسلے کا انتظام وانصرام کرتا ہوں جہاں میری ذاتی رائے کے مطابق گاہکوں کو عالمی معیار کی حامل مہمان نوازی، خاطر تواضع اور خدمت مہیا کی جاتی ہے۔ عموی تاثر یہی ہے کہ شعبہ سیاحت اور ہوٹل انڈسٹری سے ڈالرز اور یورو کی شکل میں زرِمبادلہ حاصل ہوتا ہے، لہٰذا حکومت وقت کی طرف سے اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ حکومتوں اور پالیسی سازوں نے ہمیشہ اس شعبے کو نظر انداز کیا ہے۔ اس غلط پالیسی کے نتیجے میں دنیا کی نسبت پاکستان میں ہوٹلوں میں مستعمل نرخ نامہ سب سے کم ہے لیکن ہوٹل پر عائد محصولات غیر معمولی طور پر زیادہ ہیں۔ جو لوگ ان محصولات کا تعین کرتے ہیں وہ پاکستان کے طویل المدت مفادات کو پیش نظر رکھنے کے بجائے اپنے نمبر بنانے یا مقبول نعرے لگانے میں از حد مصروف ہیں۔ سیاحت ایک ایسی صنعت ہے جس سے جڑے ہوئے مختلف کاروباروں کی صورت میں نیچے تک بے شمار ملازمتوں کے مواقع پیدا ہوتے ہیں لہٰذا بہت سے ممالک نے یہ راز پا لیا ہے اور وہ ہوٹل اور سیاحت کی صنعت کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتے ہیں مگر پاکستان کے حکمرانوں کو ابھی تک یہ توفیق نہیں ہوئی۔ جانے وہ کب خوابِ غفلت سے جاگیں اور زمینی حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے ہوٹل کی صنعت اور سیاحت کے شعبہ کو ترقی دینے کے لیے مفید، مثبت اور حوصلہ افزا اقدامات کریں گے۔

ہوٹل کی صنعت پر عائد ٹیکس خواہ کس قدر زیادہ ہوں، ہمارے تمام ہوٹل یہ ٹیکس ادا کرتے ہیں اور نہایت ایمانداری کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ بہت سے دیگر ہوٹل ٹیکس ادا نہیں کرتے۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ ٹیکس ادا ہی نہ کرنا پڑیں اور اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ انڈر انوائسنگ (Under Invoicing) کرتے ہیں وہ ٹیکس چھپاتے ہیں اور ٹیکس چھپانے کے لیے باقاعدہ رشوت دیتے ہیں۔ میرا یہ وتیرہ نہیں ہے۔ یہ امر ہرگز حیران کن نہیں کہ میرے کچھ ساتھی اور افسر مجھے نیم مذاق کے عالم میں بتاتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ ناقابل تشریح حکومتی پالیسیاں با شو گروپ کو ذہن میں رکھتے ہوئے تشکیل دی جاتی ہیں۔ یہ سن کر میں محض خاموش ہو جاتا ہوں اور اپنے ہاتھ اٹھا کر آسمان پر نظریں جما لیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر

جانتا ہے کہ ان کی اس بات میں کہاں تک سچائی ہے۔

میں اس کتاب کو مخصوص افراد کے خلاف شکایتوں کے ایک پلندے میں تبدیل نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی اور ایمانداری کے ساتھ کرداروں کا ذکر دیا ہے۔ اگر کچھ لوگ اسے ذاتیات کا مسئلہ بنانا چاہتے ہیں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ میرا مقصد کسی کی مخالفت یا کردار کشی نہیں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے موجودہ حالات کیا ہیں، کیوں ہیں اور انہیں کس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب پاکستان کی آئندہ نسلوں کے لیے ایک پیغام بھی ہے۔ یہ محض ایک کتاب نہیں بلکہ سرد و گرم موسموں سے نبرد آزما ایک تجربہ کار انسان کی طرف سے ایک تحفہ بھی ہے...... مجھے یقین ہے کہ یہ تحفہ نسل نو کو گزشتہ نسل کی غلطیوں سے سبق حاصل کرنے کی ترغیب دے کر ایک ایسا قابل عمل نظام قائم کرنے پر آمادہ کرے گا جہاں ایمانداری سے کام کرنے والے شہری کے ایثار اور کوششوں کا اعتراف کیا جائے۔

مجھے پاکستان کے توانا جذبوں کی مالک نئی نسل کی لائق رشک صلاحیتوں پر بھروسا ہے۔ ان کی مہارتیں، ذہنی صلاحیتیں اور محنت و مشقت کرنے کی خواہش، کرہ ارض پر موجود بہترین اور ذہین افراد کی جملہ خصوصیات سے کسی بھی طور کم نہیں۔ یہ نوجوان ہی ہمارے ملک و قوم کا اصل سرمایہ اور اثاثہ ہیں۔ یہ ہمارا حال بھی ہیں اور مستقبل بھی۔ ہمیں انہیں اوپر اٹھانے کے لیے جملہ وسائل اور توانائیوں کو بروئے کار لانا چاہیے۔ ہمیں ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ مصور پاکستان علامہ اقبالؒ کے کلام کے ایک قابل لحاظ حصہ میں انہی نوجوانوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔ کلام اقبالؒ کا فیض ہے کہ میری توجہ کا مرکز بھی یہی نسل نو ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان نوجوانوں کو ایک ایسا پاکستان تعمیر کرنا چاہیے اور تعمیر کرنا ہوگا جو آئندہ دہائیوں میں دنیا کی قیادت کے فرائض سرانجام دے۔ اگر میری کتاب اس ضمن میں ان کی کسی حد تک بھی رہنما اور معاون ثابت ہو تو مجھے یقیناً اس پر فخر ہوگا۔ اور میں سمجھوں گا کہ میری محنت بارآور ثابت ہوئی...... انہی الفاظ کے ساتھ میں اپنی زندگی کی کہانی اپنی زبانی پیارے پڑھنے والوں کے ذوق مطالعہ کی نذر کرتا ہوں۔

دیباچہ

حضرت فاطمہؓ کی اولاد

میں کس طرح آغاز کروں؟اس سوال پر میں کافی دیر اور انتہائی مشکل کے عالم میں الجھا رہا۔

میں کہاں سے شروع کروں؟ میری پیدائش پاکستان کے قیام سے سات برس قبل ہوئی۔ پاکستان کی تخلیق ایک ایسا تمثیلی واقعہ تھا جس نے میری ابتدائی یادداشتوں اور سوچوں کی تشکیل کی اور اس واقعے کی گونج مجھے اب بھی سنائی دیتی ہے۔ 1940ء کے وسط کی یورش زدہ دہائی اور دوسری جنگ عظیم نے میری زندگی پر اثرات مرتب کیے۔اسی طرح پھر ہندو مسلم چپقلش کے باعث 1947ء میں برصغیر کی تقسیم ہوئی اور پاکستان معرضِ وجود میں آیا جس کے بعد 1950ء کی دہائی تک ایک نئی متحرک قوم کے عزم و ہمت کا سفر بلا روک ٹوک جاری رہا۔ یہ تمام حالات میرے احساسات پر نقش گری کرتے رہے۔ یہ نقوش آج بھی میرے محسوسات میں زندہ ہیں لیکن اگر مجھے اپنا تعارف اپنے قاری سے کرانا ہوتو مجھے اپنے ماضی میں واپس جانا ہوگا اور پھر آگے چل کر اپنی شناخت کی بنیادیں اور پھر گوناگوں شناختیں تلاش کرنی ہوں گی۔

میں اپنے والدین کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اور اب میں ایک باپ اور دادا ہوں۔ ان میں سے ہر لفظ کا مختلف مفہوم مختلف تعلق اور مختلف شناخت ہے۔ میں مجسم کاروباری

ہوں..... میرے بٹوے میں درجن بھر کارڈ ہیں، جن میں بینک کارڈ، کریڈٹ کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس اور وہ کارڈ بھی شامل ہیں جن کے ذریعے میں مختلف پیشہ وارانہ اور سماجی تنظیموں سے رابطہ کرتا ہوں۔ ان میں ہر کارڈ کا اپنا ایک مفہوم ہے۔ اپنے بارے میں کچھ کہوں تو سادہ ترین الفاظ میں بنیادی طور پر میں صرف اور صرف ایک مسلمان اور پاکستانی ہوں، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ میرے لیے میری یہی شناخت کافی ہے لیکن اگر مجھے موروثی اور خاندانی تاریخ کے لحاظ سے اپنی شناخت کا ذریعہ آپ کو بتانا ہو تو اس کے لیے مجھے ایک تفصیلی جواب دینا ہوگا۔

ہاشوانی خاندان، وہ مسلمان ہیں جو اہل تشیع کے اُس فرقے پر مشتمل ہیں جنہیں اسماعیلی کہا جاتا ہے۔ اسماعیلی، اسلام کے 72 فرقوں میں سے ایک ہیں اور ہمارے مشترک مذہب کے بھرپور دینی، ثقافتی اور نسلی سطح پر مبنی ایک پہلو کو متشکل کرتے ہیں۔ بلاشبہ اسلام کے بنیادی عقائد ان تمام فرقوں پر لاگو ہوتے ہیں۔ اسلام کی بنیاد یہ ہے کہ نبی اکرم حضرت محمد ﷺ، خاتم النبیین ہیں اور اس کرۂ ارض پر بھیجے گئے اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر ہیں۔ مسلک و برادری سے قطع نظر تمام مسلمانوں اور ان تمام افراد کے لیے جو کلمہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، حضرت محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں) پڑھتے ہیں، قران مجید مقدس کتاب ہے۔ ان افراد کو مسلمان کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ بنیادی عقائد ایسے ہیں جن پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی لیکن جیسے جیسے اسلام وسیع پیمانے پر پھیلتا گیا، مسلمانوں میں اختلافات بھی رونما ہوتے رہے۔ نبی اکرم ﷺ کے دور میں مسلمانوں کے درمیان کوئی فرقہ موجود نہ تھا۔ چاروں خلفاء، جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کی اتباع کی، اسلام کے قیام اور فروغ میں ایک اہم کردار ادا کیا اور دین پر ان ابتدائی برسوں کے نقوش چھوڑے جو آج بھی زندہ ہیں اور جن کے متعلق ایک سچے مسلمان کا عقیدہ ہے کہ یہ ہمیشہ اس کے ساتھ موجود رہیں گے۔

اسلام کے ابتدائی برسوں میں مرکزی اور انتہائی بااثر شخصیات میں نبی اکرم ﷺ کی دختر مبارک حضرت فاطمہؓ تھیں۔ آپؓ آج تک اسلامی تاریخ کی متبرک اور محترم ترین ہستی ہیں۔ فاطمہ مسلمان گھرانوں میں پیدا ہونے والی لڑکیوں کا ایک مقبول نام

ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے ایک نہایت ہی قریبی پیروکار اور آپ ﷺ کے چچازاد حضرت علی علیہ السلام تھے جو آپ ﷺ کے لیے بھائی کی مانند تھے۔ حضرت علی علیہ السلام مکہ میں خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے اور وہ پہلے مرد تھے جو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ دین اسلام میں داخل ہوئے۔ اہل تشیع کے نزدیک، حضرت علیؑ پہلے امام تھے اور حضرت علیؑ کے بعد ان کے بیٹے اور نبی اکرم ﷺ کے نواسے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ امام ہوئے۔ یہ اہل بیت تھے۔ عربی میں ''گھر کے افراد'' کو اہل بیت کہتے ہیں۔ لیکن اسلامی اصطلاح میں اہل بیت سے مراد نبی اکرم ﷺ کا گھرانہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے تمام بیٹوں کی وفات کے بعد خاندان کی نسل حضرت فاطمہؓ کے بچوں کے ذریعے چلی۔ اہل بیت نے اسلام کے فروغ اور اشاعت کے لیے لائق رشک خدمات انجام دیں۔ بہت سے اولیاء اور مبلغ جنہوں نے قرآن کے پیغام اور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات پھیلانے کے لیے دنیا بھر کا سفر کیا، وہ اپنی اولین نسل کو اس خاندان سے منسوب کرتے ہیں۔ یوں اسلام اپنے عرب ماخذ سے باہر نکلا اور ایک عظیم عالمی مذہب کی حیثیت اختیار کر گیا جس کے ماننے والے چین، روس، وسطی ایشیا، ایران اور جنوبی ایشیا، حتیٰ کہ انڈونیشیا اور فلپائن کے علاوہ افریقہ اور یورپ کے مختلف حصوں میں موجود ہیں۔ اسماعیلی اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ انہیں آج تک اہل بیت کی دعائے فضل و رحمت اور رہنمائی حاصل ہے۔ ہمارے روحانی رہنما، (ہز ہائی نس) عزت مآب آغا خان، 49ویں امام ہیں جو حضرت علیؑ اور نبی اکرم ﷺ کی براہ راست نسل سے ہیں۔

اسماعیلی قابل رشک روایات کے مالک ہیں۔ تعلیم، تقویٰ اور پرہیزگاری ان کا طرۂ امتیاز ہے اور وہ اپنے خیراتی اور انسان دوست اداروں کے علاوہ سماجی اور ثقافتی اقدار کے احیاوفروغ اور غربت کے انسداد کے لیے مشہور ہیں۔ جب اسماعیلی امام مصر کے حاکم تھے اور انہوں نے یہاں پہلی اسلامی سلطنت قائم کی تو انہوں نے جس شہر کی بنیاد رکھی اسے آج قاہرہ کے نام سے دنیا بھر میں پہچانا جاتا ہے۔ تقریباً ایک ہزار سال پہلے امام المعز، چودھویں امام نے الازہر مسجد اور الازہر یونیورسٹی کی بنیاد رکھی جو اسلامی دنیا کے انتہائی اہم ترین تعلیمی اور فکری و نظری ادارے ہیں۔ یہ امر بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ مسجد اور یونیورسٹی

کے ناموں کوالزہرا (منور یا روشن) سے اخذ کیا گیا ہے، یہ وہ خطاب تھا جو حضرت فاطمہؓ کو مرحمت کیا گیا۔ بعدازاں امام المعوز کوالازہر کی عمارت میں دفن کیا گیا۔

بلاشبہ قرآن مکمل ضابطۂ حیات ہے اور زندگی کے ہر مرحلے پر باعث رہنمائی ہے۔ اسماعیلی اماموں اور پیروں کے سلسلے نے اسلام پھیلانے اور نومسلموں کو اپنے اندر سمونے کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ قرآن کریم عربی میں نازل کیا گیا لیکن فہم اور بصیرت کے حامل علماء کی بدولت اس کا فلسفہ کئی زبانوں میں منتقل ہوا۔ اس حوالے سے میں گیارہویں صدی کے ایک ماہر دینیات ناصر خسرو کی مثال پیش کرنا چاہوں گا جو ایرانی صوبے خراسان کے ایک بصیرت منداور روشن ضمیر انسان تھے۔ اسماعیلی برادری سے تعلق رکھنے والے خسرو نے ایک ہزار سال قبل شمالی افریقہ کے علاوہ مغربی، وسطی اور جنوبی ایشیا کے بہت سے ممالک اور شہروں کا دورہ کیا اور پھر بالآخر انہوں نے اسلام کے سچے پیغام کو پاکستان کے دل لاہور کے مانند اُس کے دیگر عظیم شہروں تک پہنچایا۔ ان ابتدائی برسوں میں اسلامی مبلغین اور سیاحوں نے نہ صرف اللہ کے نام کی اشاعت کی بلکہ تہذیبی وثقافتی اور معاشی اشتراکِ عمل کو بھی فروغ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ان علاقوں کے منظرنامے کا ایک لازمی حصہ بن گیا۔ اسی طرح اسماعیلی پیشواؤں نے اپنے طریقے سے اس عمل کی مثال قائم کی۔ مثال کے طور پر پاکستان میں اسلام کی اشاعت کئی ایک مقامی زبانوں، سندھی، پنجابی، سرائیکی اور بلوچی وغیرہ کے ذریعے ہوئی۔ مقامی زبانوں میں ڈھل کر اسلام مقامی علاقوں میں جذب ہو گیا لیکن اسلام اپنے بنیادی عقائد کے ساتھ ایک عالمگیر دین کی حیثیت سے ہمیشہ قائم ودائم رہا۔ قطع نظر اس کے کہ تمام مسلمان کون سی زبان بولتے اور کیا خوراک کھاتے ہیں، اللہ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت وفضل کے طلب گار رہتے ہیں اور اللہ کے آخری نبی ﷺ کی اتباع کرتے ہیں۔

ہاشوانی، جن کا اصل ماخذ ایران ہے، کس طرح پاکستان میں آباد ہوئے؟ 1840ء کی دہائی میں 46ویں امام، امام حسن علی شاہ نے پہلی بار عزت مآب (ہز ہائی نس) آغا خان کا خطاب استعمال کیا اور جنھیں آغا خان اوّل کہتے ہیں، ان کے ایران کے شاہی خاندان

سے سیاسی اختلافات پیدا ہوگئے ۔ یوں اپنے پیروکاروں کے ہمراہ انہوں نے افغانستان اور پھر بلوچستان تک ایک طویل اور مشکل سفر طے کیا اور بالآخر برطانوی ہند اور سندھ میں داخل ہوگئے ۔ وہ ہندوستانی ریاست میں سے ہوتے ہوئے 1845ء میں عروس البلاد بمبئی پہنچ گئے ۔حکومت ایران کے احتجاج کے باعث برطانویوں نے آغا خان سے ایک برس کے لیے کلکتہ قیام کرنے کی درخواست کی ۔ بعدازاں آغا خان بمبئی پہنچے اور اس کے علاوہ قریبی شہر پونا میں اپنے گھر بنائے ۔ بلاشبہ ان پر راستے میں راہزنوں اور مقامی غارت گر جنگجوؤں نے حملے کیے لیکن مجموعی طور پر ہم مسلک اسماعیلیوں سمیت تمام مذاہب کے پیروکاروں نے انہیں خوش آمدید کہا کیوں کہ ان تمام علاقوں میں پہلے سے ہی کم یا زیادہ تعداد میں اسماعیلی موجود تھے ۔ علاوہ ازیں گجرات کے علاقہ '' کچھ '' (جس کی سرحد پاکستان کے ساتھ ملتی ہے) کے غیر مسلم حکمرانوں نے بھی ان کی پذیرائی کی جن کے دلوں میں آغا خان اور اسماعیلیوں کے لیے تعظیم کے جذبات پائے جاتے تھے ۔ آغا خان اوّل ، اسماعیلیوں کے موجودہ امام عزت مآب (ہز ہائی نس) پرنس کریم آغا خان یا آغا خان ، چہارم 49ویں امام کے پردادا کے والد تھے ۔

جن لوگوں نے ایران سے برطانوی ہند تک امام حسن علی شاہ کے قافلے کے ساتھ سفر کیا ، ان میں ایک مُکھی تھارو بھی تھے جو میرے پرداد کے والد تھے ۔ جب اسماعیلی ، 46ویں امام کی قیادت میں جنوبی ایشیا میں داخل ہوئے تو ان کے مصاحبین اور پیروکار راستے میں آباد ہوتے گئے ۔ اس طرح اسماعیلی مسلک کے افراد کی ایک مؤثر تعداد بلوچستان اور سندھ میں آباد ہوگئی ۔ ایران سے آنے والے اسماعیلیوں نے گوادر ، پسنی ، اوڑمارا اور جیوانی میں رہائش اختیار کی ۔ کچھ مسقط چلے گئے کیوں کہ گوادر کی بندرگاہ شہر سمیت آج کے بلوچستان کا ایک حصہ تھی جو عمان کے حکمران کے تسلط میں تھا ۔ میرے نانا قاسم کے خاندان نے گوادر میں آباد ہونے کا فیصلہ کیا اور میری والدہ زیور بائی تین برس بعد پیدا ہوئیں ۔ جب میں بڑا ہوا اور اپنا کاروبار شروع کیا تب سے میں کئی مرتبہ گوادر گیا اور یہ آمد و رفت میری پیشہ ورانہ زندگی کا ایک اہم سنگ میل بن گئی ۔ جب بھی میں گوادر جاتا ، اس کے مجھ پر جذباتی اثرات مرتب ہوتے کیوں کہ یہ میری پیاری اور عزیز والدہ کا پہلا گھر تھا ۔ لسبیلہ ایک ایسا شاندار شہر ہے جس

کا ذکر تاریخ کی کتابوں کے مختلف ابواب میں موجود رہا اور صدیوں پر صدیاں گزرتی چلی گئیں ۔ یہ کہا جاتا ہے کہ سکندر اعظم کے دور میں جب وہ پنجاب (پاکستان اور ہندوستان) سے بابل واپسی کے سفر پر تھا تو وہ لسبیلہ سے گزرا اور انیسویں صدی میں ایک برطانوی افسر کی حیثیت سے کسی یورپی نے لسبیلہ کو نہیں دیکھا تھا۔ آٹھویں صدی میں عربی جرنیل محمد بن قاسم سندھ میں اپنی اسلامی فتح کے لیے لسبیلہ سے گزرا۔ لسبیلہ وہ شہر ہے جو تقریباً 150 برس قبل ہی متحرک اسماعیلیوں کا مرکز بن گیا تھا۔

مکھی تھارو، لسبیلہ یا پھر سونمیانی میں قیام پذیر ہو گئے جو کراچی سے تقریباً 150 میل کے فاصلے پر جنوبی بلوچستان کا ایک ساحلی شہر ہے۔ ان کے خاندان کے متعلق تو یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ممکنہ طور پر مکھی تھارو، سونمیانی میں دفن ہیں جو اس وقت پاکستان کی نوزائیدہ خلائی صنعت کا مرکز ہے۔ ہمیں اس بارے میں بہت کم علم ہے کہ مکھی تھارو نے زندگی گزارنے کے لیے کون سا پیشہ اختیار کیا اور اپنی زندگی کہاں بسر کی۔ ہمیں تو صرف انہی باتوں کا علم ہے جو مختلف خاندانوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر سامنے آئیں۔ میں نے لسبیلہ اور سونمیانی میں مکھی تھارو اور ان کے گھرانے کے متعلق مزید معلومات کے حصول کی خاطر مقامی مؤرخین اور بڑے بوڑھے اسماعیلیوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن میری یہ کوششیں بے سود رہیں۔ ہم محض قیاس آرائی ہی کر سکتے ہیں کہ انہیں اسماعیلیوں میں انتہائی قابل عزت مقام حاصل تھا۔ معزز مکھی نمازوں کی امامت کرتے اور جماعت خانہ میں صدارت کے فرائض سرانجام دیتے، جہاں اسماعیلی عبادت کے لیے جمع ہوتے تھے۔ ان کے بیٹے، مکھی ہاشو جو اپنے والد کے جانشین مقرر ہوئے تھے، وہ بھی یہ مذہبی فرض بجالاتے تھے۔ بعدازاں مکھی ہاشو کراچی چلے آئے جہاں انہوں نے اون اور جانوروں کی کھالوں کی تجارت کا ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کیا۔

ایک دن ان کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ ایک برطانوی جو کاروباری دورہ پر ہندوستان آیا ہوا تھا، مکھی ہاشو کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کا تعلق رالی برادرز (Ralli Brothers) سے تھا۔ یہ ایک ایسی کمپنی تھی جو مکھی ہاشو کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کاروباری سودے کرتی رہی

تھی اور اس برطانوی نے مَلکھی باشو کو ایک ایماندار شخص اور وعدے کا پکا پایا۔ اس ملاقاتی نے مَلکھی باشو کو کمیشن کی بنیاد پر رالی برادرز کا سول سپلائیر (Sole Supplier) بننے کی پیشکش کی۔ وہ ایک ایجنٹ کی مانند کام کر رہا تھا جو اپنی برطانوی کمپنیوں کے لیے مصنوعات خریدتا تھا۔ یہ ایک اہم کامیابی تھی۔ اس دور میں ''رالی برادرز'' ایک وسیع بین البراعظمی تجارتی کمپنی اور دنیا بھر میں مصنوعات کی تجارت میں قائدانہ حیثیت کی مالک تھی۔ اس کی بنیاد پانچ یونانی بھائیوں نے رکھی تھی جو اپنے وطن سے ہجرت کر کے لندن پہنچے اور وہاں ایک نیا کاروبار قائم کیا۔ انہوں نے کراچی میں اون اور جانوروں کی کھالوں سمیت بہت سی مصنوعات متعارف کروائیں اور انہیں یورپ برآمد کرنا شروع کر دیا۔ اب مَلکھی باشو جو میرے والد کے دادا تھے، اس کمپنی کے واحد نمائندہ بننے والے تھے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ پیش کش قبول کر لی اور ان کے لیے انتہائی محنت، حکیمانہ اور دانشمندانہ انداز میں کام کیا۔ بالآخر انہوں نے کراچی میں لی مارکیٹ کے علاقے میں ایک گھر تعمیر کر لیا جسے میں نے اب باشو میوزیم میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑا اجماعت خانہ ہے۔ یہ مَلکھی باشو کے لیے بہت اہم تھا کیوں کہ اللہ کے لیے اجتماعی عبادت اور نماز ان کی شخصیت کی جبلت میں تھی اور یہ ان کے روزمرہ پیشہ ورانہ فرائض میں اہم حیثیت رکھتی تھی۔ درحقیقت جیسے جیسے کاروبار بڑھتا گیا ان کی خیراتی اور برادری کو فروغ دینے پر مبنی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ لسبیلہ سے جماعت کے ساتھیوں نے ایک بہتر زندگی اختیار کرنے کے لیے کراچی کی طرف ہجرت کی جو ایک بڑا شہر اور ابھرتی ہوئی سمندری بندرگاہ تھا۔ جب 1911ء میں ان کا انتقال ہوا، مَلکھی باشو دنیاوی اور مذہبی ذمہ داریوں کے حسین امتزاج کی صورت میں بہت کچھ حاصل کر چکے تھے اور وہ اپنی زندگی کے آخری دن تک ''مَلکھی'' کی حیثیت سے اپنے فرائض کی انجام دہی پر فخر محسوس کرتے رہے۔

اپنی تمام تر کاروباری ذہانت کے باوجود مَلکھی باشو ایک سادہ، خداترس اور نیک انسان تھے۔ ان کے چھ بیٹے (سات بھی ہو سکتے تھے، اس کے متعلق ہم پُر یقین نہیں) اور ایک بیٹی، شرفی تھی جو ان کی آنکھ کا تارا تھی۔ اس کی آواز انتہائی سریلی تھی اور وہ تلاوت

کرنے، نظمیں پڑھنے اور گیت گانے میں شہرت رکھتی تھی۔ اس کے لیے بہت سے رشتے آئے لیکن بوجوہ مُکھی ان میں سے کسی بھی رشتے کے لیے راضی نہ ہوئے۔ شاید ایک ذمہ دار اور معاملہ فہم باپ کی حیثیت سے انہوں نے یہ سوچا ہو کہ ان کی بیٹی دستیاب رشتوں سے کہیں بہتر رشتہ کی مستحق ہے۔ ایک روایت کے مطابق ایک دن مُکھی باشو، آغا خان کی تکریم کے اظہار کے لیے حاضر ہوئے۔ یہ ان کا روزانہ معمول تھا کہ جب بھی آغا خان بمبئی سے کراچی آتے، مُکھی باشوان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ مُکھی باشو، آغا خان کے بہت قریب تھے۔ یہ اعزاز شاید مُکھی باشو کے لیے ہی مخصوص تھا کہ وہ آغا خان کے پہاڑی گھر جس کا نہایت ہی پُرکشش نام ہنی مون لاج رکھا گیا تھا، میں ملنے جاتے۔ اپنی گھوڑا گاڑی میں واپسی کے سفر کے دوران مُکھی باشو آنسو بہانے لگے۔ ایک جماعت بھائی وظیفہ خوار تھا اور جماعت خانہ کی دیکھ بھال کرتا تھا اس نے اُن کے چہرے کو آنسوؤں سے تر دیکھ کر استفسار کیا کہ کیا مسئلہ ہے۔ معلوم ہوا کہ آغا خان نے ان کی سرزنش کی اور پوچھا کہ ان کی بیٹی کی ابھی تک شادی کیوں نہیں ہوئی۔ لب ولہجہ نرم تھا لیکن ناراضی ہویدا تھی۔ مُکھی باشو نے کہا تھا، ''یہ پہلی دفعہ تھا کہ آغا خان مجھ سے ناراض ہوئے، اب جو رشتہ پہلے آیا، میں اسے قبول کرلوں گا۔'' اس وقت جماعت بھائی جو ایک نہایت ہی غریب رنڈوا تھا، نے اپنے بیٹے کے لیے شرفی کا رشتہ مانگا۔ مُکھی باشو فوراً ہی رضامند ہوگئے۔ جب وہ واپس گھر پہنچے اور اپنے فیصلے کا اعلان کیا تو ان کے بیٹوں یعنی شرفی کے بھائیوں نے احتجاج کیا لیکن والد نے ان کی ایک نہ سنی۔ اگلی صبح وہ امام کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوئے اور انہیں بتایا، ''میں نے کل اپنی بیٹی کی شادی طے کردی ہے۔'' آغا خان مسکرائے اور کہا، ''اللہ تم پر اپنا فضل وکرم فرمائے، شرفی گلابوں کے مانند مہکے گی۔'' ان الفاظ کے باوجود شرفی کی شادی کے متعلق شکوک موجود تھے کیوں کہ شرفی کے خاوند اور مستقبل بارے کچھ زیادہ امید نہ تھی۔ تاہم، شرفی کے ہاں خوبصورت، پُرکشش اور شائستہ بچے پیدا ہوئے۔ ان میں سے ایک غلام علی الانہ (85-1906)، مصنف اور شاعر، عالم اور سفارت کار، قائداعظمؒ کے ایک قریبی دوست تھے جنہوں نے پاکستان اور اقوام متحدہ کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔ 1977ء میں اپنی زندگی کے آخری ایام میں الانہ کو اقوام متحدہ کے کمیشن برائے انسانی حقوق

میں خدمات کے اعتراف میں نوبل انعام کے لیے نامزد کیا گیا۔ وہ انتہائی مشہور اور پسندیدہ شخصیت کے مالک انسان تھے اور ایک دفعہ الانہ کے متعلق کہا گیا، ''وہ گلابوں کی مانند مہکتے تھے۔'' بہر حال شرفی کے متعلق آغا خان کی پیشگوئی درست ثابت ہوئی اور میرا خیال ہے کہ یہی منزل اور قسمت ہے۔

میرے اہل خانہ کا اس عقیدہ پر پختہ ایمان ہے کہ پروردگار دنیا میں بھیجنے سے پہلے ہی ہمارا مقدر لکھ دیتا ہے۔ میں نہایت ہی نیک اور پاکباز والدین کے گھر پیدا ہوا اور اس ضمن میں اللہ تعالٰی کی اطاعت اور شکر کا اظہار میری شخصیت کا لازمی حصہ ہے۔ میرے والدین عملی لیکن اکتسابی مذہبی لوگ تھے۔ یہی کچھ انہوں نے اپنے والدین سے سیکھا تھا۔ چوں کہ وہ مومن اور سچے مسلمان تھے، اس لیے میرے والدین نے اسی برداشت اور جامعیت کو حرز جاں بنالیا جو کہ نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کا خلاصہ تھی۔ جب نبی اکرم ﷺ نے مکہ فتح کیا اور خانہ کعبہ کا انتظام سنبھال لیا تو آپ ﷺ نے غیر مسلموں کو اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرنے سے نہیں روکا۔ قرآن پاک کسی کو اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور نہیں کرتا بلکہ قبولِ اسلام کا عمل، ذاتی یقین اور آگہی کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے والدین نے یہ محسوس کیا کہ ان کے بچوں کو اپنے دل میں محض اس لیے اسلام کو جگہ نہیں دینا چاہیے کہ وہ ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے بلکہ اس لیے کہ انہوں نے اپنی مرضی اور رضامندی سے اسلام کی تعلیمات کو سمجھا اور اپنے دل میں سمولیا۔ مجھے اعتراف کر لینا چاہیے کہ یہی کچھ میرے ساتھ بھی پیش آیا۔ میں نے جدوجہد کی، محنت و مشقت کی، مشکلات بھری زندگی بسر کی، ایمانداری کو اپنا وتیرہ بنایا، ہمیشہ سچ بولا اور ہمیشہ شفافیت و صاف گوئی ہی کی تلاش میں رہا۔ اس ضمن میں رہنمائی کے حصول اور انتہائی تسکین وطمانیت کی خاطر میں نے خود کو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید کی طرف متوجہ پایا۔ میں نے اپنی زندگی کے ہر گوشے میں مکھی ہاشو کی تعلیمات ہی کو سایہ فگن پایا جنہوں نے انتہائی طلسمی انداز میں اپنی پاکباز اور پیشہ ورانہ زندگی میں خوبصورت امتزاج پیدا کیا۔ ایک چیز جس سے میں بخوبی آگاہ ہوں کہ اسلام میں حسد حرام ہے۔ بدقسمتی سے میں نے اپنی ذاتی زندگی اور پاکستان میں حسد کا مشاہدہ کیا ہے۔ مجھے

اس کا عملی تجربہ ہوا ہے اور اس کے نتائج بھی میں نے بھگتے ہیں۔ صاف بات تو یہ ہے کہ حسد سے زیادہ کوئی غیر اسلامی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے خاندان کا ذکر طویل ہو گیا ہے لیکن سابقہ احوال اس قدر اہم ہیں کہ اُن کا اظہار کر ہی دیا جائے کہ جسے عام زبان میں کہتے ہیں 'میں کہاں سے آیا' اور پھر میں نے اپنے والدین، خصوصاً اپنی والدہ سے روزمرہ زندگی اور روحانیت سے متعلق کیا سبق سیکھے۔

مکھی ہاشو کی وفات کے بعد ان کے بیٹے عبداللہ نے ان کے کاروبار کا انتظام و انصرام سنبھال لیا اور رالی برادرز کے لیے کمیشن ایجنٹ کی حیثیت سے بدستور کام کرتے رہے۔ 1927ء میں میرے دادا عبداللہ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے اور میرے والد حسین ہاشوانی نے خاندانی کاروبار سنبھال لیا۔ چند ہی برسوں میں میرے بڑے بھائی اکبر بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ابھی تک ان کے کاروبار کا اصل شعبہ کپاس تھا جس سے وہ کافی منافع حاصل کرتے رہے۔ یہ کاروبار مزید نصف صدی تک جاری رہا اور 1968ء میں رالی برادرز نے پاکستان میں اپنا کاروبار بند کر دیا۔ اکبر ان کے ساتھ آخر تک کام کرتے رہے۔ میرے والد محترم 1977ء میں انتقال کر گئے مگر وہ عملی زندگی سے 1968ء میں ہی سبک دوش ہو گئے تھے۔ میرے والد میرے لیے ابتدائی مثال کی حیثیت رکھتے تھے۔ میرے والد حسین ہاشوانی ہمیشہ مصروف رہتے اور یہ وہی تھے جنہوں نے کاروبار کو نئی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا، 46ویں امام آغا خان اوّل بمبئی میں آباد ہو گئے تھے، وہ فوت ہو گئے اور وہیں انہیں دفن کیا گیا۔ چوں کہ میرے والد کا خاندان، اُن اور ان کے جانشینوں کے انتہائی قریب تھا اور ان کی تکریم یا ان سے مشاورت کے لیے ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے، اس لیے وہ کراچی اور بمبئی کے درمیان مستقل سفر کرتے رہتے۔ ایک ایسے ہی سفر کے دوران میرے والد حسین ہاشوانی پیدا ہوئے جب ان کے والدین کشتی کے ذریعے بمبئی سے واپس آ رہے تھے۔ ہمارے خاندان میں اکثر مذاق کیا جاتا تھا کہ میرے والد محترم کو کشتیاں بہت پسند تھیں، وہ انہیں دیکھ کر سحر زدہ ہو جاتے اور پھر سمندری سفر اور سامان لے جاتے ہوئے بحری جہاز ان کو انتہائی بھاتے تھے۔ ان کا یہ جذبہ وشوق اس قدر بڑھ گیا کہ اللہ تعالی

کی حکمت سے ان کی پیدائش بھی کشتی ہی میں ہوئی۔

میرے والد حسین ہاشوانی کا گھرانہ سات بچوں، چار لڑکیوں اور تین لڑکوں پر مشتمل ایک بڑا گھرانہ تھا۔ میرا نمبر چھٹا تھا جس کے بعد میری چھوٹی بہن تھی۔ 1939ء میں، میری پیدائش سے ایک برس پہلے، میرے والد نے کراچی میں ایک مکان تعمیر کیا جسے ''گرین بنگلہ'' کہا جاتا ہے، یہ کھارا کے علاقے میں اپنی نوعیت کا واحد اور گردونواح میں ایک شاندار نمونے کا حامل گھر تھا۔ چوں کہ اس علاقے میں دیگر اکثر افراد فلیٹوں میں رہتے تھے، اس لیے میرے والد نے یہاں مکان تعمیر کیا جو رالی برادرز کے ساتھ شراکت داری کے بعد نسبتاً خاندانی خوشحالی کی علامت تھا۔ اسے اسماعیلیوں میں کامیابی اور ایک قابل فخر کارنامہ سمجھا گیا۔ سر سلطان محمد شاہ عزت مآب (ہز ہائی نس) آغا خان سوم...... 48ویں امام موجودہ 49ویں امام کے دادا بنگلہ کا افتتاح کرنے کے لیے کراچی تشریف لائے۔ اگلے سال میں جان بائی میٹرنٹی ہوم میں پیدا ہوا جسے آج آغا خان ہسپتال فار ویمن اینڈ چلڈرن کہا جاتا ہے، جو گرین بنگلہ سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر کھارادر جماعت خانہ کے قریب واقع تھا۔ ہمارے ملحقہ علاقے میں ایک ایسی مثالی برادری موجود تھی جس میں یگانگت، سخاوت، دریا دلی اور خدمت خلق کے جذبے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ یہ ایک خوشگوار اور سادہ دنیا تھی جس میں پیدائش ایک قابل فخر امر تھا کیوں کہ 1940ء کی دہائی ایک روشن دہائی تھی۔ میرے والدین کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ آئندہ دہائی ان کی زندگیوں کے علاوہ ان کی برادری کی تاریخ اور ملک کو ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دے گی۔

باب 1

مشکلات اور رکاوٹیں

میرے والد محترم حسین ہاشوانی کے لیے اپنے بہت سے عم زادوں اور دور پار کے رشتہ داروں کے علاوہ ایک بڑے گھرانے کی نگہداشت اور دیکھ بھال کوئی آسان کام نہ تھا۔ میری پیدائش سے کچھ عرصہ قبل جس دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا تھا، اس کے آثار 1942ء میں ایشیا میں بھی نظر آنے لگے تھے۔ میرے والد کا کاروبار ختم ہوگیا۔ یورپ میں مصنوعات کی منڈی نمایاں طور پر سکڑ گئی۔ متحارب ممالک کے بحری جہازوں کی طرف سے حملوں کے خطرے کے باعث بین البراعظمی بحری باربرداری متاثر ہوئی۔ اس صورتِ حال کے باعث کراچی اور عمومی طور پر شہر میں رالی برادرز کے کمیشن کے کاروبار کے لیے یہ ایک مایوس اور پریشان کن ایام تھے۔ صدیوں سے ہی ایک سمندری بندرگاہ اور تجارتی مرکز ہونے کی حیثیت سے کراچی کا تمام تر انحصار عالمی تجارتی رجحانات پر تھا۔ جس طرح عالمی معیشت متاثر ہوتی عین اسی طرح کراچی کی معیشت بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں یہ نہر سویز کے مشرق میں پہلے ہی گندم کی برآمد کی ایک بڑی بندرگاہ تھی۔ تجارتی رجحانات کے حوالے سے خوشحالی اور وسیع المشربی نے اسے ایک بڑے شہر کا ساحسن اور خوبصورتی کے علاوہ وہ شائستہ اقدار اور جوش وجذبہ عطا کر دیا تھا جس کا کوئی پاکستانی ہمعصر شہر مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ اس شہر میں مسلمانوں کے علاوہ مسیحیوں، پارسیوں، یہودیوں اور بلاشبہ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اگرچہ ان میں سے کئی 1947ء میں اس

وقت بھارت چلے گئے جب متحدہ برطانوی ہند کی کوکھ سے دو نئے ممالک نے جنم لیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ہٹلر کی نازی فوج کے پولینڈ پر وحشت ناک حملے کے باعث 30,000 پولش پناہ گزیں اپنے ملک سے جانیں بچا کر کراچی آ گئے جہاں انہیں مقامی آبادی کی طرف سے خوش آمدید کہا گیا۔ اس صورت حال کے باعث شہر کی گہما گہمی اور وسیع المشربی میں اضافہ ہو گیا۔ میں اُن دنوں ایک چھوٹا بچہ تھا۔ میں پاکستانیوں کی مہمان نواز اور پُر تپاک فطرت کی ایک مثال کے طور پر یہ کہانی اکثر اپنے دوستوں کو سناتا کہ یہ صرف افغان پناہ گزیں ہی نہیں تھے جو 1979ء میں کابل پر سوویت قبضے کی وجہ سے ہمارے مہمان بنے بلکہ برسوں پہلے ہم نے دور افتادہ مشرقی یورپ سے آنے والے تباہ حال اور وطن بدر ہونے والوں کے لیے اپنے دیدہ و دل فرش راہ کر دیے تھے۔ شہر کراچی اور اُس کے مکینوں کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے قیام پاکستان کے فوراً بعد پولش فضائیہ کے سینئر افسران یہاں آئے اور پاکستان ایئر فورس کے قیام میں مدد و تعاون فراہم کیا۔

1945ء میں دوسری جنگ عظیم کا اختتام تو ہو گیا لیکن تاریخ انتہائی دلچسپ موڑ مڑتی رہی۔ یہ میرے بچپن کے دن تھے اور میرا خاندان معمولی متوسط طبقے کے افراد پر مشتمل تھا اور ہم طاقت اور سیاست کے عظیم کھیل سے کوسوں دور تھے۔ اس کے باوجود ہمیں یہ ادراک حاصل ہو چکا تھا کہ جلد ہی کوئی ڈرامائی تبدیلی رونما ہونے کو ہے۔ برطانوی راج کا اختتام ہو رہا تھا۔ وائسرائے اور اس کے افسران اپنے وطن جا رہے تھے اور اپنے پیچھے انہیں ایک آزاد پاکستان، ایک نئی قوم یعنی ہماری قوم کو چھوڑ کر جانا تھا۔ یہ کہانی کہ برطانوی ہند کی تقسیم کیوں ہوئی، نہایت ہی مستند حیثیت کی حامل ہے اور کئی ایک عالمانہ مقالوں اور کتب کا موضوع رہی ہے۔ میں اس کہانی میں الجھنا نہیں چاہتا کیوں کہ اس وقت یہ واقعی غیر متعلقہ ہے۔ لیکن میں زور دے کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسماعیلیوں کو نظریہ پاکستان اور برطانوی ہند کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کے حصول کی خواہش پر پکا یقین تھا کہ جہاں وہ وقار کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں اور کانگریس جماعت کی ہندو غالب سیاست کے اثر کے بغیر اپنا معاشرہ تشکیل دے سکیں جس کی بھارت پر حکومت قائم ہونے والی تھی۔ تحریک پاکستان کی

سرخیل مسلم لیگ تھی جس کے رہنما قائداعظم محمد علی جناحؒ تھے جو 1940ء کی دہائی کے وسط میں نہایت ہی کرشماتی قائد کی حیثیت سے سیاسی منظرنامے پر چھائے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کی بنیاد عزت مآب (ہز ہائی نس) آغا خان سوئم سر سلطان محمد شاہ 48ویں امام نے 1906ء میں رکھی۔ انہوں نے مسلم لیگ کے پہلے صدر کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ وہ برطانوی ہند کے مسلمانوں کے لیے تعلیم، سماجی فلاح و بہبود اور سیاسی حقوق کے علمبردار تھے جن سے ایک الگ قوم کا خواب پورا ہو سکتا تھا۔ یوں جب 14 اگست 1947ء میں پاکستان وجود میں آیا تو یہ اسماعیلیوں کے لیے خاص تفاخر کا باعث تھا کیوں کہ آغا خان نے اس مقصد کے حصول کی خاطر سخت محنت کی تھی۔ ان ابتدائی ایام میں جب رقم کی قلت تھی تو آغا خان، قائداعظمؒ کے پیچھے چٹان کے مانند کھڑے ہو گئے اور انہیں سیاسی وسفارتی معاونت فراہم کرنے کے علاوہ انتظامی اخراجات اور سرکاری تنخواہوں کی ادائیگی کی صورت میں مالی تعاون بھی فراہم کیا۔ کچھ عرصے بعد 1958ء میں 48ویں امام کے بیٹے اور موجودہ 49ویں امام ہز ہائی نیس پرنس کریم آغا خان کے والد علی خان نے اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

میں اس وقت بہت چھوٹا تھا اور میری عمر محض سات برس تھی اس لیے میں پاکستان کی تخلیق کا ادراک نہیں کر سکتا تھا۔ میں اکثر اپنے خاندان کے بڑوں کو پاکستان کے قیام سے متعلق باتیں کرتے سنتا تھا لیکن کچھ زیادہ سمجھ نہ پاتا تھا۔ یہ ایک ایسا دور تھا جب نہ تو چوبیس گھنٹے ٹی وی کی نشریات تھیں، نہ ہی جسٹس افتخار چوہدری موجود تھے اور نہ ہی اخباری ذرائع ابلاغ کا عروج تھا۔ عوام عام طور پر مقامی اخبارات ہی کے ذریعے خبریں حاصل کیا کرتے یا پھر ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کے ذریعے خبریں معلوم کرتے۔ تاہم جو چیز مجھے ابھی تک یاد ہے اور جس کا خیال آتے ہی پورے جسم میں ایک برقی رو دوڑ جاتی ہے وہ عوام کے دل میں موجزن والہانہ جذبہ تھا۔ پاکستان میں ابھی صنعتی دور کا آغاز نہیں ہوا تھا اور یہ بنیادی طور پر ایک زرعی ملک تھا۔ یہ ایک نئی قوم تھی جس کا سرمایہ محدود، مختصر اور انفراسٹرکچر میں بہت سے نقائص اور خامیاں تھیں، خاص طور پر اس ملک کے دیہی اور اندرونی علاقوں

میں یہ صورت حال غالب تھی۔ اس کے باوجود اس قوم میں اپنی آزادی، خود آگاہی کا شعور، روزگار، تعلیم، انفرادی ترقی اور سماجی فلاح و بہبود کے لیے زندہ دلی، امید اور کچھ کر گزرنے کی امنگ اور ترنگ موجود تھی۔ قائداعظمؒ نہایت ہی پسندیدہ شخصیت اور جدید ذہن کے مالک تھے۔ وہ ایک کہنہ مشق سیاستدان بھی تھے۔ قائداعظمؒ کی یہی جملہ خصوصیات تھیں جن کے حسین امتزاج کی نوزائیدہ پاکستان اور اس کے عوام اور اس ملک کے شہریوں کو ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے عوام اور اس ملک کے شہری اُن کی ہر درجہ توقیر و تعظیم کرتے تھے۔ نوآبادیاتی نظام سے آزاد ہونے والی مسلمان قوم کو ترکی سے لے کر عالم عرب، مغربی ایشیا سے مشرقی ایشیا تک تمام دنیا کے مسلمانوں سے تحسین اور پذیرائی حاصل ہوئی۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کی طرف سے یہ تحسین اور پذیرائی اس لیے تھی کہ سب پاکستان کو نہ صرف اس کے شہریوں بلکہ دنیا بھر میں موجود مسلمانوں کے لیے امیدوں اور تمناؤں کا مرکز و محور سمجھتے تھے۔

لوگ نہایت ہی خوشدلی کے ساتھ ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے اور ایک دوسرے کی مہارت سے فائدہ بھی اٹھا رہے تھے۔ دور دراز سے مسلمان پاکستان کی طرف اُمڈ اُمڈ کر آ رہے تھے۔ اس حوالے سے میں ایک مثال دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ فینسی خاندان نے پاکستان کا پہلا بڑا کاروباری ادارہ قائم کیا۔ وہ قیام پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے 1947ء میں کراچی آ گئے اور کینیا کے علاوہ افریقہ کے دیگر حصوں میں اپنے کاروباری ادارے فروخت کرنے کے بعد کراچی ہی میں آباد ہو گئے۔ وہ بھی اسماعیلی تھے...... اور یہ بات درست ہے کہ تجارتی فوائد فینسی خاندان کے پیش نظر تھے مگر اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس خاندان کی پاکستان کے ساتھ جذباتی وابستگی تھی جس کے باعث وہ کراچی آ گئے۔ میں یہ کہانی اپنے دوستوں کی خوشامد کرنے یا ان کی مدح سرائی کے لیے بیان نہیں کر رہا۔ درحقیقت آنے والے دنوں میں مجھے فینسی فیملی کی کمپنیوں سے مسابقت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ تاہم جس بات کی میں یہاں وضاحت کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگرچہ پاکستان نے بہت محدود وسائل کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا لیکن اسے بے انتہا محبت اور ان گنت دوست نصیب ہوئے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان کے پاس 1947ء اور اس کے بعد بھی آگے بڑھنے کے تمام مواقع

دستیاب تھے لیکن اگر ایسا نہ ہوسکا تو بیرونی عناصر کو موردِ الزام ٹھہرانے کے بجائے ہمیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔

برطانوی ہند کی تقسیم اور تخلیقِ پاکستان کا نتیجہ دوطرفہ ہجرت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ہندوستان سے مسلمان، پاکستان آ گئے اور ہندو، ہندوستان جانے کے لیے پاکستان سے رخصت ہو گئے۔ اگست 1947ء تک کا عرصہ انتہائی ظالمانہ اور تشدد سے پُر تھا۔ برطانوی ہند کے دو صوبوں، پنجاب اور بنگال میں شدید خونریزی ہوئی جنہیں پاکستان اور بھارت میں تقسیم کر دیا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ کراچی میں بھی خونریزی دیکھنے میں آئی۔ یہ صورت حال انتہائی افسوسناک تھی جس نے ہمارے دونوں ممالک کو ایسے گہرے زخموں سے گھائل کر دیا جو بدقسمتی سے ابھی تک مندمل نہیں ہو سکے۔ جیسے ہی شمالی بھارت کے اکثریتی میدانی علاقوں سے ہمارے مسلمان بھائی اور بہنیں، پناہ گزینوں اور مہاجروں کی حیثیت سے کراچی پہنچے تو یہاں کے سماجی وتہذیبی ماحول میں تبدیلی کا آغاز ہو گیا۔ یہ پناہ گزین اور مہاجر بھارت کے جنوبی، مشرقی اور مغربی میدانی علاقوں سے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں نقل مکانی کر کے یہاں پہنچے تھے۔ جب وہ یہاں پہنچے تو اس نئے وطن کے لیے ان کے ہونٹوں پر دعائیں تھیں جبکہ ان کے دلوں میں امیدوں کے دیپ روشن تھے۔ سب لوگ مل کر نئے ملک کا مستقبل تعمیر کرنے کا عزم رکھتے تھے۔

اس ہنگامہ خیز تبدیلی کا میرے خاندان پر بھی خفیف اثر مرتب ہوا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد جب معیشت اور تجارت کی ازسرنو بحالی کا عمل شروع ہو چکا تھا، میرے والد نے اپنے کام کے حوالے سے اپنی کوششیں دگنی کر دیں۔ رالی برادرز بدستور ان کی توجہ کا مرکز تھے۔ جب ان کا کاروبار پھیلتے پھیلتے کپاس کی خریداری اور تجارت تک وسیع ہو گیا تو میرے والد کو ایک شراکت دار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ شراکت دار ایک ہندو مول چند لیلا رام تھا۔ 1947ء میں مول چند لیلا رام اپنے خاندان کے ساتھ بھارت منتقل ہو گیا اور اپنے پیچھے ایک قطعہ زمین چھوڑ گیا جو اس وقت پاکستان کے بانی قائداعظمؒ کی شاندار آخری آرام گاہ مزارِ قائد کے قریب ہے۔ قابلِ فہم امر ہے کہ تب بھی یہ ایک قیمتی جائیداد تھی۔ جب مول

چندلیلا رام یہاں سے رخصت ہوا تو اس نے اس قطعہ زمین کو یہ کہتے ہوئے میرے والد کی نگرانی میں دے دیا کہ ''میں تم پر اعتماد کر کے تمہیں یہ قطعہ زمین دے رہا ہوں، اگر میں واپس آ گیا تو مجھے واپس کر دینا ورنہ یہ تمہاری ہو گی۔'' میرے والد نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگے، ''میں تمہاری زمین کی دیکھ بھال کروں گا لیکن اسے اپنے نام نہیں کراؤں گا۔'' مول چندلیلا رام اور اس کا خاندان کبھی بھی واپس نہیں آئے لیکن میرے والد نے اپنے وعدے کی لاج رکھی اور نہ تو اسے اپنے نام منتقل کرایا اور نہ ہی اس کی ملکیت کا دعویٰ کیا۔ آج یہ قطعہ زمین حکومت پاکستان کی ملکیت ہے۔ ایک اور ہندو کاروباری خوشی رام، میرے والد کا شراکت دار تھا۔ اس نے کراچی میں قیام کو ترجیح دی اور وہ ان چند ہندو خاندانوں میں سے ایک تھا جو بدستور کراچی ہی میں قیام پذیر رہے۔ خوشی رام اس وقت تک کاروبار میں حصہ دار رہا تا آنکہ 1968ء میں رالی برادرز نے پاکستان میں اپنا کاروبار بند کر دیا۔ اس دوطرفہ ہجرت کا مجھے ذاتی طور پر کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا کہ جس کے دوران ہندو یہاں سے رخصت ہوئے اور برطانوی ہند کے دیگر حصوں سے مسلمان یہاں آئے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میں اس وقت نہایت ہی کم عمر تھا۔ نہایت ہی واضح انداز میں مجھے جو کچھ یاد آیا، وہ دکانیں تھیں جہاں کھلونے فروخت ہوتے تھے، اب خالی تھیں۔ ان تمام دکانوں کے مالکان ہندو تھے۔

سات بچوں پر مشتمل گھرانے میں دوسرے کم عمر ترین بچہ ہونے کے اپنے فوائد بھی تھے۔ میرے والدین مجھ سے انتہائی پیار کرتے اور میرے بڑے بوڑھے بھی میری بلائیں لیتے تھے۔ ہم بہن بھائیوں میں عمروں کا فرق بہت زیادہ تھا۔ میرے والدین کی پہلی اولاد میری بہن مجھ سے بارہ سال بڑی تھیں۔ میرے دونوں بھائیوں میں سے بڑے بھائی، اکبر، میری پیدائش سے آٹھ برس قبل پیدا ہوئے تھے۔ 1947ء میں ابھی تک میں ایک چھوٹا بچہ تھا جو ادھر اُدھر بھاگتا پھرتا اور گلیوں میں کھیلتا رہتا۔ اکبر کو پہلے ہی کاروبار میں شریک کر لیا گیا اور وہ میرے والد صاحب کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ یہ امر نہایت ہی واضح تھا کہ بڑے بیٹے کی حیثیت سے انہیں ہی رالی برادرز کے ساتھ کام کرنا تھا۔ اس وقت اکبر اپنے تین بیٹوں اور ایک بیٹی کے ساتھ کراچی میں رہتے ہیں۔ ہم اپنے اپنے راستوں پر گامزن ہو گئے اور زندگی نے ہمیں

مختلف سمتوں کی طرف دھکیل دیا تھا۔

میں اپنے دوسرے بھائی، حسن علی کے زیادہ قریب تھا جو 1974ء میں دردناک انداز میں لندن میں انتقال کر گئے تھے۔ ان کے بھی تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ اپنے بستر مرگ پرانہوں نے اکبرکوان کی دیکھ بھال کرنے کی نصیحت کی۔ تاہم یہ ذمہ داری میں نے اپنے سر لے لی اور اپنے بچوں کے مانندان کی پرورش کی۔ بعدازاں ان کی سابقہ بیوی جسے حسن علی نے اپنی وفات سے چند برس پہلے طلاق دی تھی، اس نے مجھے عدالت میں گھسیٹ لیا، میں ششدررہ گیا اور مجھے اس اقدام کا نہایت افسوس ہوا لیکن یہ ایک الگ کہانی ہے۔ بہرحال بڑا خاندان ہاشوانی افراد کا خاصا ہے اور میرے بھی پانچ بچے تین بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔

پچاس کی دہائی کے اوائل میں اکبر نے غلام علی الانہ کی بیٹی سے شادی کی۔ بڑھتے ہوئے خاندان کے لیے گرین بنگلہ چھوٹا محسوس ہوتا تھا، اس لیے ہم کراچی کے سولجر بازار کے علاقے میں ایک بڑے گھر میں شفٹ ہوگئے۔ یہ چار بیڈروم کا مکان میرے والد صاحب نے ایک سوپچیس روپے ماہانہ کرائے پرلیا تھا۔ اُس زمانے کے لحاظ سے یہ ایک خطیر رقم تھی۔ بڑی بہنوں کی شادی ہوگئی، اکبر والد صاحب کے ساتھ کاروبار میں مشغول ہو گئے جبکہ چھوٹے بچے سکول جارہے تھے۔ اُس وقت ہمارا شمار روساء میں نہیں ہوتا تھا اور پھر پاکستان میں کاروبار کے لیے حالات بھی بہت سازگار نہ تھے کیوں کہ ملکی معیشت ابھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی لیکن والدین ہمیں اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے پرعزم تھے۔ گھر میں ملازمین نہیں تھے اس لیے ہمیں اپنے گھر کا کام کاج خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ سات یا آٹھ سال کی عمر میں، میں سندھ کے سب سے قدیم سرکاری سکول ''این جے وی ہائی سکول'' (نرائن جگن ناتھ ویدیا ہائی سکول) کی شام کی شفٹ میں جایا کرتا تھا جبکہ بعض وجوہات کی بنا پر میرے دیگر بہن بھائی صبح کی شفٹ میں تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں صبح کوگھر کا سودا سلف لاتا اور اُس کے بعد گھر کی صفائی میں اپنی والدہ کی مدد کرتا۔ ان کاموں سے فارغ ہوکر میں چند کلومیٹر پیدل چل کر بولٹن مارکیٹ، مٹھادر کے علاقے میں پہنچتا تا کہ وہاں سے ٹرام کے ذریعے ایک بجے تک سکول پہنچ سکوں۔ گھر واپس

آنے پر میں کپڑے استری کرنے میں والدہ صاحبہ کی مدد کرتا۔ یہ کپڑے وہ اُس دوران دھو لیتی تھیں جب میں سکول گیا ہوتا تھا۔اس کے بعد میں اپنے جوتے پالش کرتا۔ یہ ایک طے شدہ معمول تھااوراس نے مجھے گھر کے کام کاج کرنے اور صفائی کویقینی بنانے کا پختہ درس دیا۔ آج بھی جب مجھے اپنے ہوٹلوں میں کہیں گندگی کا کوئی دھبایا کاغذ کا پھینکا گیاٹکڑا دکھائی دیتا ہے تو میں کسی کوآواز دے کر بلانے کے بجائے خودہی اس کی صفائی کردیتاہوں۔میں آج بھی ہوٹل کے کمرے میں اپنے جوتے خود پالش کرتاہوں۔اسی طرح آئرن بورڈ پراپنے کپڑے خود استری کرتاہوں۔میری والدہ کو یقیناً مجھ پرفخر ہوگا۔اُس وقت تو مجھے احساس نہیں تھالیکن وہ مجھےاوائل عمری سےہی اپنے کام خودکرنے اورکسی کاسہارانہ لینے کادرس دےرہی تھیں۔

اپنے والدین کے ساتھ میراذاتی تعلق بہت مضبوط تھا۔اگرچہ میرے والد ہفتہ بھرمصروف رہتے مگروہ اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے وقت نکال ہی لیتے۔عام طور پر ہر ہفتہ کی شام وہ مجھے رات کے کھانے کے لیے باہر لے جاتے اورروشنیوں کے شہرکراچی کی جگمگاتی روشنیاں دکھاتے۔ہم بندرگاہ کی طرف جاتے جہاں وہ مجھے بحری جہاز دکھاتے اورپھروہ مجھے صدر کے مصروف ترین خریداری علاقے میں لے جاتے۔وہاں ہم رات کا ہلکا سا کھانا کھاتے اورنہایت ہی شانداراورخوشگوارتفریح وسیر کے بعدگھر واپس آجاتے۔یہ زندگی کی سادہ خوشیاں تھیں۔اہم مواقع پرجب کوئی خاص تقریب ہوتی،ہماراخاندان مقبول عام کلفٹن ساحل کارخ کرتا اورپھررات کے کھانے کے لیے ہم اکثر بولٹن مارکیٹ کے علاقے میں سندھ اسلامیہ ریسٹورنٹ پہنچ جاتے تھے۔

یہ میرے والدین ہی تھے جنہوں نے مجھے سماجی فلاحی سرگرمیوں کی اہمیت سے روشناس کرایا۔اُن دنوں پاکستان میں دودھ کی قلت تھی اورامریکی حکومت پیکٹوں میں دودھ کا پاؤڈر اپنے نام کے ساتھ بھیجا کرتی تھی۔ مجھے پاؤڈر سے دودھ بنانے اور علاقے میں غریب لوگوں میں تقسیم کرنے کا کام سونپا گیا۔اس کے فوراًبعد ہم نماز کے لیے جاتے جس کی منتظمی کی حیثیت سے میرے والدامامت کراتے۔اپنے والد سے میں نے عاجزی وانکساری سیکھی۔وہ اپنی فطرت کے مطابق پُرسکون اورخوش اخلاق تھے اور ہمیشہ مسکراتے

رہتے اور مشکل حالات میں کبھی بھی شکوہ وشکایت نہ کرتے ۔ان کی زبان سے صرف ایک ہی لفظ ادا ہوتا کہ وہ انسانوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرتے رہتے ۔ یہ سچ ہے کہ کسی انسان کے لیے اس سے بڑھ کر رحمت و برکت کی اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی کہ اس کے دل میں ہر وقت شکر کا کلمہ بسا رہے کیوں کہ شکر کا اظہار قناعت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا عکاس ہے ۔ یہ باطنی سکون کا ایک ظاہری عکس ہے ۔ جو لوگ اس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت سدا برستی ہے اور میرے والد ایک ایسے ہی انسان تھے ۔

میری والدہ ، خاندان کی ریڑھ کی ہڈی تھیں ۔ وہ ایک ایسی خزانہ دار تھیں جنہیں معلوم تھا کہ ایک محدود بجٹ میں گھر کو کیسے چلاتا ہے ۔اس سے مراد یہ تھی کہ ان کا نظم و ضبط انتہائی سخت تھا اور پیسے پیسے کا حساب رکھتی تھیں ۔ مالی معاملات میں ممکن نہیں تھا کہ ان کی طرف سے اسراف کیا جائے ۔ وہ غیر ضروری اخراجات کو روک دیتیں اور گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لیے محض ایک ہی نوکر تھا ۔ وہ کھانا پکانے کے علاوہ ہمارے کپڑے بھی دھوتیں ۔ دوسری جنگ عظیم کے مشکل ترین ایام سے ہی کفایت شعاری ہمارا معمول بن چکی تھی ۔اس مقصد کی خاطر کہ میرے والد کی آمدن میں قدرے اضافہ ہو جائے ، میری والدہ بولٹن مارکیٹ کی تھوک کی دکانوں سے کپڑا خریدتیں اور اسے اپنے ہمسایہ گھروں میں فروخت کر دیتیں ۔اس سے بڑھ کر وہ افراد خانہ اور دوستوں کے کپڑوں کی سلائی بھی کرتیں اور میں ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے مشین چلاتا ۔ جب ہم اکٹھے بیٹھے ہوتے تو بہت باتیں کرتے اور وہ مجھے بتایا کرتیں، ''بند مٹھی لاکھ کی، کھل گئی تو خاک کی ۔'' مطلب یہ کہ کفایت شعاری اپناتے ہوئے پیسہ بچائیں اور اسے اسراف میں ضائع نہ کریں ۔ میں اپنی والدہ سے سندھی زبان میں بات کرتا تھا اور ہم گھر میں سندھی زبان بولتے تھے ۔ان کے ساتھ میری نجی گفتگو بلوچی زبان میں ہوتی تھی کیوں کہ اپنے گوادر کے پس منظر کے باعث وہ یہ زبان جانتی تھیں اور انہوں نے یہی زبان مجھے بھی سکھائی تھی ۔ایک بچے کی حیثیت سے جو زبانیں میں نے سیکھیں، وہ گجراتی ، پنجابی ، اردو اور انگریزی تھیں ۔

میں بچپن میں اکثر بیمار رہتا تھا اور شاید اسی وجہ سے مجھے شام کی شفٹ میں سکول

بھیجا جاتا تا کہ دوسرے بچے جب سکول گئے ہوں تو میری والدہ میرا خیال رکھ سکیں ۔ مجھے چیچک اور گلے کی سوزش جیسی بہت سی بیماریاں لاحق ہونے کے علاوہ اکثر تیز بخار بھی ہوجاتا اور پھر اپنڈکس جس کے باعث 14 برس کی عمر میں میری آنت بھی کاٹ دی گئی ۔ ان میں سب سے زیادہ تکلیف دہ 15 برس کی عمر میں ٹانسلز کا آپریشن تھا جو کراچی کے ایک مشہور سرجن اور ہندوستانی کاروباری اعظم پریم جی کے ایک دور کے رشتہ دار ڈاکٹر حبیب پٹیل کے کلینک پر ہوا۔ گزشتہ برس ڈاکٹر پٹیل میری اپنڈکس نکال چکے تھے ۔ وہ ایک ماہر اور کامیاب میڈیکل پریکٹیشنر تھے لیکن انہوں نے مجھے کہیں زیادہ ضدی مریض پایا۔ اپنڈکس کے آپریشن سے پہلے میں نے کلوروفارم استعمال کرنے سے انکار کردیا۔ میں نے استفسار کیا،''میں بے ہوش نہیں ہوں گا بلکہ میں آپریشن ہوتا دیکھوں گا۔'' دوسرا طریقہ یہ تھا کہ بدن کو سُن کرنے لیے میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک بڑا ٹیکہ لگایا جائے ۔ آپریشن کے دوران میں بیدار رہا جس کے باعث میرے والدین بہت حیران ہوئے ۔ اسے میرا عزم مصمم کہیے یا پھر انتہائی حماقت جو کچھ بھی یہ تھا، میرا یہی رویہ تھا۔ ایک سال بعد میں دوبارہ ڈاکٹر پٹیل کے پاس پہنچا کیوں کہ میرے ٹانسلز کاٹے جانے تھے ۔ مجھے ایک دفعہ پھر کلوروفارم کی پیش کش کی گئی لیکن میں نے دوبارہ انکار کردیا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ میرے گلے کے اندر بہت سے ٹیکے لگائے جائیں، پچکاری میرے کھلے منہ کے اندر گھسا دی جائے ۔ یہ عمل مجھے انتہائی خوفناک محسوس ہوا اور حقیقت بھی یہی تھی ۔ اس دن ہسپتال میں ایک تماشا لگا رہا۔ ڈاکٹر اور ہسپتال کا عملہ میرے انکار کے باعث پریشان ہو رہے تھے اور ان میں سے ایک نے بالآخر کہہ ہی دیا،''پاگل لڑکا!'' یہ پہلی دفعہ تھا کہ ہسپتال بہت سی قسم کے ٹیکے استعمال کر رہا تھا کیوں کہ کسی بھی مریض نے کلوروفارم استعمال کرنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ بہر حال، ہسپتال کی یہ ترکیب کامیاب رہی اور ڈاکٹر پٹیل نے میرے بڑھے ہوئے ٹانسلز کاٹ دیے۔ زخم کو مندمل کرنے کے لیے سوتی پٹیاں بھر دی گئیں جنہیں ہفتہ بعد اس وقت باہر نکالنا تھا جب جلد ٹھیک ہوجاتی اور پھر باہم جڑ جاتی ۔ پھر میرے اصرار پر بہت سے ٹیکوں کے ذریعے زخم سے سوتی پٹیوں کو باہر نکالنے کا عمل کیا گیا جو انتہائی تکلیف دہ تھا۔ تکلیف کے باعث میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔

اس کے باجود میرے خاندان کو معلوم ہو گیا کہ میرے اندر ایک ضدی بچہ موجود تھا اور جب میں ایک دفعہ کوئی ارادہ کر لیتا تو کوئی بھی چیز اسے تبدیل نہیں کر سکتی تھی۔

میری والدہ کو توقع تھی کہ میرے اس مستقل مزاج رویہ کے باعث سکول میں بھی میری کارکردگی شاندار ہوگی لیکن میں ان کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکا۔ کچھ مضمون مجھے ضرور پسند تھے لیکن کمرۂ جماعت میں میرا رویہ سنجیدہ نہیں ہوتا تھا۔ میں نے گھر کے قریب ایک سکول اور پھر آغا خان سکول سمیت بہت سے سکولوں میں تعلیم حاصل کی اور پھر بالآخر این جے وی ہائی سکول میں داخلہ لیا جہاں سے میں نے میٹرک کا امتحان دیا۔ این جے وائی ہائی سکول میں میرا بہترین دوست ہری جگاسیا (Hari Jegasia) تھا جو کلاس میں اوّل آیا اور ٹورنٹو میں چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ بن گیا۔ 2013ء میں اس سے میری ملاقات دبئی میں ہوئی اور مجھے معلوم ہوا کہ اس کے بیٹے ہری کی شادی ایک انگریز خاتون سے ہوئی تھی جو حکومت دبئی کے لیے کام کرتی اور وہ ایک لحاظ سے دبئی میں میرا ہمسایہ تھا۔ ہری اور مجھے ریاضی بہت پسند تھی اور یہ میرا پسندیدہ مضمون تھا۔ تاہم میرا زیادہ تر وقت کھیل کے میدان میں صرف ہوتا۔ اپنے گھر کے باہر گلیوں میں، میں نے روایتی اور عوامی کھیل گلی ڈنڈا اور ٹینس بال کرکٹ کھیلنا سیکھی۔ کرکٹ میں میری دلچسپی جنون کی حد تک بڑھ چکی تھی اور ایک محتاط طبع کا حامل فاسٹ باؤلر بننے کے لیے سخت محنت کر رہا تھا۔ تصورات میں کھوئے رہنے کے بجائے ایک عملی انسان کی حیثیت سے میں خود کو ہر وقت مصروف رکھتا اور نہ صرف مطالعہ کرتا یا خود کو انسائیکلوپیڈیا میں مستغرق کر دیتا بلکہ اپنے کام بھی اپنے ہاتھوں سے انجام دیتا۔ میرے پاس ایک پالتو کتا تھا جسے میں روزانہ نہلاتا۔ میرے پاس ایک پالتو مرغی بھی تھی اور ہر روز یہ دیکھتا رہتا کہ اس نے انڈے دیے ہیں یا نہیں۔ میں اپنے گھر کے چھوٹے سے باغیچے میں گلاب بوتا اور اس طرح مجھے اپنی زندگی میں باغبانی سے ہمیشہ کے لیے محبت پیدا ہو گئی۔ ہر مکان جسے میں نے تعمیر کیا یا جس مکان میں بھی میں قیام پذیر رہا ہوں، میں نے ہمیشہ یہاں ایک باغ بھی بنایا۔ آہ! اللہ کی طرف سے اب مجھے بذاتِ خود پودوں کو پانی دینے کا وقت میسر نہیں۔ بہرحال لڑکپن کے دور میں، میں باورچی خانے کے اردگرد منڈلاتا رہتا۔ اگر مرغی پکائی جا رہی ہوتی، میں اسے

خود اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنے کے علاوہ صاف بھی خود کرتا۔ جس طرح میں نے پہلے کہا تھا، صفائی میری عادتِ ثانیہ بن چکی تھی جو میری والدہ کی طرف سے مجھے ودیعت ہوئی تھی۔

میری والدہ ایک سمجھ دار خاتون تھیں۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اکبر، رالی برادرز کا انتظام سنبھال لے گا اور میرے والد کی کمپنی میں میرے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ اب مجھے اپنے لیے ایک الگ اور آزادانہ پیشے کا انتخاب کرنا تھا۔ ان کی بہت خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ 1956ء میں این جے وی ہائی سکول سے گریجوایشن کرنے کے بعد مجھے سندھ مسلم ہائی سکول سائنس کالج میں پری میڈیکل میں داخل کرا دیا گیا۔ علم حیاتیات اور علم کیمیا کے علاوہ دیگر مضامین بھی تھے۔ علم حیاتیات اور علم کیمیا میں، میں اچھا تھا لیکن ادب میں کمزور تھا۔ پڑھائی میں میرا دل نہیں لگتا تھا اور میں ان مضامین کو درکار توجہ بھی بخوبی نہیں دیتا تھا۔ کالج کی زندگی کی آزادی نے مجھ پر نہایت ہی تیز اور شدید اثر مرتب کیا اور میں نے پڑھائی کے سوا دیگر غیر نصابی سرگرمیوں پر زیادہ توجہ دینی شروع کر دی۔ میں نے چینی ساختہ بائیسکل -/142 روپے میں خریدی اور دن بھر سائیکل پر شہر بھر میں کالج سے کرکٹ میچ کے لیے میدانوں کے چکر کے علاوہ آوارہ گردی کرتا رہتا۔ طلبا یونین کی سرگرمیاں مجھے کتابوں سے دور رکھتیں جس کے باعث میری والدہ بہت ناراض ہوتیں۔

ہفتے میں سات دن میں کرکٹ کے جنون میں مبتلا رہتا، ریڈیو پر کمنٹری سنتا اور کرکٹروں کی تصاویر جمع کرتا۔ ایک تیز باؤلر کی حیثیت سے مقامی ٹورنامنٹس میں میری شہرت کہیں عروج پر تھی جو 1950ء کی دہائی میں میٹنگ وکٹوں پر کھیلے جاتے۔ کالج کے علاوہ میں آغا خان جمخانہ کی طرف سے بھی کھیلتا تھا۔ ہماری ٹیم نے 1958ء میں پی آئی اے کی مضبوط ٹیم کو فائنل میں ہرا کر کراچی کرکٹ ایسوسی ایشن گولڈ کپ جیت لیا۔ ہم نے 50 اوورز میں 140 سکور کیے اور ان 9 کھلاڑیوں کو محض 65 پر آؤٹ کر دیا جنہوں نے پاکستان الیون کی نمائندگی کی تھی۔ ہماری جیت میں میری باؤلنگ کا اہم کردار تھا۔ ہم ایک طوفانی ٹیم تھے اور کرکٹ میچ ختم ہونے کے فوراً بعد ہم جمخانہ میں خواتین کی ایک چائے پارٹی میں جا گھسے تھے۔ اس سے پہلے کہ خواتین کو کچھ معلوم ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے، ہم نے تمام سینڈوچ اور کھانے

پینے کی دیگر اشیا کا صفایا کر دیا۔ مجھ سے اکثر پوچھا جاتا کہ کیا میں کرکٹ کو اپنا پیشہ بنانے میں سنجیدہ ہوں لیکن صاف بات یہ ہے کہ میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا۔ان دنوں کرکٹ میں نہ تو کوئی پیسہ، نہ کوئی پذیرائی، نہ ہی کوئی مالی معاونت اور نہ ہی کوئی ہلا گلا تھا۔آج کے مانند کرکٹ میں چکا چوند نہ تھی۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ باصلاحیت آغا خان جمخانہ ٹیم کے میرے کسی بھی ہم عصر کھلاڑی نے نہ تو اس کھیل میں اعلیٰ مقام حاصل کیا اور نہ ہی وہ ٹیسٹ اور بین الاقوامی کرکٹ کا حصہ بن سکا۔اس کی وجہ نہایت سادہ تھی، بطور پیشہ کرکٹ منافع بخش نہیں تھا۔کرکٹ کو بطور پیشہ اختیار کرنے کے لیے ایک تو خاندان کی طرف سے مالی معاونت ضروری تھی یا سرکاری ملازمت یا فوجی ملازمت درکار تھی۔متوسط طبقے کے اسماعیلی لڑکوں کا تعلق ان گھرانوں سے ہوتا تھا جن کا کوئی چھوٹا موٹا کاروبار ہوتا تھا یا پھر وہ اپنے بچوں کو تعلیم اور دفتری ملازمتوں میں داخل کرنا چاہتے تھے۔کرکٹ ایک پُرتعیش چیز تھی جس کے وہ زیادہ دیر تک متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔اگر میری ٹیم کے کوئی ساتھی بطور کرکٹر حبیب بینک یا نیشنل بینک آف پاکستان میں ملازمت حاصل کر بھی لیتے تو وہ جلد ہی بنیادی دفتری کام کی طرف متوجہ ہو جاتے اور 22 گز پر مشتمل کرکٹ پچ سے دور ہو جاتے۔ایک اچھی تنخواہ، ترقی کے مواقع، زیادہ سے زیادہ آمدن اور اپنے گھرانے کی ذمہ داری وہ ترجیحات تھیں جو والدین نے ہمارے اندر راسخ کر دی تھیں۔ یہ ایک غیر معمولی اور حیرت انگیز امر ہے کہ اسماعیلیوں میں کرکٹ کی مقبولیت کے باوجود، اسماعیلیوں کی طرف سے وہ پہلا شخص جس نے پاکستان کی طرف سے کھیلا، وہ سلیم جعفر تھا جس نے کہیں بعد 1986ء میں اپنی ٹیسٹ کرکٹ کا آغاز کیا۔حسین اتفاق ہے کہ وہ بھی تیز باؤلر تھا۔جب میں نے اسے باؤلنگ کرتے ہوئے دیکھا، مجھے اپنے دل میں کچھ کچھ خلش محسوس ہوئی۔میدان میں سفید لباس میں ملبوس کھلاڑی، چمکدار سرخ گیند، بال کرانے کے لیے باؤلر کی دوڑ اور ہجوم کا شور، کیا سب میری بھی قسمت میں ہو سکتا تھا؟محض ایک لمحہ کے لیے یہ خیال میرے ذہن میں آیا۔پھر میں نے یہ سوچتے ہوئے طمانیت اور سکون محسوس کیا کہ یہ اللہ ہی کی مرضی تھی میں نے کرکٹ چھوڑ دی؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے میری لیے زندگی کی ایک اور اننگز کا انتخاب کر لیا تھا۔

آوارہ گردی اور تفکرات سے آزاد ایام کا اختتام ہو رہا تھا۔ 1958ء میں ایس ایم کالج میں میرا آخری امتحان سر پر تھا اور اس میں میری کارکردگی ہی کے ذریعے یہ تعین ہونا تھا کہ کیا میں میڈیکل کالج میں جاؤں گا اور ڈاکٹر بنوں گا کیوں کہ میری والدہ کی خواہش یہی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن پہلے میرا کیمسٹری کا پریکٹیکل تھا۔ مجھے کیمسٹری کی تجربہ گاہ پسند تھی اور میں وہاں گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ عملی ٹیسٹ اچھا ہو گیا اور میں قطعی مطمئن تھا۔ اگلی صبح ادب کا پرچہ تھا جس میں مجھے قطعی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی مجھے اس میں کوئی مہارت حاصل تھی۔ اچانک مجھ پر افراتفری کا عالم طاری ہو گیا۔ امتحان کے دن میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے علی الصباح اپنے ایک دوست کو فون کیا اور اس سے مدد چاہی۔ وہ بہت دور رہتا تھا اور وہ غریب گھرانے کا ایک مثالی طالبعلم تھا۔ کالج کی فیس ادا کرنے کے لیے وہ بطور ٹیلیفون آپریٹر کام کرتا تھا اور پھر اپنی پڑھائی کے لیے وقت نکال لیتا تھا۔ یہاں آنے اور مجھ سے ملنے کے لیے اسے سائیکل کے ذریعے کافی دور سے آنا پڑا۔ میں نے کورس کی مجوزہ کتاب، چارلس ڈکنز کا ناول اس کے ہاتھوں میں تھما دیا اور استفسار کیا، ''یہ کیا ہے؟ اس میں کیا لکھا ہے؟ میں نے تو اسے پڑھا بھی نہیں۔'' وہ پریشان ہو گیا اور کہنے لگا، ''اسے پڑھنے اور پھر تمہیں پڑھانے میں تو کئی دن لگیں گے، تمہیں تو علم ہی ہے کہ ہمارے پاس وقت نہیں۔'' میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا، ''براہ کرم، تو تم مجھے اس کا خلاصہ ہی بتا دو! کچھ اہم نکات، خدا کے لیے!'' جب نتیجہ آیا تو میں نے 100 میں سے 11 نمبر حاصل کیے تھے جبکہ پاس ہونے کے لیے 33 نمبر درکار تھے۔ چوں کہ میں فیل ہو گیا تھا، اس لیے میڈیکل کالج میں داخلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری والدہ انتہائی پریشان ہونے کے علاوہ بہت ناراض بھی ہوئیں۔ میری زندگی میں پہلی بار انہوں نے مجھے تھپڑ مارا۔ ان کا خواب بکھر گیا تھا۔۔۔ ان کا چھوٹا بیٹا اب ڈاکٹر نہیں بن سکتا تھا۔

بے حد عملی سوچ رکھنے والی خاتون ہونے کی وجہ سے میری والدہ نے فوراً ہی متبادل راہوں کے بارے میں سوچ بچار شروع کر دی۔ انہیں احساس ہو گیا کہ تعلیم کی بنیاد پر میرے مستقبل کو استوار کرنا سعی لا حاصل ہوگی، لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ میرے والد کے کاروبار

میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی کیوں کہ اکبر اُس کام کو تسلی بخش طریقے سے چلا رہا تھا۔ پیش بینی کی خداداد صلاحیت سے کام لیتے ہوئے اُنہوں نے مجھے کالج سے نکال لیا اور میرے بہنوئی شمس الدین سے درخواست کی وہ مجھے اپنا شاگرد بنا لے۔ شمس الدین کھانے پینے کا چھوٹا سا کاروبار کرتے تھے۔ شمس الدین کی شادی میری بڑی بہن ملک سلطان سے ہوئی تھی اور وہ عمر میں مجھ سے کوئی بیس برس بڑے تھے۔ میری والدہ کو امید تھی کہ اُن کے ساتھ کام کر کے میرے ہاتھ سیدھے ہو جائیں گے اور جیسا کہ کہا جاتا ہے، اُن کا بگڑا بچہ انسان بن جائے گا۔ جب میری والدہ فیصلہ کر چکی تھیں تو بحث کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور پھر میرے والد صاحب نے بھی اس منصوبے سے اتفاق کیا۔ جب بھی خاندان کے اہم فیصلے لینے کا وقت آتا تو میرے والد صاحب میری والدہ کی مرضی کو ترجیح دیتے۔ یہ 1958ء کا ایک دن تھا جب میں شمس الدین کے پاس کام کرنے گیا۔ اُس کام پر پہلا دن میرے لڑکپن کا آخری دن تھا۔

باب 2

میری تربیت

شمس الدین مجھ سے کافی بڑے تھے اور اپنی بڑی بہنوں میں سے ایک کا خاوند ہونے کی حیثیت سے ان کے ساتھ تعلق تکلف پر مبنی تھا۔ ہمارے خطے، بالخصوص پاکستان میں دامادوں اور برادر ہائے نسبتی کو نہایت ہی امتیازی مقام و مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور ان کے ساتھ انتہائی تعظیم سے بات کی جاتی ہے۔اس کے برعکس، شمس الدین، ہمارے لیے کوئی اجنبی نہیں تھے۔ وہ ایک مشترکہ گھرانے کا حصہ تھے جسے میرے والدین برسوں سے جانتے تھے۔ وہ اپنے بھائیوں، عم زادوں اور ان کے خاندانوں کے ساتھ لاسی جماعت خانہ کے علاقے میں رہتے اور کام کرتے تھے جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بھی کراچی کے بہت سے اسماعیلی گھرانوں کے مانند لسبیلہ سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔شمس الدین اور ان کے خاندان کے کئی کاروبار تھے لیکن ان کی زیادہ تر آمدن کا انحصار خشک مچھلی کی سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو کو برآمد پر تھا۔ساحلِ مکران جو پاکستان میں سندھ اور بلوچستان کے صوبوں تک پھیلا ہوا ہے، مچھلیوں سے مالا مال ہے۔جس کے باعث کراچی، مچھلیوں اور سمندری خوراک کی تجارت کا مرکز بن گیا۔شمس الدین کے والد، برسوں سے ہی مچھلیوں کی تجارت کر رہے تھے۔ وہ اوڑمارا، جو لسبیلہ میں مچھلیاں پکڑنے کا چھوٹا سا مرکز تھا، وہاں سے ہجرت کر کے بیلا (ضلع لسبیلہ کا سب سے بڑا شہر) آئے تھے اور پھر بالآخر کراچی میں آباد ہوگئے تھے۔ میری بہن سے شادی کے بعد شمس الدین نے اپنے والد کے قائم کردہ خاندانی کاروبار سے الگ کاروبار

کرنے کا سوچا تھا۔ اس مرحلے پر میرے والدین نے ان کی مدد کی اور اس قدر سرمایہ فراہم کر دیا کہ مجھ سے چھ برس بڑے بھائی حسن علی اور شمس الدین برابری کی بنیاد پر ایک مشترکہ کاروبار میں حصہ دار بن جائیں۔

یہ مشترکہ کاروبار زیادہ دیر تک نہ چل سکا کیوں کہ میرے بھائی کی ذاتی زندگی نے اس وقت ایک دلچسپ موڑ لیا جب انہوں نے کولمبو کی ایک ڈاکٹر سے شادی کر لی۔ میری نئی بھابی، ایک اسماعیلی لڑکی جس کا بنیادی طور پر تعلق ''کچھ'' (یہ علاقہ ان دنوں بھارتی گجرات کہلاتا ہے) سے تھا اور وہ اپنے گھرانے کے ساتھ سری لنکا میں رہتی تھی، جہاں وہ برسوں پہلے ہجرت کر کے آباد ہو گئے تھے۔ اس شادی کے لیے میرا تمام خاندان سمندری راستے کے ذریعے کراچی سے کولمبو گیا لیکن میں پیچھے ہی رہا۔ میرے والد کے بھائی حسین علی اور نور محمد جو دونوں غیر شادی شدہ تھے، ہمارے صدر بازار والے گھر میں میرے ساتھ ہی ٹھہرے رہے۔ حسین علی کی طبیعت ناساز تھی اور میں ان کی تیمارداری کر رہا تھا۔ بدقسمتی سے وہ اس وقت انتقال کر گئے جب ابھی کولمبو میں شادی کی تقریبات جاری تھیں۔ اپنے والدین کو پریشان کرنے اور شادی میں کوئی رکاوٹ پیدا کرنے کے بجائے میں نے تمام انتظام سنبھال لیا اور معمول کے مطابق ان کی تجہیز و تکفین کی۔ اس لیے میں اپنی بھابی لیلیٰ کو اس وقت ہی دیکھ سکا جب وہ دلہا کی بارات کے ساتھ واپس آئی۔

لیلیٰ کراچی سے بخوبی واقف تھی۔ کولمبو میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لیلیٰ نے کراچی میں ہی میڈیکل کی تعلیم حاصل کی مگر اس کے باوجود کراچی اس کے لیے عارضی گھر تھا اور وہ مزید تعلیم کے حصول کے لیے لندن جانا چاہتی تھی۔ میرا بھائی، جو نرم خُو اور اپنی بیوی کے زیر اثر تھا، اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا اور میڈیکل کی ایک طالبہ اور بیوی کی حیثیت سے اسے جو معاونت درکار تھی، اسے بخوبی مہیا کی۔ وہ کم از کم دو برس کے لیے لندن چلے گئے۔ 1950ء کی دہائی میں ایک مرد کی طرف سے بیوی کے لیے قربانی دینے کا یہ انوکھا واقعہ اور غیر معمولی بات تھی۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو میرا بھائی بہت دور اندیش تھا۔ تاہم، میرے بھائی کی روانگی کا مطلب یہ تھا کہ وہ اب شمس الدین کے ساتھ اپنے

معاہدے کی ذمہ داریاں پوری نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب مجھ سے سدرن کمرشل کارپوریشن میں اس خلا کو پورا کرنے اور شمس الدین کے ساتھ حسن علی کی شراکت داری نبھانے کے لیے کہا گیا۔

اس مشترکہ کمپنی کے کاروباری امور، بلوچستان کے دورافتادہ ساحلی شہروں تک وزارت خوراک ،حکومت بلوچستان کی طرف سے اناج کی نقل وحمل اور تقسیم پر مشتمل تھے۔ یہ نسبتاً غریب شہر تھے جو بے آباد و بنجر صحرائی علاقوں میں واقع تھے جہاں مقامی زرعی پیداوار کی قلت تھی۔ وہاں کے لوگ پاکستان کے دیگر حصوں سے بھجوائی گئی خوراک کے محتاج تھے۔ چوں کہ یہ کاروبار برابر کی شراکت داری پر مشتمل تھا، اس لیے شمس الدین مجھ سے عمر کے فرق کے باعث حاصل شدہ تجربے سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ ان کا میرے ساتھ سلوک اچھا نہ تھا اور انہوں نے کام کا سارا بوجھ میرے کاندھوں پر ڈال دیا تھا یعنی اِدھر اُدھر کی بھاگ دوڑ ، سامان کی تفصیل کی تیاری، مسلسل سفر، دفتر میں گھنٹوں کام میں مصروفیت کے علاوہ مال کی روانگی بھی مجھے یقینی بنانا ہوتی تھی۔ وہ سارا دن مجھے حکم دیتے رہتے اور خود کوئی کام نہ کرتے۔ اناج بلوچستان کو بھیجا جا رہا تھا اور کاروبار سندھ میں قائم تھا، جبکہ ایک لحاظ سے گاہکوں میں دونوں صوبوں کی حکومتیں اور حکام شامل تھے۔ یہ ایک پیچیدہ صورت حال تھی۔ مجھے بل جمع کرنے اور انہیں پراسیس کرنے کے لیے قلات جانا پڑتا۔ پھر میں پے آرڈر لینے کے لیے کوئٹہ (بلوچستان کے دارالحکومت) کے نزدیک مستونگ چلا جاتا جہاں نیشنل بینک آف پاکستان کی قریب ترین شاخ واقع تھی۔ اُن دنوں کوئی کوریئر سروس یا ای میل کی سہولت موجود نہ تھی حتیٰ کہ ٹیلیفون بھی آسائشات میں شمار ہوتا تھا۔ بلوچستان کے اندرونی علاقوں میں ڈاکخانے کا نظام درست نہیں تھا اس لیے ہر کام مجھے ذاتی طور پر انجام دینا ہوتا۔

میں ہر دو ہفتے بعد بلوچستان کا ایک بھرپور دورہ کرتا اور سہ پہر کو کراچی سے روانہ ہونے والی بولان میل پہ سفر کرتا جسے اس وقت ''انٹر کلاس'' کہا جاتا تھا۔ اس پر ایک عام برتھ کا کرایہ -/25 روپے ہوا کرتا تھا۔ کچھ کاغذات، کپڑوں اور بستر کے ساتھ میں بلوچستان کے

لمبے اور سست سفر پر روانہ ہوجاتا۔ ریل گاڑی کا اپنا نام، بولان میل بھی سحر انگیز تھا۔ درہ بولان، قدرت کا ایک شاندار مظہر ہے اور افغانستان سے مغربی پاکستان کو الگ کرتا ہے۔ بہر حال، بولان میل کے ذریعے سفر یا طویل دورے کوئی خوشگوار تجربہ نہ تھے۔ جب ریل گاڑی بھاری قدموں سے رینگنے لگتی تو میں نہایت ہی صبر کے ساتھ کوٹری اسٹیشن آنے کا انتظار کرتا جہاں ہم عین وقت پر رات کے کھانے کے لیے پہنچ جاتے۔ یہاں ریل گاڑی اپنے اسٹیم انجن کے لیے پانی اور کوئلہ لینے کے لیے کچھ دیر کے لیے رکتی۔ میں یہ وقت ملائی اور نان کے ساتھ جلدی جلدی رات کا کھانا کھانے کے لیے استعمال کرتا کیونکہ دور افتادہ ریلوے اسٹیشن پر شام کے اس پہر یہی کچھ ہی دستیاب ہوتا۔ جب ریل گاڑی اپنا سفر دوبارہ شروع کرتی، یہ چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر رکتی چلی جاتی۔ میں سوجاتا اور کبھی کبھار اٹھ کر ریل گاڑی رکنے کی صورت میں چائے کی ایک پیالی پی لیتا یا پھر میں بیٹھ کر کھڑکی سے باہر گہرے اندھیرے کی دبیز چادر کو تکتا رہتا۔ نصف شب جب میں اکثر و بیشتر سویا ہوتا، بولان میل سندھ سے بلوچستان داخل ہو رہی ہوتی۔ صبح سویرے ریل گاڑی سبی پہنچ جاتی جو طویل اور شاندار تاریخ رکھنے والا بلوچستان کا ایک شہر ہے۔ یہاں میں ناشتا کرتا۔ اچھی اور گرم چائے کے ساتھ ایک ابلا انڈہ اور ایک توس میرا ناشتہ ہوتا۔ پھر ریل گاڑی دوبارہ چل پڑتی جسے مجھے دوڑ کر پکڑنے کے لیے چائے کی آخری پیالی غٹا غٹ تیزی سے پینا اور جلدی سے ناشتے کی قیمت ادا کرنا ہوتی۔ دوپہر کے وقت 850 کلومیٹر کا سفر طے کرنے کے بعد ہم کوئٹہ پہنچ جاتے۔

میرا یہ سفر اس لحاظ سے غیر دلچسپ اور بے لطف ہوتا کہ میں محض بل اکٹھے کرنے اور ادائیگیوں کی وصولی تک ہی محدود رہتا تھا۔ ریلوے پٹڑی جس پر بولان میل چلتی تھی، بہت زیادہ سٹریٹجک اہمیت کی حامل تھی کیوں کہ یہ ریلوے پٹڑی انگریزوں نے 1870ء اور 1880ء کی دہائیوں میں بچھائی جس کا مقصد فوجیوں کے علاوہ فوجی ساز و سامان کی تیز رفتار نقل و حمل، روسی حملے سے حفاظت یا پھر افغانستان کے ممکنہ حملے سے بچاؤ تھا۔ جب میں نے بلوچستان میں سفر کرنا شروع کیا تو یہ نظریات اور اس دور کے جغرافیائی و سیاسی

چالیس، میرے ذہن سے کوسوں دور تھیں لیکن یہ تو ہرگز معلوم نہ تھا کہ انیسویں صدی کے سٹریٹجک حالات محض ایک چوتھائی صدی بعد دوبارہ پیدا ہونے کو تھے اور انہیں پاکستان کے لیے مشکلات پیدا کرنے کا سبب بننا تھا۔

کوئٹہ ریلوے اسٹیشن کے باہر میں سالن (کڑی گوشت) روٹی پر مشتمل تسکین بخش دوپہر کا کھانا کھاتا۔ جب شہر میں میرا کام ختم ہو جاتا تو میں قلات جانے کے لیے بس پر سوار ہو جاتا۔ یہ بس دراصل چار پہیوں والا ایک ٹرک تھی جسے طویل سفر کی خاطر مسافر گاڑی میں تبدیل کیا گیا تھا۔ میں سامنے کی نشست حاصل کرتا، میں نے اوورکوٹ پہنا ہوتا کیوں کہ موسم بہت سرد اور درجہ حرارت موسم سرما میں نقطہ انجماد سے بھی نیچے گر جاتا۔ اس کی نسبت موسم گرما قدرے خوشگوار ہوتا، اگرچہ اس دوران بعض ایام بہت ہی گرم ہوتے جب درجہ حرارت 40 سنٹی گریڈ سے بھی اوپر چلا جاتا۔ قلات کا سفر چھے گھنٹوں پر محیط ہوتا اور وہاں ہم شام کو پہنچ جاتے۔ وقت ضائع کیئے بغیر جیسے ہی میں سرکاری مہمان خانے کے کرایہ کے ایک کمرے میں اپنا بیگ رکھتا تو کاغذی کارروائیوں کا آغاز ہو جاتا، بلوں کا پیچھا کرتا، ان کے متعلق مختلف دفتری کارروائیوں کی تکمیل کرتا اور ان میں موجود سرکاری ملازمین سے ملاقات کے علاوہ ان نئے سرکاری ملازمین سے راہ و رسم پیدا کرتا جنہوں نے میرے کاغذات کی منظوری دینے کے بعد اگلے دن رقم کی ادائیگی کا انتظام کرنا ہوتا۔ رات کا کھانا عام طور پر روٹی اور سالن پر مشتمل ہوتا اور خاص طور پر موسم سرما میں ایک سرد اور تکلیف دہ رات میری منتظر ہوتی۔ جہاں تک میری خواب گاہ کا تعلق ہے، ایک بڑے ہال کو خواب گاہ میں تبدیل کر دیا جاتا تھا اور فی رات پانچ روپے کرایہ لیا جاتا۔ کمرے میں روشنی کے لیے موم بتیاں استعمال ہوتیں۔ اس بڑے کمرے کو گرم کرنے کی خاطر مجھے لکڑی کے چار بڑے بڑے گٹھے جلانے ہوتے۔ بہرحال اس تدبیر کے باوجود کمرہ گرم نہ ہوتا اور انگارے تو رات ختم ہونے سے پہلے ہی بجھ چکے ہوتے۔ بجلی ابھی تک کہیں کہیں دستیاب تھی اور قلات میں ہر شام کو صرف تین گھنٹے کے لیے بجلی دستیاب ہوتی۔ یہ سب کچھ نہایت ہی مشکل، سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی دلچسپ بھی تھا۔

یہ تگ ودو ہمارے چھوٹے سے کاروبار کے لیے بہت ضروری تھی۔ منافع کی شرح بہت کم تھی۔ بل اکٹھا کرنے اور پے آرڈر جاری کروانے کے ذریعے ہم محض اپنے سرمائے کو گردش میں رکھنے میں ہی کامیاب ہو پاتے تاکہ اگلے سودوں کے لیے رقم ہمارے پاس دستیاب ہو سکے۔ جیسے یہ رقم آتی تو میرا کام یہ ہوتا کہ کراچی سے اناج کی اگلی قسط وصول کروں اور یہ امر یقینی بناؤں کہ اسے گاڑیوں پر لاد دیا گیا ہے اور اسے پسنی، اوڑمارا اور گوادر جیسے ساحلی شہروں کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے۔ پھر مزدور اپنے کاندھوں پر اناج کی بوریاں لاد کر لے جاتے اور مجھے ذاتی طور پر وہاں موجود رہنا پڑتا کہ اس کی تقسیم میں تاخیر نہ ہو یا اسے چوری نہ کر لیا جائے۔ بعض اوقات میں خود بھی اناج کی بوریاں اٹھاتا تاکہ دوسروں کو حوصلہ ہو اور کام جاری رہے۔ گوادر اور پسنی میں اناج کو خشکی تک پہنچانے کا کوئی انتظام نہ تھا اور مزدور اناج کی بوریوں کو چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں رکھتے جاتے اور ہم سب پانی میں سے سفر کرتے ہوئے خشکی پر پہنچ جاتے اور مال اتارتے وقت میں بھی کبھی کبھار موجود ہوتا، اس دوران ہمارے پاجامے اور ٹانگیں پانی میں گیلی ہو جاتیں۔ مجھے یہ تجربہ ہمیشہ ہی خوشگوار محسوس نہ ہوتا لیکن کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح یہ مشکل اور تلخ تجربہ مجھے اپنے ہی وجود میں سے ایک 'کام کا آدمی' دریافت کرنے میں مدد دیتا۔ اناج بھیجے جانے کے چند دن بعد، میں پسنی، گوادر یا ان مقامات پر جاتا جہاں اناج تقسیم کیا جاتا تھا تاکہ میں یہ رسید یا سند حاصل کر سکوں کہ اناج کا ذخیرہ بخیر و خوبی پہنچ چکا ہے۔ بعد ازاں میں کراچی واپس چلا جاتا اور بولان میل پر سوار ہو کر کوئٹہ، قلات کی طرف ایک نئے سفر کا آغاز کرنے سے پہلے انوائس تیار کرتا۔

شمس الدین لگاتار کام کے ذریعے مجھے نچوڑ رہے تھے۔ اگرچہ ان کی نیت کبھی صاف نہیں رہی لیکن میں ان کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے بلوچستان کے دوروں سے سیکھنے کا موقع دیا۔ ایک رات میں ٹرک کے عقبی حصے میں بیٹھا گوادر سے تربت کی طرف سفر کر رہا تھا۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی اور سڑک ریتلی اور غیر ہموار تھی اور ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ اچانک ایک دھچکے کے ساتھ ٹرک رک گیا۔ اس کا کوئی پرزہ ٹوٹ گیا تھا۔ باہر اندھیرا اور ویرانی کا عالم تھا۔ مرمت کرنے کے آلات اور فاضل پرزوں سے

محروم ڈرائیور حوصلہ ہار گیا۔ ڈرائیور نے اعلان کیا کہ اب ہمیں وہاں ایک رات کے لیے رکنا پڑے گا۔ ہم میں سے کچھ نے احتجاج کیا اور بحث شروع کر دی۔ میں اس قدر تھکا ہوا کہ کچھ کہنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ میں نے اپنا بستر کھولا، ٹرنک کو اپنے پاؤں کے نیچے حفاظت سے رکھا جس میں میری قیمتی دستاویزات موجود تھیں اور بلوچستان کی ریت پر سونے کے لیے چل دیا جبکہ نیلے آسمان کی چادر میرے سر پر تنی ہوئی تھی۔ جب میں بیدار ہوا، صحرائی کیڑے مکوڑوں کے کاٹنے سے میرا چہرہ سوج چکا تھا۔ مجھے نیند کے دوران اس چیز کا قطعی احساس نہیں ہوا کہ میں تو خراٹے لے رہا تھا اور کیڑے مکوڑے اپنا کام کر رہے تھے۔

بولان میل اور اچھلتے کودتے ٹرکوں پر میرے یہ سفر، بلوچستان سے میرے تعارف کا آغاز ثابت ہوئے۔ وہ بلوچستان جو میرے وطن کا ایک ایسا حصہ تھا جہاں میرے آباؤاجداد نے کچھ برسوں کے لیے قیام کیا تھا لیکن اس کے متعلق مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ مجھ پر ایک جذباتی اور سرشاری کی کیفیت طاری ہوگئی، بلکہ مجھے یہ دیکھ کر غصہ بھی آیا کہ بلوچستان میں غربت کا دوردورہ ہے۔ ایک بڑے شہر سے تعلق ہونے کی حیثیت سے جہاں میری زندگی انتہائی مصروف تھی، میں نے پہلی دفعہ مضافاتی علاقے دیکھے۔ میں نے چلتی ہوئی ریل گاڑی کی کھڑکی سے بلوچستان کی بنجر زمینیں اور چھوٹے چھوٹے گاؤں دیکھے۔ ٹرک نما بس کی نشست پر بیٹھے قلات اور پسنی کی طرف سفر کرتے ہوئے بہت سے گاؤں دیکھے جن میں سے ہر ایک کی نہ صرف اپنی ایک بھرپور تاریخ تھی بلکہ ہر ایک سے بہت سی متاثر کن کہانیاں وابستہ تھیں۔ یہاں غیر گنجان آباد اور کھلے ریتلے میدان موجود تھے جو وسعتوں میں پھیلے ہوئے تھے جنہوں نے مجھے ہمیشہ کے لیے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ گوادر خاص طور پر میرے لیے اہمیت کا حامل تھا جس نے میری والدہ کو خوش آمدید کہا تھا۔ جس چیز نے مجھے انتہائی پریشان کیا، وہ چشم کشا غربت تھی۔ گرم ریت پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے بچے، بھوکے اور کمر سے چپکے ہوئے پیٹ، یہ حقیقت کہ نقل وحمل کا انتہائی اہم ذریعہ بس گدھا گاڑیاں تھیں، میلوں دور تک گھنٹوں کوئی کار دکھائی نہ دینا، پانی اور تعلیم کا فقدان، ان سب حقائق نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ یہ بات عیاں تھی کہ بلوچوں کی ناکامی اور پسماندگی کی ذمہ دار حکومت تھی۔ میرے باطن

کی گہرائیوں میں موجود اس مثالی تصور پر سوالات اٹھنے لگے تھے جس میں کہا گیا تھا کہ ریاست اور ''نظام'' سب کے ساتھ یکساں سلوک کرے گا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکرادا کیا کہ میں خوشحال تھا لیکن مجھے اس صورت حال پر غصہ بھی آتا تھا۔ جس چیز نے معاملات کومزید تلخ بنادیا تھا، وہ لوگوں کی معصومیت تھی۔ ان کے گنوار طور طریقوں اور خانہ بدوشانہ زندگی کے باوجود، بلوچی لوگ، سادہ ذہن کے مالک اور اجنبیوں کے لیے گرمجوش رویے کے مالک تھے۔ یہ بات قابل ذکر تھی کہ وہاں جرائم کی شرح نسبتاً کم تھی اور رات کے وقت بھی سڑکیں محفوظ تھیں۔ میں عام لوگوں کے ساتھ اور سڑکوں پر ملنے والے لوگوں کے ساتھ بلوچی میں بات چیت کرتا، بلوچی زبان میں اپنی مہارت کو سراہتا اور ہرروز اپنی والدہ کا شکرادا کرتا کہ انہوں نے مجھے بلوچی زبان سکھائی۔ مقام افسوس ہے کہ گزشتہ 50 برسوں میں بلوچستان میں کچھ بھی تو تبدیل نہیں ہوا۔ یہ صوبہ وسائل سے مالامال ہے لیکن غربت زیادہ ہونے کے علاوہ عوامی سہولیات کی خاص طور پر کمی ہے۔

دریں اثنا میری کوششیں بارآور ثابت ہورہی تھیں اور 'ایس سی سی' نہایت تیزی کے ساتھ ترقی کررہی تھی۔ کمپنی نے منافع کمانا شروع کیا اور اس کی شہرت میں بھی اضافہ ہوگیا۔ میں چوبیس گھنٹے کام کررہا تھا جو میری والدہ اور کالج کے ان دوستوں کے لیے انتہائی حیرانی کا باعث تھا جو مجھے کرکٹ اور غیرنصابی سرگرمیوں میں دلچسپی کے دنوں سے جانتے تھے۔ اپنے دفتر میں، میں اکاؤنٹینٹ، ڈاک بھیجنے والا، منیجر، چپراسی، عمومی نگران، سب کچھ میں بذاتِ خود تھا۔ میرے بہنوئی صبح دس بجے دفتر آتے، ایک بجے تک آرام کرتے اور کبھی کبھار غیرضروری سوالات پوچھتے۔ پھر وہ اپنے کلب چلے جاتے جہاں وہ پُرتعیش دوپہر کا کھانا کھاتے، تقریباً تین بجے سہ پہر واپس آتے، ایک گھنٹے تک ادھراُدھر پھرتے اور پھر گھر چلے جاتے۔ میں گھنٹوں کام کرتارہتا اور گھنٹوں کی میری اس محنت کے باعث ہمارامنافع بھی بڑھنے لگا۔ میرے کہنے سے مراد یہ ہے کہ 'ایس سی سی' روز بہ روز ترقی کی منازل تیزی سے طے کرنے لگی۔ میں نے جلد ہی محسوس کرلیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ کاروبار کو پھیلایا جائے۔ شمس الدین کواس معاملے سے کوئی سروکار نہ تھا اور میں یہ جانتے ہوئے آگے بڑھ گیا کہ میں

تو کسی نہ کسی طرح یہ کام کر کے رہوں گا۔ وفاقی حکومت کی وزارت خوراک وزراعت کراچی بندرگاہ سے جو گندم درآمد کرتی تھی، میں نے اس کے بحری جہازوں پر سامان لادنے، اتارنے اور کلیئر کرانے کے معائدے پر دستخط کر دیئے۔ ہم نے مسابقتی بنیاد پر معاہدہ حاصل کیا اور اس کاروبار کے لیے سب سے کم نرخ پیش کیے جس کا ہمیں کوئی تجربہ نہ تھا۔ اب مجھے ایک کسٹم ایجنٹ اور کلیرنگ سہولت کار بننے کے علاوہ وفاقی حکومت سے رابطہ کے لیے کچھ سیکھنا تھا یعنی اب مجھے صوبائی حکومت کے افسران کے بجائے وفاقی حکومت کے ساتھ کام کرنا تھا۔ یہ میرے لیے زندگی وموت کا لمحہ تھا۔

ہم نے 1959ء میں اپنے پہلے بحری جہاز کے معاملات طے کیے۔ مجھے ابھی تک اس بحری جہاز ہیلینک گلوری (Helenic Glory) کا نام یاد ہے کیوں کہ اس نام کے باعث مجھے قدیم یونانی دیوتا ہرکولیس کے کارنامے یاد آ گئے۔ ہیلینک گلوری 800 ٹن گندم لے کر آیا تھا۔ جب گندم تقسیم ہو جاتی، مجھے ان سرکاری افسروں کے ساتھ راہ ورسم بڑھانا پڑتی جو میری فیس ادا کرتے تھے۔ مال پہنچانے کی سند، بلوں پر کارروائی، ادائیگیوں کا اکٹھا کرنا، پرانے سلسلے کا دوبارہ آغاز ہو گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب مجھے وفاقی حکومت کے افسروں سے ملاقات کرنی تھی۔ مال لادنے اور چڑھانے کا کاروبار ترقی کرنے لگا اور ہمیں محسوس ہونے لگا کہ ہمیں مزید جگہ درکار ہے۔ اس لیے ہم کاغذی بازار کی عمارت سے حبیب سکوائر کے وسیع نئے دفتر میں منتقل ہو گئے۔ مستقبل میں متوقع ترقی کی امید پر اضافی عملہ بھرتی کر لیا گیا۔ اس کاروبار کے لیے ہم نے بلوچستان میں اپنی کاروباری سرگرمیوں سے حاصل کردہ منافع بطور سرمایہ استعمال کیا اور نیا سرمایہ بطور قرضہ حاصل نہیں کیا۔ میری سخت محنت بارآور ثابت ہونے لگی۔ ایک چنچل آزاد منش نوجوان، جسے کاہل اور سست بھی کہا جا سکتا تھا اسے کام کرنے والے ایک سنجیدہ شخص میں تبدیل ہوتا دیکھ کر ان لوگوں کو حیرت ہوتی جو مجھے پہلے ہی سے جانتے تھے۔ ایک نئے تبدیل شدہ انسان کا نیا جذبہ لیکر مجھے اب اپنی لغت سے ناکامی کا لفظ نکالنا پڑا اور میں نے پہلے سے زیادہ محنت شروع کر دی تھی۔ اس وقت میرے نزدیک اہمیت اس امر کی تھی کہ میں اپنے اہداف ہر قیمت پر حاصل کروں اور اپنی کارکردگی زیادہ سے زیادہ بہتر

بناؤں ۔کوئی چیز مجھے اندر سے حوصلہ اورتحریک فراہم کررہی تھی ۔جذبہ محرکہ جوبھی تھا بہرحال میں ہر ہفتے پہلے سے کہیں زیادہ مصروف ہوتا۔

ہفتے کے تقریباً تمام دن ہم کسی نہ کسی بحری جہاز سے گندم اتارر ہے ہوتے ، اسی طرح ہفتے کے تمام دن ہم بلوچستان اور یہاں گندم کی ترسیل کی سلسلے میں مصروف ہوتے ۔ عین اسی طرح میں ہفتے میں تقریباً ہرروز اپنے دفتر سے باہرکاروباری امورکی انجام دہی کے لیے موجود ہوتا،کبھی سرکاری محکموں سے رابطے کرتا یا پھر بندرگاہ پر مال لادنے اوراتارنے کی نگرانی کے لیے آستینیں چڑھائے موجود ہوتا یا بلوچستان کی طرف محوسفر ہوتا۔ مجھے ایک لمحہ فرصت نہ ملتی لیکن خوشی اورکامیابی کی لہر مجھے سرشار کیے رکھتی ۔میرے ساتھی اورمیرے ہم عصر 'ایس سی سی' کو''ون مین شو'' کہہ کر پکارنے لگے ۔ میں ہنس دیتااوراپنے کام میں مصروف ہوجاتا۔کاروبارترقی کررہاتھااور ہرچیز درست سمت میں جارہی تھی ۔شمس الدین ایک مطمئن شخص معلوم ہوتے تھے ۔کام تووہ بہت کم کرتے لیکن شراکت کے مطابق آدھا منافع انہیں مل جاتا۔صرف یہی نہیں بلکہ ان کے کلب اورسماجی زندگی کے اخراجات اداکرنے کے لیے مجھے کافی کچھ کمانا پڑتا۔میرے خیال میں یہ سب کچھ ان کے لیے انتہائی اطمینان بخش تھا لیکن ان کے ذہن میں کچھ اورہی چل رہا تھا۔

1961ء کی ایک صبح ، جب میں حسب معمول تیارہوکردفتر جانے لگا تو میری والدہ نے کہا کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں ۔میں نے اسے قطعی طور پرایک سنجیدہ معاملہ نہ سمجھا اور مجھے دفتر جانے کی جلدی بھی تھی لیکن میری والدہ کی آواز سے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی سنجیدہ مسئلہ درپیش ہے۔ بہرحال میری والدہ نے مجھے بتایا کہ میری بہن ملک سلطان گھر آئیں تھیں اورانہوں نے شکایت کی ہے کہ میں نے ''ایس سی سی'' کے دفتر کی تجوری سے پانچ ہزارروپے چوری کر لیے ہیں ۔میرے بہت سے فرائض میں سے ایک ذمہ داری کیشیئر کی بھی تھی ۔شمس الدین نے میری بہن کو بتایا کہ راتوں رات دفتر سے پانچ ہزارروپے غائب ہوگئے ۔دراصل ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں رقم غبن کررہا ہوں اور بے ایمان ہوں ۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک صاف جھوٹ تھا۔ مجھے انتہائی صدمہ ہوا لیکن میری والدہ مشکل ترین

حالات میں بھی عملیت پسندی اور بردباری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتی تھیں۔ انہوں نے میری طرف سے کسی وضاحت کا انتظار نہیں کیا۔ وہ صورت حال کا اندازہ کر چکی تھیں اور وہ وقت سے کہیں آگے کا سوچ رہی تھیں۔ والدہ نے مجھے بتایا، ''اگر تم معاملہ آگے بڑھاؤ گے تو تمہاری بہن کے لیے مسئلہ پیدا ہوگا۔'' میں سمجھ گیا۔ حبیب سکوائر کے دفتر میں، یہ میرا آخری دن تھا...... میں کبھی واپس نہیں گیا۔ منافع میں سے اپنا حصہ وصول کرنا تو درکنار حتیٰ کہ میں نے اپنا اصل سرمایہ بھی واپس نہ لیا۔ میرا تمام منافع، گزشتہ مہینوں میں دوبارہ کاروبار میں لگا دیا گیا تھا۔ شمس الدین نے یہ سمجھتے ہوئے اس کمپنی کی 100 فیصد ملکیت حاصل کرنے کے علاوہ کاروبار کا تمام انتظام بھی سنبھال لیا تھا کہ اس کے سسر وساس اور اس کے برادر ہائے نسبتی اپنے وقار کی خاطر اس سے کچھ بھی استفسار نہیں کریں گے۔ اب شمس الدین نے کمپنی چلانی شروع کی لیکن اب انہیں میرا عزم اور توانائی میسر نہیں تھی اور ان کے بغیر کسی بھی صورت میں یہ کمپنی ترقی نہیں کر سکتی تھی بلکہ اب تو یہ کمپنی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی۔ چند ہی برسوں میں شمس الدین دیوالیہ ہو گئے۔ جبکہ میں کسی اور جگہ اپنے حصے کا رزق پا رہا تھا۔

باب 3

1960ء کی ہنگامہ خیز دہائی

شمس الدین کے ہاتھوں نقصان اٹھانے کے بعد اور اب نئے کاروبار کے لیے رقم ہاتھ میں نہ ہونے کے باعث مجھے سب کچھ دوبارہ شروع کرنا تھا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے مجھے سٹیل کارپوریشن آف پاکستان کے ساتھ بطور سیلز ایجنٹ کام کرنے کا موقع ملا جو پاکستان کے ایک امیر ترین خاندان، فینسی خاندان کی ملکیت تھی۔ میرا کام کپاس کی گانٹھیں باندھنے کے لیے استعمال ہونے والی سٹیل کی پتریاں (Bailing hoops) فروخت کرنا تھا۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ یہ کوئی کام نہ تھا۔ میں ایک سیلز ایجنٹ تھا اور میرا کام جننگ فیکٹری میں جا کر یہ سٹیل کی پتریاں فروخت کرنا تھا۔ جو تھوک قیمت میں سٹیل کارپوریشن کو دیتا اور جو پرچون قیمت میرے گاہک مجھے دیتے، ان قیمتوں کے درمیان فرق ہی میرا منافع تھا۔ یہ دنیا بھی میری جانی پہچانی تھی۔ رالی برادرز کے ساتھ میرے والد کے مراسم اور کاروباری تعلقات کی وجہ سے وہ مجھے جانتے تھے کہ میں کون ہوں۔ میرے والد حسین ہاشوانی ان کی کاٹن کے ایک اہم خریدار تھے۔ حالانکہ میرے پاس میرے والد کی ساکھ تھی لیکن میرے پاس سرمایہ نہیں تھا۔

ان کارخانوں میں اپنا مقام بنانے کے لیے اور بطور ایجنٹ دوسروں سے بہتر کام کرنے کے لیے مجھے کچھ ہٹ کر اور نیا کرنا تھا۔ میں نے یہ سب کیسے کیا؟ سب سے پہلے تو میں نے سٹیل کارپوریشن کو نقد ادائیگی کرنے کے بجائے سٹیل کی پتریاں خریدنے کے لیے

انہیں چیک دینے شروع کر دیے۔ پھر میں ان سٹیل کی پتریوں (Bailing hoops) کو گودام یا پھر کپاس کے کسی صنعتکار کے کارخانے بھجوا دیتا۔ میں یہ امر یقینی بناتا کہ کارخانے کے مینیجر سے ڈیلیوری آرڈر مجھے فوراً ہی مل جائے اور اس طرح یہ تصدیق ہو جاتی کہ سٹیل کی پتریاں (Bailing hoops) میرے خریدار کو موصول ہو چکی ہیں۔ میں ذاتی طور پر کارخانے کے مالک کے پاس جاتا، اسے ڈیلیوری آرڈر دکھاتا اور اپنی رقم لے لیتا۔ پھر میں اس چیک کو اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتا۔ میں نے بہت سے بینک اکاؤنٹس کھلوا رکھے تھے تاکہ میں اُس بینک اکاؤنٹ کا انتخاب کر سکوں جہاں میرے خریدار کا بھی اکاؤنٹ ہو۔ اس کے باعث اسی دن رقم کی ادائیگی یقینی اور ممکن ہو جاتی کیوں کہ رقم کی منتقلی بینک کی ایک ہی شاخ میں ایک اکاؤنٹ سے دوسرے اکاؤنٹ میں ہوتی ہوتی اور یہ کام ایک ہی دن میں ہو جاتا۔ جس وقت سٹیل کارپوریشن وہ چیک جمع کراتی جو میں نے اس کے مینیجروں کو دیے ہوتے، تو پھر میرے بینک میں کافی رقم موجود ہوتی اور چیک واپس ہونے کا امکان نہ ہوتا۔

کیا وجہ تھی کہ میں اپنے چیک خود ہی حاصل کرتا؟ چوں کہ سٹیل کارپوریشن ایک بڑی کمپنی تھی، اس نے چیک اپنے اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ بھجوانے ہوتے اور اسے جمع کرانے کے لیے چپراسی یا کلرک بھجوانے کے لیے ایک دن انتظار کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ رقم اسی دن منتقل نہیں ہوتی تھی کیوں کہ میرے اور سٹیل کارپوریشن کے اکاؤنٹ دو الگ الگ بینکوں میں تھے۔ اس لیے میں بذاتِ خود بھاگم بھاگ چیک جمع کرا دیتا اور فوراً ہی مجھے اس قدر وقت میسر ہو جاتا کہ میں اپنا محدود سرمایہ پورا کر لیتا۔ میرا خیال ہے کہ قسمت مجھ پر مہربان تھی کیونکہ آج الیکٹرانک فنڈ ٹرانسفر کے دور میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کس بینک، کس شہر یا کس ملک سے رقم بھیج رہے ہیں۔ یہ سب کام برق رفتاری سے ہو جاتا ہے لیکن 1960ء کی دہائی میں حالات بہت مختلف تھے۔

یہ دو پیراگراف جن کا ابھی آپ نے مطالعہ کیا، محض میری حکمتِ عملی کے عکاس ہیں لیکن میں نے جو محنت کی، یہ اس کا مکمل طور پر احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ ایک سیلز ایجنٹ کی حیثیت سے اپنے حریفوں سے مسابقت کی خاطر مجھے محض رقوم کے جلد حصول کی کوشش ہی

نہیں کرنا تھی بلکہ مجھے بہتر خدمات بھی مہیا کرنا تھیں۔اس سے مراد سٹیل کارپوریشن کے کارخانے تک کا سفر اور سٹیل کی پتریوں (Bailing hoops) کی عملی وصولی شامل تھی۔ میں ہر سٹیل کی پتری (Bailing hoops) کا معائنہ کرتا اور اور ہر ناقص مال کو مسترد کرتے ہوئے بہترین سٹیل کی پتریوں (Bailing hoops) کا انتخاب کرتا۔ سٹیل کارپوریشن کراچی سے 25 سے 30 میل کے فاصلے پر واقع تھی۔اس زمانے میں جب پاکستان کے سڑکوں کا نظام اس قدر ترقی یافتہ نہیں تھا، یہ ایک طویل فاصلہ ہوا کرتا تھا۔ کارخانے میں مال لادنے کا کام میری موجودگی میں کیا جاتا تھا۔ میں ٹرک ڈرائیوروں اور ٹرک مالکان کے ساتھ گفتگو کرتا اور ان کے ساتھ ایک مناسب قیمت طے کر لیتا۔ میرے لیے ایک ایک پائی اہم تھی اور نقدی کی آمدورفت پر نظر رکھنا تھی۔ میں کارخانے میں یہ امر یقینی بناتا کہ منیجر سٹیل کی پتریوں (Bailing hoops) کا جائزہ لے لیں اور وصول ہونے والے مال کے متعلق مطمئن ہو جائیں۔ یہ سب کچھ مجھے کسی نے نہیں سکھایا تھا لیکن جو کچھ میں کر رہا تھا، میرے خریداروں کے تمام مسائل کے شافی حل کے لیے کافی تھا اور مال بھی بروقت پہنچ جاتا تھا۔ میں نے اپنے ایک دوست کو بتایا کہ میں نے اپنے ''گاہک کو دو دفعہ سلام'' کرنا سیکھا۔ پہلی دفعہ آپ کارخانے کے مالک کو سلام کرتے، اس لیے کہ اس نے آپ کو مال فراہم کرنے کے لیے کہا تھا۔ پھر دوسری دفعہ آپ نے کارخانے کے اکاؤنٹنٹ کو سلام کیا کیوں کہ اس نے فوری طور پر آپ کو چیک جاری کیا تھا۔ اب حالات تبدیل ہو چکے ہیں، کاروبار تبدیل ہو چکے ہیں، میرے جغرافیائی محاذ تبدیل ہو چکے ہیں ...... لیکن یقین کیجیے اُن میں سے کچھ بنیادی اصول تبدیل نہیں ہوئے۔ مجھے دنیا کا کوئی ایسا کاروباری دکھا دیں جو یہ کہہ سکے کہ اسے رقوم کی وصولی کے لیے پیچھا نہیں کرنا پڑتا اور میں اسے پل بھر میں جھوٹا ثابت کر دوں گا۔

سٹیل کارپوریشن کے ساتھ بطور سیلز ایجنٹ میرا کاروبار آئندہ تین یا چار برسوں میں فروغ پاتا گیا۔ سٹیل کی پتریوں (Bailing hoops) کے علاوہ اسٹیل کی دیگر مصنوعات جیسا کہ گرائنڈر، اسٹیل راڈ اور شوگر ملوں کے پرزے بھی فروخت کرنا شروع کر دیئے۔ مجھے اسٹیل کی مصنوعات کی تجارت میں مہارت حاصل ہو چکی تھی۔ مجھے لوہا راس

آ چکا تھا اس لیے میں نے اسٹیل کارپوریشن کے ایجنٹ کے طور پر کام کرنے سے آگے بھی دیکھنا شروع کر دیا۔ میرے سامنے اسٹیل کی چادریں اور اس طرح کی دیگر اشیاء کی خرید و فروخت کا آپشن بھی موجود تھا۔ پاکستان میں اسٹیل کی کھپت تو تھی لیکن یہ سٹیل کی پیداوار میں خودکفیل نہ تھا۔ اس لیے پاکستان کو شمالی کوریا، جاپان اور چین سے سٹیل بلٹ درآمد کرنے پڑتے تھے۔ اگر کوئی اس ضمن میں تحقیق کرتا اور قیمتوں کے اتار چڑھاؤ پر غور کرتا تو یہ مصنوعات سستی خرید کر مہنگی فروخت کی جاسکتی تھیں۔ اس کاروبار میں منافع تھا لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ آپ کے پاس اسٹیل کی تجارت کی بنیادی اور ضروری معلومات ہوں چنانچہ میں پوری تندہی سے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش میں لگ گیا اور کامیابی نے میرے قدم چومے حالانکہ یہ میرا شعبہ نہیں تھا اور نہ ہی میرا خاندانی پس منظر ایسا تھا۔

جلد ہی میں سٹیل بلٹ فراہم کرنے لگا جو سٹیل کی مصنوعات تیار کرنے کے لیے خام مال ہے، نیز میں ان کی سٹیل کی مصنوعات، مثلاً گارڈر وغیرہ خریدنے اور صارفین کو فروخت کرنے لگا۔ اس طرح مجھے سٹیل کے کاروبار پر بخوبی گرفت حاصل ہوگئی اور اس وقت مجھے اس کاروبار میں منطقی طور پر فروغ حاصل ہوا جب مجھے کپڑے کے کارخانوں کی طرف سے پیشکش ہوئی۔ میں ان کے ساتھ ایک عرصے سے کام کررہا تھا اور انہوں نے مجھ پر اعتماد کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس ضمن میں دو یا تین کارخانوں نے کمیشن کی بنیاد پر کراچی میں ان کی کاٹن فروخت کرنے کے لیے مجھ سے رابطہ کیا۔ انہوں نے میری ذات میں منڈی میں درکار مصنوعات کی فروخت کے متعلق میری مہارت کو محسوس کر لیا تھا...... یا پھر کم از کم انہوں نے میری اس کوشش کو تسلیم کر لیا تھا جس کے تحت میں سٹیل کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے سکتا تھا۔ انہوں نے بجا طور پر محسوس کر لیا تھا کہ میں نے سٹیل کے کاروبار سے جو سبق اور مہارت حاصل کی تھی، اس کے ذریعے میں مصنوعات کی تجارتی سرگرمیوں کا انتظام وانصرام کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہوں اور اپنی اس صلاحیت اور مہارت کو روئی کے کاروبار میں استعمال کرسکتا ہوں۔ اپنے والد کے روئی کے کاروبار سے تحریک پانے اور مشکل حالات میں ان سے مدد اور مشورہ چاہنے کی دولت سے لیس ہوکر میں نے اس پیشکش کو قبول

کر لیا۔ مجھے روئی کے کارخانوں سے ریل گاڑی اورٹرک کے ذریعے روئی موصول ہونی شروع ہوئی جس کے لیے میں نے خریدار تلاش کرنا تھے۔اس مرحلے پر دوبارہ مجھے روئی کی ہر گانٹھ کی معیاری حیثیت کا جائزہ لینا تھا۔ مجھے مال لادنے کے وقت یہ امر یقینی بنانے کے لیے وہاں موجود رہنا ہوتا کہ نقصان کم از کم ہو۔ میری پرانی عادتوں نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔ اب میرے لیے یہ بہت اہم تھا کہ میں منڈی میں اپنی موجودگی کی اہمیت کا جائزہ لوں۔ ''رالی برادرز'' جس کی نمائندگی میرے والد اور میرے بھائی اکبر کرتے تھے، بڑے بڑے کارخانوں سے روئی خریدتے اور اسے برآمدی منڈی میں فروخت کر دیتے۔ میں نے روئی کے چھوٹے چھوٹے کارخانوں کی نمائندگی شروع کر دی اور مقامی منڈی کی ضروریات پوری کرنے لگا، میں روئی کے صارفین اور خریداروں سے روابط کے قیام کے حوالے سے کمیشن ایجنٹ بن گیا،لیکن میرا اپنے والد سے کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔

اب ہم 1960ء کی دہائی کے وسط میں داخل ہو رہے تھے۔آزادی کا جوش و جذبہ سرد پڑ چکا تھا اور پاکستانیوں نے اپنی بے کیف اور بیزار زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ قائداعظمؒ صرف ایک برس ہمارے ساتھ رہے اورٹی بی کے باعث ستمبر 1948ء میں وفات پا گئے۔ یہ ایک ایسا المیہ اور سانحہ تھا جس کے باعث نہ صرف ملک اپنے اعلیٰ ترین قائد سے محروم ہو گیا بلکہ جمہوریت کا ابتدائی عمل بھی بری طرح متاثر ہوا۔جس آئین کے ہم مستحق تھے،ہمیں حاصل نہ ہو سکا۔ 1947ء میں مفادات کی خاطر سیاستدان جلد ہی مختلف گروہوں اور دھڑوں میں تقسیم ہو گئے جس کے باعث ملک میں افراتفری اور انارکی پھیل گئی۔اس صورت حال کے باعث ایک سیاسی اور انتظامی خلا پیدا ہو گیا جسے پہلے افسر شاہی اور بعدازاں فوجی جرنیلوں نے پورا کرنا چاہا۔ جب ایک دفعہ حد عبور ہو گئی جیسا کہ کہا جاتا ہے ''جب ایک دفعہ وہ (افسر شاہی اور جرنیل) داخل ہوئے، وہ کبھی نہیں گئے''۔ وہ عام طور پر خود کو اختیارات سے لیس کر لیتے۔ انہوں نے معاشی اور سماجی شعبوں کے متعلق پالیسی سازی کے اختیار بھی سنبھال لیے،جس کے وہ اہل نہ تھے۔ قائداعظمؒ کی خواہش، ایک مسلم قوم لیکن سیکولر ریاست کا قیام تھی جہاں غیر مسلم اقلیتیں بھی آزادانہ اور مساویانہ اپنے حقوق سے مستفید ہو سکتیں۔ یہ ایک ایسا نازک

فرق تھا جسے بہت ہی کم لوگ سمجھ پائے۔حتیٰ کہ 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں بھی بلاشبہ کراچی مسجدوں کا شہر تھا لیکن اس میں مندر، چرچ اور یہودیوں کی عبادت گاہیں بھی تھیں۔ کراچی میں یہودیوں کی تھوڑی تعداد موجود تھی اور لندن میں اردو بولنے والے یہودیوں سے بھی میری ملاقات ہوئی جن کی جائے پیدائش پاکستان تھی لیکن بعدازاں وہ لندن چلے گئے۔سندھ میں روئی کے کچھ کارخانے ہندوؤں کی ملکیت تھے اور ہیں۔کراچی میں نہایت ہی قابل احترام پارسی بھی موجود تھے۔میں جب بھی بلوچستان کا سفر کرتا، میری ملاقات ان ہندوؤں سے ہوتی جو روانی سے بلوچی بولتے۔یہ ایک دلچسپ اور متنوع معاشرہ تھا لیکن ہم محسوس کر سکتے تھے کہ حالات تبدیل ہو رہے ہیں۔سب سے بڑی مایوسی یہ تھی کہ حکومت، معیشت، انفراسٹرکچر، ملازمتوں کی تخلیق، لوگوں کی تعلیم کی طرف مناسب توجہ نہیں دے رہی تھی۔صرف اسی طریقے ہی سے پاکستان کے مسائل حل ہو سکتے تھے۔

اس وقت جب پاکستان میں جمہوریت پنپ نہیں رہی تھی اور سیاسی رہنما، عوام کے ساتھ کئے گئے اپنے وعدے پورے نہیں کررہے تھے،تو پھر یہ وقت فوجی مداخلت کے لیے نہایت ہی سازگار تھا۔اور یہ وقت اکتوبر 1958ء کو آن پہنچا جب جنرل ایوب خان نے فوجی انقلاب برپا کیا اور خود کو صدر کہلوانے لگا۔ 1960ء میں اس نے ایک براہ راست ریفرنڈم کے ذریعے اپنی توثیق چاہی اور بھاری اکثریت سے جیت گیا۔اس سے ظاہر ہوا کہ عام پاکستانی، سیاسی شعبدہ گری سے اکتا چکے تھے اور اپنے لیے ایک اچھی اور دوٹوک حکمرانی کے خواہاں تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک طویل القامت، جسیم اور ایک مقبول فوجی ایوب خان کو پاکستانیوں نے خوش آمدید کہا کیوں کہ وہ سیاستدانوں کی شعبدہ بازیوں سے اکتا چکے تھے اور اپنے لیے ایک اچھی اور دوٹوک حکمرانی کے خواہاں تھے۔

تاہم جہاں تک ملک کے مستقبل کا تعلق تھا، یہ انداز حکمرانی ہمارے لیے مفید ثابت نہیں ہوا اور ہماری سیاست میں فوجی مداخلتوں کے مستقل سلسلے کی بنیادیں رکھ دی گئیں۔ اگرچہ عوام 1958ء میں سیاسی ریشہ دوانیوں سے اس قدر تنگ آ چکے تھے انہیں فوجی بغاوت میں اپنے لیے طمانیت اور تسکین نظر آئی۔ یہ معاملات مجھ پر براہ راست بمشکل ہی اثر انداز

ہوئے کیوں کہ میرا کاروبار ایسا تھا کہ جس کے باعث مجھے حکومت سے رابطہ نہیں کرنا پڑتا تھا یا پھر میں حکومتی افسران یا وزراء سے کسی بھی قسم کے احکامات یا معاونت کامحتاج نہیں تھا۔ تاہم ان حالات کے تغیر وتبدل کے باعث ہم میں سے اکثر کی فکرمندی اور تشویش بجا تھی۔ ایوب خان کی مدت اقتدار 1969ء تک رہی جب خراب صحت اور سیاسی مسائل اور معاملات کے باعث اس نے آہستہ آہستہ حکومت کی باگ ڈور پہلے فوج اور پھر جنرل یحیٰی خان کے حوالے کر دی۔ درحقیقت، ایوب خان کے ابتدائی سال کچھ ایسے برے بھی نہ تھے۔ یہ کارنامہ اس کے نام کیا جا سکتا ہے کہ اس نے معیشت کو سہارا دیا اور ایسے اہل اور باصلاحیت سرکاری ملازموں کو آگے لایا جنہوں نے آئندہ پانچ سالہ منصوبے تشکیل دیے اور انہیں نافذ کیا۔ دوسرے پانچ سالہ منصوبے (65-1960) اور تیسرے پانچ سالہ منصوبے (70-1965) کی بنیاد صنعتی ترقی اور کچھ مفید قسم کی تجاویز تھیں۔ ایوب خان نے معاشی ترقی پر توجہ دی اور یہ مرحلہ، صرف اور صرف ایک ایسا مرتکز طویل مرحلہ تھا جس کے دوران پاکستان کی تاریخ میں معاشی حکمت سازی پر ہی توجہ اور زور دیا گیا تھا۔ افسوس کا مقام ہے کہ یہ کامیابیاں، توقعات پر پورا نہ اتر سکیں اور بجائے اس کے کہ ایوب خان نے 1960ء کی دہائی میں معاشی ترقی کے لیے جو خطوط مقرر کر دیے تھے، ان پر عمل کیا جاتا، بدقسمتی سے ان کے جانشینوں نے مارشل لاء نافذ کیا۔ کچھ ممتاز اور باصلاحیت ٹیکنوکریٹس کو بے اختیار کر دیا اور مزید یہ کہ سیاست اور پالیسی پر بحث کے راستے تنگ کر دیے۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنی داستان سے کچھ ہٹ رہا ہوں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا، مجھے ایوب خان یا کسی بھی دیگر قومی شخصیت سے کچھ لینا دینا نہ تھا۔ میں سٹیل اور روئی کے کاروبار میں مگن تھا۔ قطرہ قطرہ کر کے میں نے اپنا سرمایہ دوبارہ جمع کیا اور سادرن کمرشل کارپوریشن (ایس سی سی) کے ساتھ قیام کے دوران میں جو کچھ حاصل کرنے کے قابل تھا، اس سے کہیں زیادہ میں حاصل کر چکا تھا۔ شمس الدین کی بری یادیں بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ جب عمر اور کاروبار کے لحاظ سے پختہ کار ہو گیا اور میرا کاروبار جم گیا تو پھر آہستہ آہستہ میں اپنے دوستوں سے ملنے جلنے کے لیے وقت نکالنے لگا۔ آغا خان جمخانہ کے کچھ

میرے ساتھی یہ شکایت کرتے نظر آتے تھے کہ ان کے لیے میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے اور میں ہر وقت مصروف ہی رہتا ہوں۔ میں نے 1960ء کی دہائی کے وسط میں شعوری طور پر اپنے دوستوں کی اس شکایت کو دور کرنے پر توجہ دی۔ دوستوں سے ملنے جلنے اور سماجی تعلقات استوار کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ہفتے میں کم از کم ایک بار شام کے اوقات میں جب میری عام طور پر اس دن کی پیشہ ورانہ مصروفیات ختم ہو جاتی ہیں دوستوں کے ساتھ محفل جماؤں گا۔ مجھے فلمیں، خاص طور پر ہالی ووڈ کی فلمیں دیکھنے کا شوق تھا اور جان وائن میرے پسندیدہ ہیرو تھے۔ ہم عام طور پر آخری شو دیکھتے اور بعدازاں سڑک کنارے چکن تکہ اور دیگر لذیذ کھانوں پر مشتمل رات کا کھانا کھاتے۔ ہفتہ واری تعطیل پر ہم کرکٹ کھیلتے۔ تیز رفتار باؤلنگ کی میری مہارت ابھی تک برقرار تھی اور میں عام طور پر ایک دن میں 25 اوور کرالیتا۔ اس کے باعث میرا بدن درد کرنے لگتا اور کھیل ختم ہونے کے فوراً ہی بعد مجھے ایک مالشیے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ یہ سب کچھ انتہائی لطف اندوز تھا۔

جہاں تک کاروبار کا تعلق ہے، حسن علی اینڈ کمپنی جواب میرا اصل کاروبار تھا، اس نے 1965ء میں ایک بہت بڑا برآمدی سودا حاصل کیا اور سوویت یونین کو 500 ٹن روئی برآمد کی۔ بلاشبہ، حسن علی، میرے بہت ہی پیارے بھائی تھے۔ 1963ء میں وہ لندن سے اس وقت واپس آ گئے تھے جب ان کی بیوی نے میڈیکل میں اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کر لی تھی لیکن وہ اب پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔ جب ہم نے اکٹھے ایک کمپنی تشکیل دی، واضح طور پر وہ اب علیل تھے۔ ان کی جسمانی اور ذہنی حالت انہیں اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ صاف بات یہ ہے کہ زیادہ تر میں ہی کام کرتا لیکن میری خواہش تھی کہ وہ خود کو محفوظ اور مطمئن محسوس کریں۔ ان کی جسمانی اور ذہنی سکت اس قابل نہیں رہی تھی کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق کام کرسکیں۔ وہ تھرومبوسس (خون کے انجماد) جیسی سنگین بیماری کا شکار تھے لیکن ان کا یہ مرض ناقابلِ علاج ہی رہا حالانکہ ان کی اپنی بیوی ڈاکٹر تھی۔ ان کے جسم میں بہت سی گلٹیاں بن چکی تھیں اور ایک ٹانگ نیلی اور مفلوج ہوگئی۔ انہیں علاج کے لیے لندن لے جایا گیا جہاں ان کی ٹانگ کاٹنا پڑی۔ اس اثنا میں ان کی بیوی کی طرف سے لاپروائی برتنا

نا قابل برداشت ہو گیا تھا، اس لیے حسن علی نے واپس آتے ہی اسے طلاق دے دی۔ بعد میں ان کا مرض مزید بگڑ گیا اور انہیں پھر لندن لے جایا گیا مگر وہ جانبر نہ ہو سکے۔ کراچی اور لندن میں اپنے حلقوں میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز حسن علی 1974ء میں صرف 42 سال کی عمر میں اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ ایک برس پہلے ذوالفقار علی بھٹو نے تمام صنعتوں کو قومیا لیا تھا۔ نتیجتاً کپاس کی ہماری تجارت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ ان حالات نے بھی حسن علی کے جذبہ وشوق کو ماند بلکہ منتشر کر دیا تھا۔ تب میرے دوسرے بھائی اکبر نے میرے کاروبار میں میرا ہاتھ بٹانے کا آغاز کر دیا کیونکہ رالی برادرز کے ساتھ ان کا کاروبار 1968ء میں ختم ہو چکا تھا۔

بہر حال 1965ء میں سوویت یونین کو بہت بڑی مقدار میں روئی برآمد کرنے کے ذریعے میرے کاروبار کو ایک نئی زندگی ملی کیوں کہ اس سے قبل میرا یہ کاروبار ملکی سطح پر چھوٹے چھوٹے سودوں پر مشتمل تھا۔ اس سودے کی تکمیل کے لیے رقم کا حصول مشکل تھا۔ بینک ابھی تک قدامت پرست انداز اختیار کئے ہوئے تھے۔ ہم کاروبار میں نو وارد تھے اور ہماری حیثیت اس قدر معمولی تھی کہ بڑے بڑے بینک ہم پر بھروسا کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے مگر اس کے باوجود اس دفعہ پھر میں نے کچھ نیا کرنے کا سوچا اور میں نے ایک بڑی کمپنی کو اس سودے میں شریک ہونے کی پیشکش کی۔ بالآخر کسی مسئلے کے بغیر یہ شراکت داری طے ہوگئی اور میری اعتباریت مسلمہ ہوگئی۔ یہ سیکھنے کے لیے ایک نہایت ہی قیمتی سبق تھا جس نے مجھے اعتماد بخشا۔ اس مشترکہ کاروبار سے بہت زیادہ منافع حاصل کرنے کے بجائے میں نے مناسب منافع ہی کو غنیمت جانا اور اس اقدام نے مجھے روئی کی برآمد پر مشتمل کاروبار میں مزید مواقع کے متعلق ایک سوچ بخشی۔ ان دنوں پاکستان میں روئی کے کچھ زیادہ برآمد کنندگان نہیں تھے۔ روئی کے برآمدی کاروبار میں خطرات اور پیچیدگیوں، بہتر معیار کی حامل روئی کا حصول، بین الاقوامی قواعد وضوابط کی ترتیب، مال کی بحفاظت ترسیل اور بیرون ملک سے رقم کی وصولی کی ضمانت، نے روئی کے برآمد کنندگان کو خوفزدہ کر رکھا تھا۔ اس صورت حال کے باعث ایک روئی کی برآمدی منڈی پر ایک ہی بہت بڑے ادارے رالی برادرز (سوئٹزرلینڈ کا ایک کاروباری ادارہ) کا قبضہ تھا۔ اس کاروباری گروپ کا آج ایک

پارسی کاروباری حکیم الدین ہرمزی تھا اور کریسنٹ گروپ، حبیب گروپ بھی اس کی ملکیت تھے۔ کیا ان حالات میں ایک نئی کمپنی اپنا وجود برقرار رکھ سکتی تھی اور بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتی تھی؟ یہ میرے لیے ایک چیلنج تھا۔ سوویت یونین کو 500 ٹن روئی یا 4500 گانٹھوں کی برآمدی سودے نے مجھے اپنے محاذوں کو وسیع کرنے کا حوصلہ بخشا۔ مجھے ادراک ہو گیا کہ مجھے اپنے کاروبار کی بنیاد کم از کم منافع، تیز رفتار ترسیل اور کم از کم جاری اخراجات پر رکھنی چاہیے۔ یہی وہ بنیادی اور لازمی عناصر تھے جو میری کاروباری سرگرمیوں کے تسلسل کے لیے ضروری تھے۔ میرے خریداروں کے لیے، میری ساکھ اور قیمت ہی قابل اہمیت تھے جنہوں نے میری آئندہ کاروباری سرگرمیوں کے تسلسل کی بنیاد بننا تھا۔

دوسرے برآمدی سودے کے تحت شمالی کوریا کو اور تیسرے برآمدی سودے کے تحت چین کو روئی کی ترسیل ہونا تھی۔ اب تک ہم کپاس برآمد کرنے کی مسابقت میں اچھی کارکردگی دکھاتے ہوئے اپنا نام بنانے کے قابل ہو چکے تھے۔ اس موقع پر میں نے اسم ضمیر ''ہم'' اس لیے استعمال کیا کیوں کہ یہ میری ہی کمپنی تھی جس نے سودا طے کیا اور میرے بھائی نے کم از کم علامتی طور پر میری معاونت کی۔ لیکن عملاً میں ہی تمام کاروباری سرگرمیاں انجام دے رہا تھا۔ ایک کاروبار میں، بیلنس شیٹ اور آمدن کے اعداد و شمار ہی اصل چیز ہوتے ہیں۔ لیکن ایک کاروباری شخص کو اپنے ساتھیوں اور منڈی سے کیا توقع ہوتی ہے؟ یہ ایک ان دیکھی چیز ہے اور اس کا ڈالروں اور روپوں کے ذریعے تعین نہیں کیا جا سکتا۔ میرے خیال کے مطابق یہ موقع اس وقت 1960ء کی دہائی کے وسط میں آیا، جب روئی کے میرے برآمدی کاروبار میں عروج و کمال دیکھ کر کریسنٹ گروپ کے ایک ممتاز رکن نے بہ آواز بلند کہا ''یہ کون لونڈے (لڑکے) ہیں؟'' روئی کے برآمدی کاروبار سے منسلک بڑے بڑے اداروں نے میری موجودگی کا احساس کرنا شروع کر دیا تھا۔ کریسنٹ گروپ، ان 22 خاندانوں میں سے ایک تھا جس نے 1960ء کی دہائی میں پاکستانی معیشت کو اپنے قابو میں کیا ہوا تھا۔ کریسنٹ گروپ کو چلانے والے دو بھائی، محمد امین اور محمد بشیر اور ان کا بھتیجا سلیم الطاف تھے۔ یہ 22 خاندان، جن میں ایک فینسی گروپ بھی تھا، کو روئی اور اس کی مصنوعات کی برآمد،

بینکاری، انشورنس، گیس کی تقسیم اور معاشی زندگی کے ہر پہلو پر تسلط حاصل تھا۔ 1970ء کی دہائی کے اوائل میں بھٹو کی طرف سے قومیانے کی پالیسی نے انہیں تباہ کر دیا لیکن ان کی شہرت اور نام ابھی باقی ہے۔ یہ نظریہ کہ ''پاکستان کی معیشت پر اشرافیہ کے چند خاندان مسلط ہیں'' چنداں غلط بھی نہیں۔ اس لحاظ سے موجود رجحان کے تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ '40 خاندان' پر مشتمل تاثر، صحافیوں اور ادیبوں کے لیے مانوس حیثیت کا مالک ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں ان 22 خاندانوں سے نہیں تھا اور میرا تعلق ایک نہایت ہی عاجز اور منکسر گھرانے سے تھا۔ میں ان کے طبقہ میں سے نہیں تھا اور نہ ہی ان کے پُرکشش اور دلکش حلقے میں شامل تھا اور انہیں جو اثر اور سیاسی رسوخ حاصل تھا، اس سے بھی قطعی محروم تھا۔ میں متوسط طبقے کا ایک لڑکا تھا جو کامیابی کے لیے جدوجہد میں مصروف تھا۔ روئی کی برآمدی منڈی میرے لیے سونے کی کان ثابت ہوئی۔ روئی کی برآمد کے لیے پیشکشوں کا سلسلہ جاری رہا اور سال بہ سال ہم اپنی فروخت میں اضافہ کرتے گئے۔ چین، جاپان، پولینڈ، یوگوسلاویہ، چیکوسلواکیہ، سوویت یونین...... ٹیلکس مسلسل مصروف رہتی...... اور ٹیلیفون بجتا رہتا...... میں صبح آٹھ بجے سے رات گئے تک دفتر میں رہتا۔ شام کے اوقات میں، میں روئی کو بحری جہازوں میں چڑھاتے دیکھنے چلا جاتا۔ چھٹی کے دن میں اپنی سماجی زندگی کے تسلسل کو قائم رکھنے کی کوشش کرتا۔ یوں ایک دفعہ ایک اسماعیلی لڑکی سے میری ملاقات ہوئی، میرے خیال کے مطابق وہ ایک اچھی لڑکی تھی۔ دراصل میں اس پر فریفتہ ہو گیا تھا اور پھر میں نے اپنے والدین سے اس کا ہاتھ تھامنے کی اجازت چاہی۔ میری والدہ نے ''نہیں'' کہتے ہوئے مجھے حیران کر دیا۔ لڑکی کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو ہم سے کہیں زیادہ دولت مند تھی اور میری والدہ نے محسوس کیا کہ وہ ہمارے گھر میں رہنے کے قابل نہیں اور نہ ہی وہ ہمارے معیارِ زندگی سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔ جس دوٹوک لہجے میں میری والدہ نے اس بات کی وضاحت کی اس نے میرا دل توڑ دیا۔ والدہ نے کہا، ''شادی کرنا چاہتے ہو تو کرو لیکن میرے لیے اس کے ساتھ ہم آہنگی مشکل ہوگی۔'' ہمارے گھر میں والدہ کو مرکزی مقام اور حیثیت حاصل تھی اور اس توازن کو منتشر کرنے اور والدہ کی حکم عدولی کرنے کا کوئی

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ چند ماہ بعد اس لڑکی کی شادی کسی اور شخص کے ساتھ ہوگئی اور میں دل گرفتہ ہو کر رہ گیا۔ میری والدہ میرے پاس آئیں اور مجھ سے کہا کہ میں نے اپنے احساس کی شدت سے انہیں کیوں آگاہ نہیں کیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں نے ایسا کیا ہوتا تو وہ شادی کے لیے راضی ہو جاتیں۔ میں نے اپنے ہاتھ بلند کیے اور اللہ کی طرف دیکھا کیوں کہ اللہ تعالی کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔

1968ء میں میری والدہ انتہائی بیمار ہوگئیں۔ وہ گردے کے جان لیوا مرض میں مبتلا ہو چکی تھیں اور ان کا وزن پچاس فیصد کم ہو گیا۔ ہم بہت فکر مند تھے۔ ایک دن میری والدہ میری طرف متوجہ ہوئیں اور کہا، ''دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے میں تمہاری شادی دیکھنا چاہتی ہوں اور تم میرے آخری بیٹے ہو جس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔'' میرا فوری ردِعمل یہ تھا کہ ''اپنے مرضی کی لڑکی کا انتخاب کر لیجیے اور محض آپ کی خواہش کی تکمیل کی خاطر میں اسے دیکھے بغیر شادی کرلوں گا۔'' جزوی طور پر یہ ایک جذباتی ردعمل تھا کیوں کہ میں اپنی والدہ کی صحت اور سلامتی کے متعلق فکر منداور دعا گو بھی تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ان کی صحت بحال ہوگئی اور وہ کئی برس مزید زندہ رہیں۔ تاہم یہ میرے لیے جذباتی طور پر خوشگوار حیرت تھی کہ میری پسند کو مسترد کرنے کا صدمہ ابھی تک میری ماں کے دل سے محو نہیں ہوا تھا۔ ان برسوں میں جب میں نے اپنی تمام تر امیدوں، توانائیوں اور جذبات کو اپنے کام میں سمو دیا تھا، اس وقت میرے پاس سانس لینے کا بھی وقت نہیں تھا چہ جائیکہ میں اپنی شادی کے متعلق سوچوں۔ میری والدہ نے میری بہنوں اور عم زادوں سے مشورہ کیا، ان میں سے کچھ اس وقت تک بڑی ہو چکی تھیں۔ پھر والدہ محترمہ نے ایک ایسی لڑکی کے متعلق فیصلہ کیا جس سے میں کبھی ملا بھی نہ تھا۔ اس کا تعلق ایک اسماعیلی خاندان سے تھا اور میری والدہ نے اس کے متعلق ہر قسم کی معلومات حاصل کرنے کے بعد محسوس کیا کہ وہ ایک مثالی اور بہترین انتخاب ہے۔ جب وہ اپنی دس یا بارہ سہیلیوں میں موجود تھی تو اشارے کے ذریعے اس کو مجھے دکھا دیا گیا۔ میں نے یہ جانے بغیر کہ لڑکیوں کے ہجوم میں وہ کون تھی، اثبات میں سر ہلا دیا۔ بہر حال شادی کے بعد ہم ہنی مون کے لیے مصر چلے گئے، جہاں ہم نے اہرام مصر کے

علاوہ قاہرہ کے قابل دید مقامات بھی دیکھے۔ بعدازاں ہم پہلے پیرس اور پھر لندن گئے۔ یہ میرا پہلا غیر ملکی دورہ تھا۔ میری شادی میرے لیے بہت ہی سبق آموز تھی اور اس کے ذریعے مجھے کچھ ناخوشگوار اور تلخ سچائیوں کے متعلق علم ہوا۔ صاف بات یہ ہے کہ جلد ہی ہمارے درمیان مسائل اور اختلافات پیدا ہو گئے۔ ہم دونوں کے درمیان بہت زیادہ فرق تھا اور ہماری انفرادی تہذیبیں اور اقدار ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ اگرچہ ہمارے خاندانوں میں کچھ اقدار مشترک تھیں۔ ہمارے پانچ بچے ہوئے لیکن بالآخر 2011ء میں ہمارے درمیان طلاق ہوگئی۔ 1985ء میں میری والدہ نے مجھ سے نہایت بے تکلفانہ گفتگو کی اور انہوں نے اعتراف کیا کہ میری ناخوشگوار شادی کے متعلق وہ خود کو قصوروار سمجھتی ہیں۔ جس لڑکی کا انتخاب انہوں نے اپنے نزدیک اہم معیارات کو مدنظر رکھتے ہوئے انتہائی احتیاط سے کیا تھا، میرے لیے غلط ثابت ہوئے۔ جس لڑکی سے میں شادی کا خواہاں تھا، اسے اس بنیاد پر مسترد کر دیا گیا کہ میری بیوی اور اس گھر کی بہو کے لیے میری والدہ کے مقرر کردہ معیارات پر پورا نہیں اترتی۔ یوں قسمت نے ہمیں ایک گگلی سے کلین بولڈ کر دیا۔ 1985ء میں میری والدہ نے مجھ سے کہا، ''صدرو، مجھے معاف کر دو، میں نے غلطی کی۔ تم دوسری شادی کیوں نہیں کرتے تاکہ تمہیں ذہنی سکون ہو؟'' میں نے اس خیال کو دل میں جگہ نہ دی کیونکہ میرے پانچ بچے تھے جن کی مجھے پرورش کرنا اور اپنے کاروبار کو وسعت دینا تھا۔ ان حالات میں میرے لیے شادی یا ذاتی خوشیوں کا سوچنا محال تھا۔

باب 4

کپاس کا بادشاہ

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میری محنت رنگ لا رہی تھی۔ 1970ء میں سوویت یونین سے روئی کی ترسیل کی پیش کش موصول ہونے کے پانچ برس بعد، میں پاکستان میں کپاس کا نمبر 1 برآمدکنندہ بن گیا اور میری عرفیت ''کپاس کا بادشاہ'' بن چکی تھی۔ میں نے صرف پانچ برسوں میں اس صنعت کے مستند ناموں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا جن میں سے کچھ کا تعلق ''22 خاندانوں'' سے تھا اور وہ صدیوں سے ہی دولت مند تھے۔ اب ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ میری کامیابی کے باعث میرے حاسد پیدا نہ ہوں۔ 1970ء میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب کپاس کے مستقبل کے سودوں پر میں نے ایک طویل پوزیشن لے لی اور میں کپاس کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کے متعلق یقینی طور پر بتا سکتا تھا۔ میں کراچی کاٹن ایسوسی ایشن کے بہت تجربہ کار کمپنیوں کے لیے ناگوار خاطر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جنھوں نے میری روئی خریدنے سے انکار کر دیا تھا۔ میرے حریفوں نے مجھے ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا ایک موقع غنیمت جانا۔ یوں جب میں نے آئندہ تین ماہ کا ایک معاہدہ طے کیا، کراچی کاٹن ایسوسی ایشن کے سرکردہ ارکان نے ایک سازش کے ذریعے کپاس کے معاہدوں پر جمع کروانے والی رقم میں اضافہ کر دیا جس کا اطلاق ماضی سے ہونا تھا۔ اگر میں اضافی رقم ادا نہ کر سکتا، تو میں بہت بڑی رقم سے محروم ہو جاتا اور مستقبل کے معاہدوں کی تکمیل کرنے سے قاصر رہتا۔ میں ایک ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو گیا اور میں نے اس مراسلے کی قانونی حیثیت پر اعتراض کر دیا جس کی رُو سے ماضی سے جمع

کروائی رقم میں اضافہ کیا گیا تھا۔ میں عدالت عالیہ سندھ گیا لیکن یہ موسم گرما کی تعطیلات کے باعث بند تھی۔ تعطیلات کے اس عرصے کے دوران، مکمل عدالت کے بجائے ایک چھوٹا سا ''تعطیلی بنچ'' کام کر رہا تھا۔ اس 'بنچ' کا سربراہ ایک سینئر جج تھا جو کریسنٹ گروپ کے مالکان کے بہت قریب تھا جنہوں نے میرے خلاف اس سازش کا تانا بانا بُنا تھا۔ ایک غیر ہمدرد بلکہ متعصب جج کی موجودگی اور کپاس کے اجارہ داروں کی دولت کی طاقت کے باعث اکثر لوگ یہی محسوس کر رہے تھے کہ اب مجھے ڈوبنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس وقت کوئی سینئر یا دیوانی وکیل ایسا نہ تھا جو میرا مقدمہ لڑ سکتا۔ جب میرے پاس کوئی چارہ نہ رہا تو میں نے ایک مشہور فوجداری وکیل، حیات جونیجو سے اپنا مقدمہ لڑنے کی درخواست کی۔ ان کا مخالف وکیل، کاروباری اور تجارتی امور کا ایک مشہور وکیل، رام چندانی ڈنگومل تھا جس کی معاونت اس کا بیٹا پرسی کر رہا تھا۔ بظاہر یہ کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔

بہت جلد، میرا وکیل جو فوجداری امور کا ایک مستند وکیل تھا، تجارتی معاملات کے متعلق قوانین سے لاعلمی کے باعث دلائل دینے سے قاصر رہا اور پھر میں نے خود ہی اپنے مقدمے کے حوالے سے دلائل دیے۔ جج نے اس مراسلہ کو منسوخ کرنے یا اس کے متعلق حکم امتناعی جاری کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے میری درخواست سماعت کے لیے منظور کر لی اور باقاعدہ سماعت کا حکم جاری کیا، لیکن مجھے چوبیس گھنٹوں میں اضافی رقم جمع کروانی تھی۔ میں پریشانی کے عالم میں تھا۔ میرے پاس اس قدر رقم موجود نہ تھی اور اپنے اکاؤنٹ سے اضافی رقم نکلوانے کی حد ختم ہو چکی تھی۔ میں اپنے معمول کے بینکوں سے بھی اضافی رقم طلب نہیں کر سکتا تھا۔ رقم ادھار دینے والے نجی ادارے بھی مجھے رقم نہ دیتے کیوں کہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اب میرا راستہ بند ہو چکا ہے۔ میں نے ایک موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور بینک آف چائنا کی کراچی شاخ سے رابطہ کیا۔ بینک آف چائنا کی اس شاخ کا جنرل منیجر میرا آشنا سا تھا۔ نفیس طبع چینی، کے ایل سُنگ میری ساکھ سے واقف تھا۔ میں نے اپنی مشکل بیان کی۔ اس نے ایک کاغذ کا صفحہ نکالا...... ایک خالی کاغذ، نہ تو میری کمپنی کا لیٹر ہیڈ اور نہ ہی کمپنی کا نام، یا تفصیل یا کسی اور رسمی کارروائی کی ضرورت تھی۔ اس نے کہا، ''ابھی

درخواست لکھو۔'' پھر اس نے میری درخواست لی اور چلا گیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ کراچی کاٹن ایسوسی ایشن کے نام ایک پے آرڈر کے ساتھ واپس آ گیا۔ یہ ایک معجزہ تھا، مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بعدازاں، سُنگ میرا قریبی اور پیارا دوست بن گیا۔ پے آرڈر میرے پاس تھا اور میں بھاگم بھاگ کراچی کاٹن ایسوسی ایشن کے دفتر پہنچا۔ پہلی منزل پر میں دوڑتا ہوا کے سی اے کے چیئر مین قاسم منھا کے دفتر داخل ہوا۔ وہ نہایت بے ہودگی کے عالم میں مسکرایا اور میرا تمسخر اڑاتے ہوئے کہنے لگا، ''اب کہاں جاؤ گے؟'' میری عمر اس وقت اکتیس برس تھی اور میں غصے کا بھی ذرا تیز تھا۔ میں نے کہا، 'آپ ایک بوڑھے شخص ہیں، میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ اگر آپ میری عمر کے ہوتے تو میں آپ کو بالکونی سے باہر پھینک دیتا۔'' وہ رک گیا، ششدر رہ گیا اور قدرے خوفزدہ ہو گیا۔ میں نے پے آرڈر اس کے ہاتھوں میں ٹھونس دیا اور کہا، ''میں ابھی رقم جمع کرا رہا ہوں۔'' وہ دم بخود رہ گیا: ''تم...... تم...... نے رقم حاصل کر لی؟'' ...... ''ہاں!'' ...... میں نے پُرزور انداز میں کہا اور یکدم پلٹ گیا۔ پھر میں واپس مڑا اور چلا کر کہا ''اور میں رقم ابھی جمع کرا رہا ہوں۔'' پے آرڈر جمع کرانے کے بعد میں نے ترسیل کا مطالبہ کیا۔ اس سے مراد یہ تھی کہ جنہوں نے روئی خریدنے سے انکار کر دیا تھا، انہیں ہر قیمت پر روئی خریدنی تھی اور روئی کی ترسیل پر مبنی معاہدوں کی مجھے پیشکش کرنی تھی۔ یوں ایک بحران پیدا ہو گیا۔ کپاس کی منڈی تین دن بند رہی اور یوں معلوم ہونے لگا کہ جیسے کپاس کے بہت سے سینئر تاجر دیوالیہ ہونے کو تھے۔ تیسرے دن، ایک وفد میرے گھر آیا اور صلح کی درخواست کی۔ ہم ایک معاہدے پر متفق ہو گئے اور منڈی کھل گئی۔ یہ ایک فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ طاقت کے محور ہمیشہ کے لیے تبدیل ہو گئے اور کراچی کاٹن ایسوسی ایشن نے دوبارہ کبھی ایسا گندا کھیل نہیں کھیلا۔ اسی لیے کہتے ہیں، ''کتے بھونکتے رہتے ہیں اور قافلہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔''

اگلے سال 1971ء میں کچھ گھٹیا قسم کی مخلوق میدان میں آ گئی جن پر جنگی جنون سوار تھا۔ اس کا آغاز مشرقی پاکستان کے بحران اور پاکستان کے دو حصوں کے درمیان اقتدار کی تلخ اور خونی کشمکش سے ہوا۔ بھارت نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے بنگالیوں

کے دل میں علیحدگی کی آگ بھڑکائی حتیٰ کہ یہ کشمکش ایسی صورت حال پر منتج ہوئی جس نے بالآخر آج کے بنگلہ دیش کو جنم دیا، دسمبر 1971ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ بھارت کے پاس صرف ایک لنگڑا بہانہ تھا کہ اس نے ''مشرقی پاکستان میں مداخلت محض انسانی حقوق کی خاطر کی''...... حالانکہ یہ مغربی پاکستان پر بھارت کی کھلی جارحیت تھی۔ میں نے کراچی شہر کے ایک نہایت ہی اہم علاقے، کراچی کی بندرگاہ پر بھارتی بحریہ کو بمباری کرتے دیکھا۔ بھارتی فضائیہ کے جہازوں نے کراچی کو نشانہ بنایا۔ شہر میں بلیک آؤٹ کا سلسلہ شروع ہوگیا جس کے دوران ہم اپنے گھر میں اندھیرے میں بیٹھے رہتے۔ اس دوران مجھے بہت گھٹن محسوس ہوتی اور میں اکثر اپنی کار باہر نکالتا اور کچھ وقت کے لیے شہر کی سڑکوں پر گھومتا رہتا۔ میرے والدین مجھے روکنے کی کوشش کرتے لیکن میں بضد ہو جاتا۔ اب میں سیاہ پردوں اور موم بتیوں سے بیزار ہو گیا تھا۔ اب کوئی بھی حملہ آور مجھے اپنے ہی شہر میں گھر کے اندر محدود نہیں کر سکتا تھا۔ بھارتی ہوائی جہاز ہمارے سروں پر پرواز کرتے اور میں انہیں بم گراتے دیکھتا۔ شہر پر بہت زیادہ بمباری ہوئی۔ تیل کی تنصیبات کے علاوہ فوجی تنصیبات پر مسلسل حملے کیے گئے۔ ایک دفعہ سڑک کنارے میں چائے پینے کے لیے رک گیا۔ لوگ خاموش تھے کیونکہ کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ پاکستان کی معاشی بنیادوں کو کمزور کرنے کے لیے بھاری حملے اور دشنام طرازی مسلسل جاری تھی۔ اس صورتِ حال میں بھارت کی طرف سے بنگلہ دیش کی تخلیق کے ضمن میں دیکھا جائے تو اگر بھارت کو بنگلہ دیش سے ہمدردی تھی تو اس میں کراچی کا کیا قصور تھا؟

1971ء کی جنگ کا اختتام بہت سے ناخوشگوار نتائج پر ہوا۔ پاکستان اپنے علاقے سے محروم ہوگیا۔ سابق مشرقی پاکستان میں بہت سے لوگ قتل عام کا شکار ہو گئے اور بہت سے پناہ گزینوں کی حیثیت سے واپس مغربی پاکستان آ گئے۔ مشرقی پاکستان میں بنگالی بولنے والے اور بنگالی نہ بولنے والوں کے درمیان خونریزی کا سلسلہ بھارت کے ساتھ جنگ کے دوران اور بعد میں بھی جاری رہا۔ باوجود اس کے وہ تمام پاکستانی بھی تھے اور مسلمان بھی۔ اس باہمی قتل و غارت سے بہت زیادہ جانی نقصان ہوا۔ یہاں اس امر کا ذکر خالی از دلچسپی نہ

ہوگا کہ بنگلہ دیش کی تخلیق کے باوجود اسماعیلیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ انسان دوست سرگرمیوں کے باعث انہیں پذیرائی حاصل ہوئی تھی اور انہیں نہایت ہی محفوظ انداز اور آبرومندانہ انداز میں واپسی کا راستہ دیا گیا۔ میرے کہنے سے مراد یہ ہے کہ دولت نہیں بلکہ یہ کسی کا پُروقار رویہ اور طرزِ عمل ہی ہوتا ہے جس کے باعث اس کا احترام کیا جاتا ہے۔ جنگ اور اس کے بعد کے حالات اور اثرات نے میرے ذہن میں کئی ایسے سوال پیدا کردیے جن کے جواب ابھی تشنہ تھے۔ کیا اس کی کوئی اہمیت تھی؟ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ ہم اکٹھے رہتے، پاکستان متحد رہتا خواہ اس سے مراد یہ ہوتی کہ ہم پر ڈھاکہ سے حکومت کی جاتی اور بنگالی زبان بولنے والا ہمارا وزیراعظم ہوتا؟ ایک لحاظ سے ہم 1947ء کے واقعہ اور اس نامناسب عجلت کی قیمت ادا کررہے تھے اور ابھی تک کررہے ہیں جس کے ساتھ برطانویوں نے حدود کھینچیں اور یہاں سے رخصت ہوگئے۔ یوں انہوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں اور پاکستانیوں اور بھارتیوں کے درمیان باہمی نفرت کے بیج بودیے۔ انہوں نے کشمیر کو ایک نہ حل ہونے والا مسئلہ بنانے کے لیے حالات پیدا کردیے جس کے باعث چھ دہائیوں سے کشمیری بھارتی فوج کا ظلم برداشت کررہے ہیں۔

1971ء کی لڑائیوں اور دشمنیوں کا نتیجہ پاکستانی سیاست میں بھٹو دور کے آغاز کی صورت میں برآمد ہوا اور ہماری عوامی زندگی کے منظرنامے پر ذوالفقار علی بھٹو نمایاں انداز میں نمودار ہوئے۔ یہ انتہائی افراتفری، انتشار اور معاشی بحران کا دور تھا۔ 1973ء میں میری کمپنی، تیل کی صنعت کو پہنچنے والے دھچکے اور تیل کی قیمتوں میں ڈرامائی اضافے کے باعث ایک بھاری رقم سے محروم ہوگئی۔ اس صورت حال کے باعث اشیا کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ کپاس کے بہت سے کارخانے جنہوں نے مجھ سے روئی فراہم کرنے کے معاہدے کررکھے تھے، مقررہ نرخوں پر روئی فراہم نہ کرسکے۔ تیل کی صنعت کو پہنچنے والے دھچکے اور قیمتوں میں اضافہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے مجھ سے نرخوں میں اضافہ کا مطالبہ کیا۔ اس وقت مسئلہ یہ تھا کہ میں بھی بیرون ملک روئی کے خریداروں کو ایک مقررہ نرخوں پر روئی فراہم کرنے کا معاہدہ کرچکا تھا۔ کپاس کے کارخانوں کے مالکان کے برعکس

میں اپنے وعدوں سے پھرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے مراد یہ تھی اگر میری لاگت، اگر قیمت فروخت سے بھی زیادہ ہوتی تو بھی مجھے اپنے وعدے ایفا کرنے تھے۔ سوال یہ تھا کہ خسارے کو کیسے پورا کیا جائے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں ادائیگیوں کی ذمہ داری ہمیشہ بخوبی نبھائی تھی۔ یوں میں نے اپنی کچھ املاک فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس دفعہ بھی قسمت نے ایک خوشگوار موڑ لیا۔ ایک دفعہ میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک ملاقاتی مجھے ملنے آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ لوئیس ڈریفس گروپ (Louis Dreyfus Group) ایک فرانسیسی تجارتی ادارے کا نمائندہ ہے اور وہ نہایت ہی متکبر معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ چاول خریدنا چاہتا ہے اور اس ضمن میں ایک دفعہ ہی چاولوں کی انتہائی زیادہ مقدار 14,000 ٹن خریدنے کا خواہش مند ہے۔ میں نے اپنی کمپنی کے شعبہ اناج کے جنرل منیجر کو طلب کیا اور اس سے معلومات فراہم کرنے کے لیے کہا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم صرف مقامی منڈی ہی میں اناج کا کاروبار کرتے ہیں لیکن ابھی بیرونی منڈی میں داخل نہیں ہوئے۔ میں نے اسے کہا کہ ہم شام تک اپنی پیشکش سے اسے آگاہ کر دیں گے، نیز میں نے اسے رات کے کھانے پر مدعو کر لیا۔

ہم نے کلفٹن کے جدید میکسمز ریسٹورنٹ میں رات کا کھانا کھایا اور پھر میں نے اسے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل چھوڑ دیا جہاں وہ قیام پذیر تھا۔ جب وہ کار سے اتر رہا تھا تو اس نے مجھ سے قیمت کی بابت پوچھا۔ میں نے 135 ڈالر فی ٹن 'ایف او بی' کی پیش کش کی۔ ایف او بی، ''فریٹ آن بورڈ'' کا مخفف ہے جس سے مراد یہ ہے کرایہ خریدار ادا کرے گا۔ میں نے اسے سودا بازی کرنے کی لیے دس ڈالر فی ٹن کا منافع رکھا۔ اس نے نہایت اکھڑ پن سے کہا، ''تمہارا نرخ بہت زیادہ ہے، اور میں چاولوں کی یہی مقدار 10 ڈالر سستی خرید سکتا ہوں، لیکن مجھے یہ سودا منظور ہے، اس لیے نہیں کہ تم ہوشیار ہو بلکہ اس لیے کہ تم مال بروقت فراہم کرتے ہو۔ میں نے سنا ہے کہ تم وعدے کے پکے ہو۔'' اس وقت تک چاول بحری جہاز میں لادے جا چکے تھے اور اس وقت مجوزہ نرخ 160 ڈالر فی ٹن تھے لیکن میں یہ سودا کر چکا تھا اور اس میں تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کسی بھی صورت میں میری لاگت بہت ہی کم

ہوتی۔اس نے میرے دفتر آنے سے قبل ایک پکے کاروباری یہودی کے مانند ہر قسم کی تحقیق کرلی تھی۔جیسا کہ بعدازاں میں نے اپنے ایک دوست کو بتایا،''اسے میرا چہرہ نہیں بلکہ میری ساکھ پسند آئی تھی۔''

لوئیس ڈریفس کے ساتھ یہ ایک سودا میرے لیے انتہائی منافع بخش ثابت ہوا۔ اس سودے نے روئی کے کاروبار کے میرے نقصان پورا کرنے کے دروازے کھول دیے۔ جلد ہی میرے دروازے پر بین الاقوامی خریداروں کی قطاریں لگ گئیں جو چاول کی خریداری کے خواہشمند تھے۔اس دور میں پاکستان میں چاول وافر بلکہ فالتو پیدا ہوتے تھے کیوں کہ پاکستان کے جس حصے مشرقی پاکستان میں چاول زیادہ کھائے جاتے تھے،وہ ایک دوسرا ملک بن چکا تھا اور چاول کی منڈی کافی بڑی منڈی سے محروم ہوگئی تھی۔مشرقی پاکستان کے لیے مخصوص چاول برآمد کے لیے تیار پڑا تھا۔اس کاروبار میں صرف ہم ہی نہیں تھے بلکہ درحقیقت،ہم وہ آخری کمپنی تھے جو چاولوں کی برآمدی تجارت میں داخل ہوئی تھی۔قدرت خدا کی چند ہی ماہ میں،میں پاکستان میں چاول کا ایک سرکردہ برآمدکنندہ بن چکا تھا جو پاکستان میں پیدا ہونے والے دونوں قسم کے چاولوں ،سندھ میں پیدا ہونے والے معمولی قسم کے چاول اور پنجاب میں پیدا ہونے والے نفیس قسم کے چاول (باسمتی) کی تجارت کررہا تھا۔

اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد میں نے جو اور مکئی بھی برآمد کرنا شروع کردی۔میں نیویارک میں کانٹی نینٹل گرین کمپنی (اب کانٹی گروپ) سے منسلک ہوگیا اور پاکستان میں اس کے چاول کا خریدار اور ایجنٹ بن گیا۔میں نے کانٹی نینٹل کے چیف ایگزیکٹوز سے معاملات طے کیے اور یہ دونوں مصری نژاد یہودی تھے۔راپیل ٹوٹا اور میسرلز بونا،میرے اچھے دوست بن گئے۔1980ء کی دہائی میں جب میں لندن میں تھا،میرے سننے میں آیا کہ لز بونا،جو اس وقت تک ریٹائر ہونے کے بعد ریوڈی جنیرو (Rio de Janeiro) میں قیام پذیر ہوگیا تھا،اس دنیائے فانی سے کوچ کرگیا۔ اس نے کئی دفعہ مجھے چھٹیاں منانے کے لیے ریوڈی جنیرو میں مدعو کیا تھا لیکن مجھے وہاں جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا اور اب مجھے اپنے مہربان اور شفیق دوست کی تکفین کے لیے جانا تھا۔جن برسوں میں کانٹی نینٹل کے ساتھ میرا رابطہ رہا،

میں نے انہیں ہمیشہ پہلے سے طے شدہ یا معاہداتی نرخوں پر اناج فروخت کیا خواہ اس دوران منڈی کی قیمتوں میں ردوبدل بھی ہو جاتا۔ ایک سال انڈونیشیا اور تھائی لینڈ میں قحط پڑ گیا اور چاول کی قیمتیں مہینوں ہی میں دگنا ہو گئیں۔ بہت سے پاکستانی برآمد کنندگان دیوالیہ ہو گئے یا ان کے دیوالیہ ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا اور انہیں کہیں زیادہ رقوم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن میرے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس وقت کانٹی نینٹل کے ساتھ میرے پاس -/58,000 ٹن چاول کے معاہدات موجود تھے۔ میں 235 ڈالر فی ٹن چاول فروخت کرنے پر تیار ہو گیا تھا لیکن اس وقت مروجہ قیمت 450 ڈالر فی ٹن تھی۔ تقریباً 12 ملین ڈالر کا فرق ہی میرے لیے خوش قسمتی کا باعث تھا۔ ٹوٹا اور لزبونا اس زمانے میں کراچی آئے ہوئے تھے اور میں انہیں رات کے کھانے کے لیے باہر لے گیا تھا۔ لزبونا نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا، ''منڈی بہت چڑھ گئی ہے اور ممکن ہے کہ تمہیں لوگوں سے اس قدر چاول نہ مل سکیں جن کے لیے تم نے لوگوں سے کہا ہوا ہے۔ کیا ہمیں قیمت پر نظر ثانی کر لینی چاہیے؟'' میں انتہائی پریشان ہو گیا اور کہا، ''کیا میں نے کوئی شکایت کی ہے، میں تمہیں اپنے باپ کی طرح سمجھتا ہوں لیکن آج تم نے میرے دل کو ٹھیس پہنچائی ہے، تم نے مجھے وہ سب کہنے لیے کیسے سوچ لیا جو درست نہیں؟ میرا نفع ونقصان، میرا اپنا معاملہ ہے، میرے نزدیک وعدے کے سامنے رقم کی کوئی اہمیت نہیں، میں چاہتا ہوں کہ میں لوگوں سے آنکھیں ملا کر بات کر سکوں، یہی میرے لیے عظیم ترین انعام ہے۔'' یک دم دونوں سینئر اصحاب نے مجھ سے معافی طلب کی۔ میں نے کانٹی نینٹل کے ساتھ اپنا معاہدے کی تکمیل کی۔

اسی دوران بھٹو حکومت اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ وہ ایک اچھے مقرر تھے اور وہ شعوری خودقدری کا ایک مثالی نمونہ تھے لیکن عوامی خطابت ان میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انہوں نے کاروبار اور تجارت کو عوامی دشمن کی حیثیت سے دیکھنا شروع کیا۔ 1975ء میں، حکومت اور میرے درمیان اس وقت ایک مسئلہ پیدا ہو گیا جب انکم ٹیکس کے قوانین گزشتہ سال سے تبدیل کر دیے گئے اور پھر شماریاتی سال یکدم، 365 سے 557 دنوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کی کوئی توجیہ نہیں تھی۔ میں نے اس دور میں کپاس کی

منڈی میں خسارہ اٹھایا تھا اور چاول کی منڈی میں بہت منافع کمایا تھا۔ شماریاتی سال میں طوالت مجھے تباہ کرنے اور میرے ٹیکسوں میں اضافہ کرنے کی سازش تھی۔حسن علی اینڈ کمپنی جو کہ میری پہلی کمپنی تھی اسے انتہائی نقصان پہنچا اور شاید اس قسم کی عجیب وغریب، یکدم تبدیلی مبشر حسن کے ذہن کا نتیجہ تھی جو ایک انجینئر تھے۔انہیں نہایت ہی ناقابل فہم انداز میں بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کی کابینہ میں وزیر خزانہ مقرر کر دیا گیا تھا۔ایک دفعہ پھر میں یہ معاملہ عدالت میں لے گیا اور مقدمہ جیت گیا اور یہ آج تک قانونی کتب میں بطور مثال درج ہے۔ 557 دنوں پر مشتمل ایک شماریاتی سال پر تبصرہ کرتے ہوئے سپریم کورٹ پاکستان کے چیف جسٹس ،جسٹس یعقوب علی خان نے سرکاری وکیل ایس۔اے۔ نصرت پر براہ راست سوال کیے۔'' آپ یہ کیسے کر سکتے ہیں؟ کیا تاریخ عالم میں ایسا کبھی ہوا ہے؟'' میں اپنے ٹیکس اور آمدن میں دھوکے سے کام لے سکتا تھا اور اپنا کام نکالنے کے لیے انکم ٹیکس کو رشوت دے سکتا تھا۔شاید حکومت کی یہی خواہش تھی لیکن میں نے حکومت کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا۔اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ کامیابی نے میرے قدم چومے۔

جنگ ختم ہونے کے محض چند دن بعد دسمبر 1971ء میں بھٹو صدر بن گئے۔ اگست 1973ء میں انہوں نے نئے آئین کے تحت منتخب ہونے کے بعد وزیراعظم کا عہدہ سنبھال لیا۔وہ پہلے قومی رہنما تھے جن کے ساتھ میں نے عمداً ملنے سے احتراز کیا حالانکہ میری ان جرنیلوں سے شناسائی تھی جن کے سہارے بھٹو آگے آئے تھے اور ان کی پی پی میں بھی میرے دوست موجود تھے۔بھٹو سے نہ ملنے کی وجہ نہایت ہی سادہ تھی کیونکہ بھٹو اپنی رائے کو حرف آخر سمجھتے تھے۔انہیں پسند نہیں تھا کہ ان کے کہے کو زیر بحث لایا جائے اور اپنی رائے سے اختلاف ان سے قطعاً برداشت نہیں ہوتا تھا۔میں اس زمانے میں مسلسل اسی خیال میں گم رہتا کہ اگر بھٹو نے محسوس کر لیا کہ میں نے حد عبور کر لی ہے تو پھر وہ مجھے اپنے ناپسندیدہ افراد کی فہرست میں شامل کر لیں گے یا پھر مجھے بلیک لسٹ کر دیں گے۔میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر اپنے کاروبار میں مصروف تھا۔لاشعوری طور میں نے اس شخص پر اعتماد نہیں کیا جو سوشلزم کا دعویدار تھا اور جس کے متعلق مجھے علم تھا کہ بالآخر معاشی ترقی رک جائے گی اور

رشوت خور سرکاری ملازمین بااختیار ہو جائیں گے۔

1972ء تا 1974ء بھٹو نے قومیانے کی اندھا دھند مہم چلائی۔ انہوں نے سٹیل اور سیمنٹ کی صنعتوں، بینکوں، چاول اور کپاس کے کارخانوں کو قومی ملکیت میں لے لیا تھا۔ انہوں نے قومیانے کی اس پالیسی کی دس اقسام کے تحت 32 صنعتی کارخانوں کو قومی ملکیت میں لے لیا جن میں فولاد اور سٹیل سے لے کر بجلی پیدا کرنے والے کارخانوں، بجلی کی ترسیل سے لے کر آئل و گیس کی ریفائنریاں شامل تھیں۔ 1974ء کے اوائل میں کراچی میں سٹیٹ بینک کی عمارت میں نئے سال کے پہلے دن انہوں نے اہم بینکاروں اور انشورنس کمپنیوں کے سربراہان کو مدعو کیا اور انہیں یقین دلایا: ''میں آپ کے کاروبار کی ترقی اور پھیلاؤ کے لیے آپ کی مدد کروں گا۔'' وہ خوش ہو گئے۔ چند ہی گھنٹوں بعد انہوں نے ان کے بینکوں کو قومیانے کا اعلان کر دیا۔ بھٹو صاحب کو معیشت کی سمجھ ہی نہ تھی۔ حکومت کی طرف سے چاول چھڑنے، آٹا تیار کرنے، بناسپتی گھی اور تیل تیار کرنے اور روئی کے کارخانوں کی سرکاری تحویل میں لینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اس نے اپنے وفادار سرکاری ملازموں کے ذریعے صنعت و تجارت کو اپنے تسلط میں لانے کی کوشش کی، جو اس کام کے اہل نہ تھے۔ بھٹو نے یوں ظاہر کیا کہ جیسے امیروں کو سزا دینے کی خاطر وہ یہ سب کچھ غریبوں کے نام پر کر رہے ہیں۔ ان کے انوکھے وزیر خزانہ مبشر حسن نے کاروباریوں کو دولت کا تخلیق کار نہیں بلکہ ''کاروباری لٹیرے'' قرار دیا۔ بھٹو نے اپنے اس پالیسی سے بالآخر ملک کی ریڑھ کی ہڈی توڑ ڈالی۔ 1970ء کی دہائی میں اس تباہ کن پالیسی کی قیمت پاکستان ابھی تک ادا کر رہا ہے جو ملک اور اسلامی معاشرے کی اخلاقی اقدار سے بالکل متضاد تھی۔

سب سے مایوس کن بات یہ تھی کہ بھٹو نے تعلیمی نظام کا گلا گھونٹ کر اسے بے موت مار دیا تھا۔ ایک ''خوشگوار'' دن انہوں نے تعلیم کو بھی سرکاری تحویل میں لے لیا اور پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی، ان تمام سکولوں اور کالجوں کو بھی قومیا لیا جو بہ طریق احسن خدمات انجام دے رہے تھے۔ بھٹو کے اس اقدام نے ملک کے مستقبل اور اس کی آئندہ نسلوں کو داؤ پر لگا دیا۔ مغربی کتب کو تعلیمی اداروں سے ہٹا لیا گیا یا پھر ان کتب کو واپس مغرب بھجوا دیا گیا اور ان کی

جگہ مقامی کتب رائج کر دی گئیں جو عام طور پر نہایت ہی گھٹیا معیار کی تھیں۔ انہیں سکول کالج قائم کرنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ حیران کن طور پر یہ اقدام اس شخص کی طرف سے کیا گیا جس کے باپ نے اسے بہترین سکولوں میں تعلیم دلوائی اور پھر یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، برکلے اور پھر آکسفورڈ یونیورسٹی میں حصول علم کے لیے بھجوایا۔ ایک دن بھٹو اپنے ایک پرانے سینئر اور مشہور وکیل رام چندانی ڈنگومل کو ملنے گئے جس کی فرم (ڈنگومل کمپنی) سے بھٹو نے اپنی قانونی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ یہ داستان مجھے ڈنگومل کے بیٹے پری نے سنائی جو اس وقت ممبئی میں رہتا ہے۔ سینئر ڈنگومل نے کہا، ''زلفی! میرا مطلب ہے، تم نے تعلیم کو سرکاری تحویل میں لے لیا، کیوں؟'' بھٹو نے قہقہہ لگایا اور کہا، ''پریشان مت ہو، تمہارے اور میرے بچوں نے کون سا یہاں پاکستان میں تعلیم حاصل کرنا ہے، کیا وہ یہاں پڑھ رہے ہیں؟''

باب 5

ذوقِ میزبانی

1973ء میں کپاس اور چاول کی تجارت کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔ میں اس وقت ایک کاروباری دورے پر ٹورنٹو میں تھا جب مجھے میرے بھائی حسن علی نے فون کیا۔ وہ بہت پریشان معلوم ہورہے تھے اور میں فکرمند تھا کہ کہیں خاندان میں کوئی بری خبر میری منتظر نہ ہو۔ انہوں نے مجھے حکومت کی قومیانے کی اس پالیسی کے متعلق بتایا۔ یہ ہمارے لیے ایک دھچکا تھا لیکن میں نے ایک دم یہ محسوس کیا کہ حسن علی اور مجھ سے وہ لوگ مشکل میں ہوں گے جو ہمارے لیے کام کرتے تھے۔ وہ تو محض معمولی ملازمین تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں کپاس اور چاول کی تجارت کے علاوہ کچھ علم نہ تھا۔ اگر وہ بے روزگار ہوجاتے تو وہ سڑکوں پر آجاتے کیوں کہ انہیں کسی دوسرے کاروبار کی تربیت ہی نہیں تھی۔ بہرحال اس صورت حال میں جس قدر زیادہ کمپنیاں بھی سرکاری تحویل میں آجاتیں، معزز پیشہ ورانہ منیجروں اور کارکنوں کے لیے بیوروکریٹس سے ملازمت کی بھیک مانگنا آسان نہ ہوتا۔ ٹورنٹو سے جو سب سے پہلی چیز میں نے حسن علی کو بتائی، وہ یہ تھی کہ کسی بھی قیمت پر ہماری کمپنیوں سے ملازمین کو برطرف نہ کیا جائے اور ہر ایک ملازم کو ملازمت کے تحفظ کی یقین دہانی کرادی جائے۔ میں نے کہا، ''میرے آنے تک ہر ملازم کی تنخواہ کی ادائیگی یقینی بنائی جائے، ہر چیز معمول کے مطابق جاری رہنی چاہیے۔ مجھے واپس آنے دو، ہم نئے افق تلاش کریں گے۔''

مجھے کچھ کچھ علم تھا کہ یہ نئے مواقع کہاں کہاں موجود ہیں لیکن ہمارے کاروبار

سرکاری تحویل میں جانے کے بعد اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہنگامی طور پر کس آئیڈیا پر عمل کیا جائے۔ کچھ عرصہ سے میں ایک ہوٹل کے قیام کے متعلق غور وفکر کرتا رہا تھا۔ مجھے ادراک ہو گیا تھا کہ پاکستان میں ایک مستحکم تفریحی معیشت کے قیام اور زیادہ سے زیادہ سیاحوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے سازگار حالات موجود ہیں۔ اس ضمن میں اچھے ہوٹل درکار تھے۔ مجھے ہوٹلوں اور ان کے معمولات سے شناسائی تھی۔ میں تو امریکہ کے ڈسکو کلب کا بھی دورہ کر چکا تھا لیکن میرا یہ دورہ وہاں جنونی رقص کرنے کے بجائے اپنے تجسس کی تسکین تھی۔ مجھے کھانے کا بہت شوق تھا لیکن خاص طور پر جمعرات کی شام (جمعہ کا روز جو مسلمانوں کے لیے نماز اور آرام کا دن ہوتا ہے) اور ہفتہ (اتوار، روایتی طور پر ہفتہ وار تعطیل) کی شام کھانا کھانے کا اپنا ہی ایک مزہ اور لطف تھا۔ اس کے علاوہ میں ایک نئی شروعات، ایک نئے چیلنج سے نمٹنے اور ایک نئے کاروبار کے متعلق سیکھنے کے ضمن میں بہت پُر جوش تھا۔ اگرچہ کپاس اور چاول کا برآمدی کاروبار نہایت ہی منافع بخش اور سودمند تھا لیکن اب میں اس کاروبار سے اکتا چکا تھا اور میں اس کی ہر اونچ نیچ سے کماحقہ واقف ہو چکا تھا۔ مجھے ان کاروباروں کے متعلق ایسے علم تھا جیسے میں اپنے ہاتھ کی پشت سے بخوبی واقف تھا۔ ٹورنٹو سے واپسی پرواز پر میں نے ہوٹل کے قیام کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا اور کاغذات کے ان چند صفحات پر اپنے لیے اہم نکات لکھنے شروع کیے جنہیں میں نے خاتون فضائی میزبان سے لیا تھا۔

کراچی میں ایک سڑک کنارے میرے پاس پہلے ہی ایک قطعہ زمین موجود تھا جسے میں نے گزشتہ برس بڑی مشکل سے خریدا تھا۔ یہ شہر کے وسط میں واقع ایک نہایت ہی قیمتی اراضی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ ہوٹل کے لیے مناسب رہے گی۔ تومیانے کی اندھا دھند مہم کے بعد اس دور میں بہت سے اہم اور بڑے کاروباری افراد نے پاکستان کو خدا حافظ کہہ دیا، اپنے اثاثے فروخت کر دیے یا تو کاروبار سے تائب ہو گئے یا پھر مکمل طور پر ملک ہی چھوڑ گئے۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا، یہ میرا ملک تھا اور مجھے یہیں رہنا تھا بلکہ میں نے اچھے حالات کی امید پر پاکستان میں مزید سرمایہ کاری شروع کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے صدر میں سڑک کنارے اس قطعہ زمین کے علاوہ دیگر اثاثہ جات خریدے تھے۔ ان اثاثہ

جات میں فینسی فیملی سے خریدی گئیں املاک بھی شامل تھیں۔فینسی خاندان کے سٹیل کے کارخانے کے علاوہ کراچی گیس کو بھی سرکاری تحویل میں لے لیا گیا جو ان کے زیرِ انتظام تھا۔ حکومت نے کامرس بینک اور نیو جوبلی انشورنس کمپنی کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا جس کی ملکیت بھی فینسی خاندان کے پاس تھی۔ اب فینسی خاندان بھی لڑکھڑانے لگا تھا۔ سندھ میں کوئٹہ ٹیکسٹائل مل کو قومی تحویل میں نہیں لیا گیا تھا لیکن اب وہ اس کے علاوہ دیگر کمپنیوں میں اپنے چھوٹے چھوٹے حصص اور اپنی جائیداد کے کچھ حصے بھی فروخت کرنے کا سوچ رہے تھے۔

یہ واقعات فینسی فیملی کے زوال کا پیش خیمہ بنے اور میرے لیے بہت سی تلخ اور شیریں یادیں چھوڑ گئے۔ میں اس فیملی کو بہت حوالوں سے جانتا تھا۔ میں نے ان کے ساتھ کام بھی کیا تھا اور ان سے اختلافِ رائے بھی رکھتا تھا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنے علیحدہ کام کا آغاز سٹیل کارپوریشن آف پاکستان سے کیا تھا جو فینسی فیملی کی ملکیت تھی اور میں اس کمپنی کی بنائی ہوئی سٹیل کی پتریاں (Bailing Hoops) فروخت کرتا تھا۔ اُس وقت میری ملاقات اس فیملی کے سربراہ عامر فینسی کے بیٹے شوکت فینسی سے ہوتی تھی۔ شوکت فینسی کا نام بہت سی یادوں کو جگا دیتا ہے۔ چوں کہ وہ سیلز ڈپارٹمنٹ کا انچارج تھا اس لیے ہر ڈیلیوری آرڈر پر اُس نے دستخط کرنے ہوتے تھے۔ مجھے اکثر اُس کے دفتر کے باہر ایک یا دو گھنٹے انتظار کرنا پڑتا۔ ظاہر ہے اس وقت سماجی حیثیت میں فرق واضح تھا۔

کاروبار کے سلسلے میں ہونے والی ملاقاتوں کے دوران شوکت فینسی کو میرے کھیل سے شناسائی ہوئی اور پتا چلا کہ میں آغا خان جمخانہ کا باقاعدہ ممبر ہوں۔ یہ کراچی کے مرکز میں موجود ایک تاریخی عمارت میں واقع ایک بہت مشہور کلب تھا۔ اس کے زیادہ تر ممبران، جن میں سے بہت سے میرے دوست تھے، تفریح کے لیے کھیلتے اور لطف اٹھاتے۔ شوکت فینسی نے مجھے کہا کہ میں اس کلب کی ممبر شپ حاصل کرنے اور وہاں کچھ دوست بنانے میں اُس کی مدد کروں۔ میں نے بہت خوشی سے ایسا کیا۔ چند ماہ بعد اُس نے کہا کہ وہ اور اُس کے چند ایک دوست جمخانہ کی مینیجنگ کمیٹی میں خدمات سرانجام دینا چاہتے ہیں۔ میں نے کلب کی انتظامیہ سے بات کی تو اُنھوں نے اس پر تحفظات ظاہر کیے کہ کھلاڑیوں پر مشتمل سادہ سی کمیٹی

میں بزنس ٹائیکونز اور دولت مند بینکاروں کی کیا ضرورت ہے؟ تاہم میں نے ایک بار پھر اپنی مہارت استعمال کرتے ہوئے اُنہیں قائل کیا کہ شہر کے متمول ترین اشرافیہ کو مینیجنگ کمیٹی میں شامل کرنا کسی طور پر بھی نقصان دہ نہیں ہوگا۔ آنے والے دنوں میں شوکت فینسی جمخانہ کلب کے سیکریٹری جبکہ ان کے کچھ دوست مینیجنگ کمیٹی کا حصہ بن گئے۔

ایک سال گزر گیا۔ ایک دن شوکت فینسی مجھے ملا اور کہا وہ شوکت مکلائی (Shaukat Macklai) کو جمخانہ کے صدر کے عہدے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ اس پر میں ہکا بکا رہ گیا۔ شوکت مکلائی ایک بہت عمدہ اور زندہ دل انسان تھے اور پھر حال ہی میں انہیں ذاتی صدمے سے دوچار ہونا پڑا تھا جب ان کی بیوی قاہرہ میں ایک ہوائی جہاز کے حادثے میں جاں بحق ہوگئی۔ خوش قسمتی سے وہ اُس حادثے میں بچ گئے تھے لیکن زخمی ہونے کی وجہ سے لنگڑا کے چلتے تھے۔ اس وقت اُنہیں جمخانہ کی صدارت سے محروم کرنا سنگدلی دکھائی دیتی تھی، تاہم میں نے وعدہ کیا کہ اس پر ایک رات غور کرنے کے بعد اگلے دن ملوں گا۔ اس دوران میں نے کچھ اور دوستوں سے بھی اس موضوع پر بات کی اور وہ بھی سخت حیران ہوئے۔ اگلے دن میں شوکت فینسی سے ملا اور اہم ترین سوال پوچھا کہ اس کا کردار کیا ہوگا۔ اُس نے فوراً جواب دیا، ''میں کلب کا سیکریٹری ہی رہوں گا، میرا کزن عبدل صدر بنے گا۔''

اب کھیل واضح تھا، فینسی فیملی جمخانہ پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اس منصوبے کی حمایت نہیں کرسکتا۔ اُس نے مجھے ترغیبات دیتے ہوئے کہا، ''ہمارا مشرقی پاکستان میں کاروبار ہے اور ہم وہاں پٹ سن کی ملوں کو سٹیل کی پتریاں (Bailing Hoops) فراہم کرتے ہیں۔ میں تمہیں وہاں اپنا سیلز ایجنٹ بنا دوں گا اور کچھ مالی تعاون بھی کروں گا۔'' یہ ترغیب مجھ پر بے اثر رہی تو اُس نے کہنا شروع کردیا کہ اُس کا باپ کراچی اور اسماعیلی برادری کا طاقتور ترین شخص ہے لیکن میں نے اُس پر واضح کردیا کہ میں اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرسکتا۔ اس شوکت فینسی نے غصے سے میز پر مکہ مارتے ہوئے کہا، ''میں تم سے درخواست نہیں کررہا، حکم دے رہا ہوں....'' میں نے کچھ دیر سکوت کیا اور پھر کھڑا ہوگیا اور محتاط سے الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے کہا، ''میں کوئی بکاؤ مال نہیں'' اور چل دیا۔ جاتے ہوئے

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا، ''الیکشن والے دن میں تمہیں دیکھ لوں گا۔'' جب میں وہاں سے جا رہا تھا تو مجھے معلوم تھا کہ میرا فینسی فیملی سے کاروباری تعلق اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے۔

اس دوران جمخانہ کے الیکشن جیتنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ میں نے اس حصہ لینے کے لیے اپنے دوستوں کو تیار کیا۔ ہم نے ووٹروں کی فہرست کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ کچھ ممبران کے ووٹ ہمارے حق میں ہو سکتے تھے لیکن ان کی کلب کی فیس ادا نہیں کی گئی تھی، اس لیے وہ ووٹ کاسٹ کرنے کے حق دار نہ تھے۔ میں نے اپنی جیب سے اُن کی فیس ادا کرتے ہوئے اس بات کو یقینی بنایا کہ وہ ووٹ کاسٹ کریں۔ دوسری طرف فینسی فیملی بھی انتخابات جیتنے کے لیے اپنے وسائل استعمال کرتے ہوئے ناقابل تصور لابنگ کر رہی تھی۔ وہ حمایت حاصل کرنے کے لیے بہت پُر تکلف پارٹیاں دے رہے تھے۔ دولت کا اس طرح بے دریغ استعمال دیکھ کر بعض اوقات میں اور میرے دوست سوچتے کہ ہمارے جمخانہ کا کیا بننے والا ہے؟ کیا یہ دولت منداور نامی گرامی فراد کے ہاتھوں ایک کھلونا بننے جا رہا ہے؟ میں اُس وقت خوش ہو گیا جب ایک دوست نے کہا، ''میرا ووٹ تو تمہارے حق میں ہی ہے لیکن مجھے پارٹیوں کا مزہ تو لینے دو۔'' جب الیکشن کا مرحلہ قریب آیا تو میرا اعتماد بڑھ چکا تھا۔

جب ووٹوں کی گنتی ہوئی تو فینسی فیملی تمام عہدوں پر ہار چکی تھی۔ اُنہیں بہت بری طرح شکست ہوئی تھی۔ جب شکست خوردہ شوکت فینسی اپنی لیموزین (Limousine) میں بیٹھا تو میں بھی اپنے سائیکل پر سوار ہو چکا تھا۔ میرا ایک دوست، جو گزشتہ واقعات پر برہم تھا، آگے بڑھا اور شوکت فینسی کو گریبان سے پکڑ لیا۔ میں نے مداخلت کرتے ہوئے اُسے روکا اور کہا، ''اپنے ہاتھ گندے نہ کرو۔'' پھر میں نے شوکت فینسی کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا، ''شوکت، ہم عام لوگ ہیں لیکن ہمارا کردار مضبوط ہے...'' شوکت تیزی سے وہاں سے چل دیا۔ یہ اُس کے جمخانہ کے ساتھ تعلقات کا اختتام تھا۔

بہرحال جمخانہ ایک طرف، اب میرا ایک بدترین دشمن پیدا ہو چکا تھا۔ فینسی فیملی کی طرف سے انتقامی کارروائی میری بیٹی نادیہ کی پیدائش سے ایک ماہ قبل 1968ء میں سامنے آئی۔ ایک دن میں نیشنل بینک آف پاکستان کے جی ایم ظفر منہاس سے ملاقات کر رہا تھا کہ

مجھے فون کال آئی۔ مجھے اطلاع ملی کہ میرے ایک کپاس کے گودام میں آگ لگ گئی ہے...
اُس وقت تک میں کپاس کی تجارت میں قدم رکھ چکا تھا۔ میں تیزی سے گودام میں پہنچا، دوپہر کا وقت تھا اور کپاس کی گانٹھیں جل رہی تھیں۔ فائر بریگیڈ آنے تک میں کوشش کر رہا تھا کہ وہ گانٹھیں جو آگ سے محفوظ ہیں، اُنہیں جلنے سے بچانے کے لیے وہاں سے ہٹا دیا جائے۔ اس حادثے میں یوگوسلاویہ بھجوائی جانے والی چار ہزار گانٹھوں کو نقصان پہنچا۔ میں نے جوبلی انشونس کمپنی میں 2.8 ملین روپے کا کلیم کر دیا۔ نیو جوبلی انشورنس فینسی فیملی کی ملکیت تھی اور اس کا مینیجر محمود سبزالی، فینسی فیملی کا وفادار تھا۔

آگ لگنا بدقسمتی تھی اور کاروبار میں ایسا ہوتا ہے۔ میں اپنی عادت کے مطابق اسے بھول کر آگے بڑھ گیا۔ چند ہفتوں بعد مارشل لاء ٹریبونل، جسے مقامی ملٹری ایڈمن لفٹیننٹ جنرل ریاض حسین نے قائم کیا تھا، نے مجھے آگ لگنے کی تحقیقات کے سلسلے میں طلب کر لیا۔ فوج کے تینوں شعبوں سے تعلق رکھنے والے تین افسران نے، جن کا تجارت اور کامرس سے کوئی تعلق نہ تھا، مجھ سے تفتیش کرتے ہوئے احمقانہ سوالات کرنا شروع کر دیے۔ وہ شروع سے ہی مجھ پر انشورنس فراڈ کا کیس دائر کرنے کی کوشش میں تھے۔ اس پر احتجاج کرتے ہوئے میں نے واقعے کا اپنا موقف بیان کیا لیکن وہ قائل نہ ہوئے۔ ایک شام چھے بجے ٹریبونل نے گرفتاری کے لیے میرے گھر پولیس بھیج دی۔ یہاں سے ایک اور کڑی آزمائش کا آغاز تھا۔ مجھے چالیس دن تک کراچی کے حاجی کیمپ میں قیدِ تنہائی میں رکھا گیا۔ اُس وقت میری بیوی حاملہ تھی اور اُسے اور میرے والدین کے سوا کسی کو مجھ سے ملنے کی اجازت نہ تھی، اور وہ بھی ہفتے میں صرف ایک گھنٹے کے لیے مل سکتے تھے۔کیمپ میں مہیا کیا جانے والا کھانا کھانے کا قابل نہ تھا، چنانچہ میری صحت بگڑ گئی۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ میری حاملہ بیوی اور میرے بوڑھے والدین بہت کوشش کرتے ہوئے مجھ سے ملنے آتے تھے۔ میرے والدین سادہ سے افراد تھے اور وہ مجھ سے مجرموں کا سا سلوک ہوتے دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتے۔

ٹریبونل نے مجھ سے تفتیش جاری رکھی اور پوچھا کہ میں گودام میں کیوں گیا تھا، کتنی

گانٹھیں آگ سے بچا پایا، وغیرہ؟ ایسی ہی مزید تفتیش سے حاصل ہونے والی معلومات اور اعداد و شمار کی روشنی میں ابتدائی پروویژنل انشورنس کلیم کو چیلنج کیا گیا اور آخر کار طے پایا کہ ابتدائی کلیم میں مبالغہ تھا۔ اس طرح کلیم کی اصل رقم اٹھائیس ہزار بنا دی گئی جو پروویژنل کلیم کا ایک فیصد تھی۔ چونکہ فراڈ کے الزامات کا ثبوت نہ مل سکا، اس لیے مجھے رہا کر دیا گیا۔ بعد میں علم ہوا کہ اس نام نہاد تفتیش کے پیچھے فینسی فیملی کا ہاتھ تھا۔

زندگی کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ لگائیں کہ جب بھٹو نے کمپنیاں اور صنعتیں قومیانے کی مہم کا آغاز کیا اور فینسی فیملی نے گھبراہٹ کے عالم میں اپنی کمپنیاں فروخت کرنا شروع کیں تو میں نے ان میں سے جن کے شیئر خریدے اُن میں جوبلی انشورنس بھی شامل تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ فینسی فیملی جو کبھی میرے لیے بے حد طاقت ور تھی، اس کا باب ختم ہوا۔ کچھ اور لوگ بھی، جن کے کاروبار کو بھٹو حکومت نے قومی تحویل میں لے لیا تھا، اپنے باقی ماندہ اثاثے فروخت کرنے کے لیے بیتاب تھے۔ اُس کساد بازاری اور مایوسی کے دور میں بہت کم خریدار باقی رہ گئے تھے۔ میں چونکہ کپاس کے سودوں میں بھی مستقبل کی قیمت طے کر کے رسک لینے کا عادی تھا، اس لیے میں نے بہت سے اثاثے خرید لیے۔ جلد ہی میں کراچی میں ایک سینما ہاؤس، ایک ٹیکسٹائل مل اور بہت سے قطعاتِ اراضی کا مالک بن گیا۔

جس خریداری نے مجھے فوری طور پر متوجہ کیا، وہ صدر کے علاقہ میں سڑک کنارے ایک قطعہ زمین تھا۔ مجھے ہوٹل کی تعمیر کے لیے اجازت درکار تھی۔ بھٹو حکومت نے ایک عجیب و غریب شرط عائد کر دی تھی۔ اس وقت اسلام آباد میں کوئی شاندار اور نفیس ہوٹل موجود نہ تھا جو اس وقت پاکستان کے دارالحکومت کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔ حکومت مجھے کراچی میں ہوٹل کی تعمیر کی اس شرط پر اجازت دیتی کہ میں اسلام آباد میں بھی ایک ہوٹل تعمیر کرتا جس کے لیے مجھے بہت زیادہ سرمایہ درکار تھا۔ اس شرط کے باعث درکار سرمائے کی ضرورت دگنی ہو جاتی۔ حکومتی بیوروکریٹس کے علاوہ دیگر رکاوٹیں بھی موجود تھیں۔ میرا ذہن صاف تھا کہ میں ہوٹل کے کاروبار میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہم پانچ ستارہ ہوٹل کے متعلق بات کر رہے تھے۔ میں ہوٹلوں کی ایک بین الاقوامی کمپنی کا ایک ہوٹل خریدنے اور اس کے تجربے سے

فائدہ اٹھانے کے لیے تیار تھا لیکن میں اپنے ہوٹل کی انتظامیہ، غیر ملکی ہوٹل کمپنی کے حوالے کرنے کے لیے اور منافع کا ایک خفیف حصہ موصول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ میں صنعت میزبانی میں داخل ہونے کے لیے اس لیے مشتاق نہیں تھا کہ میں محض عمارت کا کرایہ وصول کروں۔ چوں کہ پاکستان اور اس کے اہم تجارتی شہر کراچی میں بڑے ہوٹلوں کی کمی تھی، اس لیے دیگر کاروباری اداروں نے بھی ہوٹلنگ کے منصوبے شروع کر دیے تھے۔ وہ محض بڑی بڑی غیر ملکی ہوٹلنگ کمپنیوں کے ہوٹلوں کے انتظامی معاہدات پر دستخط کرنے پر اکتفا کیے ہوئے تھے۔ شیرٹن ہوٹل نے گانجی خاندان کے ہوٹلنگ منصوبے کے لیے معاہدے پر دستخط کیے۔ حیات ریجنسی نے دارسی منوالا کے ساتھ اشتراک عمل کر لیا، ہلٹن نے ڈنشا آواری اور اس کی کمپنی کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ میں ابھی تک کسی مناسب بین الاقوامی ہوٹلنگ کمپنی کے ساتھ شراکت داری کے علاوہ اپنے آئندہ ہوٹلوں کے لیے ایک متحرک اور ایماندار چیف ایگزیکٹو کی تلاش میں بھی تھا۔ یہ میرے لیے وہ اہم شخص ہوتا جو میرے ہوٹلنگ منصوبوں کی تعمیر اور انہیں عملی جامہ پہنانے کے لیے میرے ساتھ کام کرتا۔

میں نے مرحوم ایس ایم اسلم کی صورت میں ایک موزوں شخص تلاش کر لیا۔ وہ ایک انجینئر تھا جو فینسی گروپ کے لیے کام کرتا تھا لیکن اس گروپ کی سرکاری تحویل میں چلے جانے کے بعد جب فینسی کمپنیاں دباؤ میں آ گئیں تو اسلم ملازمت کے نئے مواقع تلاش کرنے لگا۔ اس نے ہوٹلوں کی تعمیر کی شکل میں میری مدد کرنے کے مشکل کام میں ہاتھ بٹانے میں اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ چوں کہ وہ کراچی میں ایک نئے ہوٹل کی تعمیر کے ضمن میں میری صلاحیتوں، تجربے اور قابل عمل حیثیت کے متعلق بے یقینی کا شکار تھا، اس لیے اس نے بہت سی انتہائی کڑی شرائط طے کیں اور انہیں سٹامپ پیپر پر ٹائپ کر کے میرے حوالے کر دیا تاکہ میں پڑھ کر اپنی طرف سے کچھ کہہ سکوں۔ لیکن اس وقت وہ شدید حیرت میں مبتلا ہو گیا اور ششدر رہ گیا جب میں نے ایک لمحہ توقف کیے اور پڑھے بغیر اس کاغذ پر دستخط کر کے اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے حیرانی کے عالم میں استفسار کیا، ”لیکن آپ نے اسے پڑھا تک نہیں۔“ میں نے کہا، ”میں نے اپنا ایک بہت بڑا منصوبہ عملی جامہ پہنانے کے لیے تمہارے

حوالے کیا ہے اور میں تم پر مکمل بھروسا کر رہا ہوں ۔ مجھے اس کے مندرجات پڑھنے کی ضرورت نہیں ۔'' اسلم بہت متاثر ہوا۔ ایک سخت جان، صاف گو پیشہ ور شخص جس نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا۔ پھر ہم دونوں اکٹھے ایک بین الاقوامی شراکت دار تلاش کرنے لگے۔ 1974ء میں، میں نے ہالیڈے اِن کو ان کا ایک ہوٹل حاصل کرنے کے لیے خط لکھا اور اور ہمیں ہالیڈے اِن کے ریجنل دفتر، واقع، ہانگ کانگ میں مدعو کرلیا گیا۔ ریجنل سربراہ ایک خوش مزاج لیکن صاف گو جرمن، رُوڈی کوپن (Rudi Koppen) تھا۔ ملاقات کے آغاز ہی میں، میں نے اسے کہا کہ میں پاکستان بھر میں ہالیڈے اِن کے ہوٹل کھولنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا: ''تم تو ایک ہی ہوٹل تعمیر کر رہے ہو اور تم ملک بھر میں ہوٹل کھولنے کے حقوق حاصل کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ ''میرے پاس ترقی کے منصوبے ہیں اور اس کے علاوہ میں اسلام آباد میں بھی ہوٹل تعمیر کر رہا ہوں۔'' یوں وہ اسلام آباد اور کراچی میں دو ہوٹل کھولنے کے لیے رضا مند ہو گیا اور ساتھ ہی مجھ سے وعدہ بھی لیا کہ میں پاکستان کے دیگر حصوں میں بھی ہوٹل کھولوں گا۔

چوں کہ میرے لیے ہوٹلنگ کا کاروبار نیا تھا، اس لیے میں نے ہالیڈے اِن کے تصور کا جائزہ لینے اور اسے سمجھنے کے علاوہ دنیا بھر کے مختلف شہروں میں قائم ہوٹلوں کا دورہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ان دنوں ہم ہانگ کانگ میں تھے، اس لیے مقامی ہالیڈے اِن کے ماہر تعمیرات سے ملاقات چاہی۔ جیکسن وانگ اور اس کی فرم، وانگ یونگ ایسوسی ایٹس نے ہانگ کانگ اور سنگاپور میں ہالیڈے اِن ہوٹلوں کا نقشہ تیار کیا اور تعمیر بھی کیے۔ اتفاق یہ ہوا کہ ہانگ کانگ ہوٹل کا مالک ہاری لیلہ (Hari Leela) ایک سندھی تھا جس کا تعلق کراچی سے تھا اور وہ 1950ء کی دہائی میں ہانگ کانگ چلا آیا تھا۔ ہم نے اس سے ملاقات کی اور اس نے مجھے یہ پیشکش کی: ''میرے ساتھ اشتراک عمل کرلو اور ہانگ کانگ کے علاوہ جنوب مشرقی ایشیا میں ہوٹل تعمیر کریں اور چلائیں۔'' یہ ایک پُرکشش پیشکش تھی کیوں کہ ایشیا پیسیفک کی معیشتوں کی ابھی ابتدا تھی جن میں جلد ہی استحکام پیدا ہو جانا تھا۔ بہر حال مجھے اس منصوبے سے دلچسپی نہیں تھی بلکہ مجھے تمنا یہ تھی کہ میں پاکستان میں معیاری ہوٹل تعمیر کروں۔

ہاری لیلہ میرے جذبات سمجھتا تھا اوراس نے میری خوش قسمتی کی دعا کی۔ اس نے ہوٹلنگ کے کاروبار کے متعلق مجھے قیمتی مشورے دیے اور میرے شکوک دور کردیے۔ وانگ ینگ ایسوسی ایٹس کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد، اسلم اور میں وہیں ٹھہر گئے اور سنگاپور کے ہالیڈے اِن کا جائزہ لیا اور مطالعہ کیا۔ یہ ہوٹل، اورچرڈ روڈ پر واقع تھا جو شہر کا ایک مرکز خریداری اور تفریحی مقام تھا۔ اگر چہ 1974ء میں سنگاپور ابھی تک ایک چھوٹا شہر تھا اور آج کے مانند شاندار شہر نہیں تھا۔ بلاشبہ، یہ شہر جنوب مشرقی پیسیفک کے اپنے ہم عصر شہروں سے کہیں آگے تھا کیوں کہ اس کے قائد، عزت مآب لی کوان یو (Lee Kuan Yew) کی طرف سے کی گئی سماجی اور معاشی تبدیلیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

ہوٹل اوراس کی تعمیر کے متعلق حتمی فیصلہ کرنے کے بعد میں ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی آ گیا اور رُوڈی کوپن اور جیکسن وانگ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ ہم انہیں ہوٹل کی مجوزہ جگہ پر لے گئے اور تقریباً یک دم ہی وانگ نے کہا کہ یہ جگہ اس کے تصور کے لحاظ سے بہت چھوٹی ہے۔ اب ہمیں ایک متبادل جگہ کی تلاش تھی۔ پھر ہم اسلام آباد چلے گئے جہاں میں نے ہوٹل کی تعمیر کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ یہاں حکومت نے مجھے قطعہ زمین کے انتخاب کی آزادی دی ہوئی تھی۔ اسلام آباد ایک نیا شہر تھا جو وسیع میدانوں اور جنگلوں کے درمیان میں سے ابھر رہا تھا۔ یہ کراچی کے مانند نامیاتی طور پر بنا شہر نہیں تھا جہاں اس کے گنجان آباد ترین حصوں میں چند ہی علاقے ایسے تھے جہاں گہما گہمی نہ تھی۔ 1970ء کی دہائی میں اسلام آباد میں زمین وافر مقدار میں دستیاب تھی۔ خوش قسمتی سے ہمیں ایک شاندار قطعہ زمین مل گیا جس کے سامنے مارگلہ کی پہاڑیوں کا سرسبز نظارہ آنکھوں کو تسکین مہیا کرتا تھا جو اسلام آباد کے عین شمال میں واقع تھیں۔ اس سے بہتر جگہ ہو ہی نہیں سکتی تھی اور ہم سب بہت خوش تھے۔ کراچی میں بھی، میں نے حکومت سے ہوٹل کے اپنے منصوبے کے لیے کچھ زمین فروخت کرنے کے لیے کہا۔ ایک دفعہ پھر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں شامل حال ہوئیں اور مجھے ایک کافی بڑا قطعہ زمین مل گیا جو امریکی سفارت خانے کے قریب تھا اور اس کے عقب میں فریئر ہال گارڈن تھا (اب باغ جناح جو ۱۱ ایکڑ پر مشتمل کراچی کا ایک نمایاں مقام تھا)۔ کراچی اور اسلام آباد میں دونوں

قطعہ ہائے اراضی کا رقبہ 1800 ایکڑ تھا اوران قسم کے ہوٹلوں کے لیے موزوں تھا جن کا ہم نے تصور کیا ہوا تھا۔ دونوں منصوبے بیک وقت شروع ہوئے۔ اگر چہ یہ دونوں ایک ساتھ ہی تعمیر ہوئے مگر دونوں ہوٹلوں کا نقشہ، بنیادی مرکزی خیال اور اندازِ تعمیر بالکل مختلف تھا۔ ان دونوں کے ایک درمیان ایک چیز مشترک تھی کہ ان دونوں کی تعمیر دو مرحلوں میں پایہ تکمیل تک پہنچنی تھی۔ میری ایک شرط یہ تھی کہ جب ہوٹلوں میں توسیع ہوگی، جیسا کہ روایت ہے، دونوں مراحل علیحدہ علیحدہ نہیں ہوں گے بلکہ ایک دوسرے میں ضم کر دیے جائیں گے اور ایک ہی عمارت کے مانند نظر آئیں گے۔ ہوٹلوں کے وہ منصوبے جو اس دور میں شروع ہوئے، ان میں صرف ہمارے ہی تھے جو تعمیر ہو سکے۔ اس کے باوجود ہم نے سخت محنت کی اور خاص طور پر اسلم نے دونوں جگہوں پر طویل وقت صرف کیا اور ایک شہر سے دوسرے شہر سفر کرتا رہا۔ 20 ماہ کی مدت میں ہالیڈے ان تیار تھا اور ہوٹل کا پہلا مرحلہ 1978ء میں کھول دیا گیا۔ اب یہ ہوٹل اسلام آباد میریٹ ہے۔

1978ء میں بھٹو صاحب کو اقتدار سے بے دخل کیا جا چکا تھا۔ ممکن ہے آپ حیران ہوں کہ میں نے ہوٹلوں کی تعمیر کے اس قصے کے دوران اس کا کیوں ذکر کیا۔ افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ چوں کہ پاکستان میں سیاست اور کاروبار کا آپس میں تعلق ہے اور دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہیں، وفاقی حکومت میں کوئی بھی تبدیلی، کوئی بھی فوجی بغاوت، اقتدار کے ہر کھیل نے ہوٹلنگ کے میرے منصوبوں پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ جولائی 1977ء میں ایک فوجی بغاوت کے ذریعے اقتدار سے ہٹائے جانے سے پہلے بھٹو اوران کی حکومت ہمیں اسلام آباد ہوٹل کی تعمیر مکمل کرنے کے لیے مسلسل کہتے رہے تھے۔ بھٹو نے اس ہوٹل کو دارالحکومت کے ایک پُرکشش چہرے کے علاوہ بین الاقوامی موقر و معزز شخصیتوں کی میزبانی کے لیے ایک عالمی معیار کی ایک سہولت کے طور پر دیکھا تھا۔ وہ سیاحت کی خوبیوں کا ادراک کر رہے تھے۔ وہ قومیانے کے عمل پر بھی پچھتا رہے تھے اور ''عملی طور پر'' چاول چھڑنے اور روئی دھننے کے کچھ کارخانوں کو نجی ملکیت میں دے دیا تھا۔ بلاشبہ، اس ضمن میں بھٹو زیادہ آگے نہ جا سکے اور نہ ہی وہ جا سکتے تھے کیوں کہ انہیں اپنے سوشلزم اور قومیانے کی ناقص

پالیسی کا کچھ تو بھرم رکھنا ہی تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو ہی نہیں، کوئی بھی سیاستدان خود کو غلط ثابت نہیں کرنا چاہتا۔ اگر وہ مزید اقتدار میں رہ جاتے، تو کیا وہ مزید کئی کمپنیوں کو نجی ملکیت میں دے دیتے؟ یہ ایک ایسا دلچسپ اور متجسس سوال ہے جس کا میرے پاس واضح جواب نہیں۔

حکومت کے آخری ایام تک بھٹو مبہم قسم کے اشارے اور پیغامات بھیجتے رہے۔ جب مذہبی جماعتوں کے مجبور کرنے پر انہیں شراب کے استعمال اور گھڑ دوڑ پر پابندی عائد کرنا پڑی یا پھر جمعہ کی بطور ہفتہ وار تعطیل کا اعلان کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنی مغربی عادات اور مزاج کے باوجود مصالحت کر لی۔ 1974ء کے اوائل میں اسے مذہبی قدامت پرستوں کے مطالبات پر جھکتے ہوئے چھوٹی سی احمدی اقلیت کو ''غیر مسلم'' قرار دینا پڑا۔ وہ ایسے زہریلے بیج بو رہے تھے جس کی فصل دوسروں خاص طور پر اس کے جانشینوں جنرل ضیاالحق کو کاٹنا تھی۔ 1977ء میں جنرل ضیاالحق نے بھٹو سے اقتدار چھین لیا، اپنے وزیراعظم کو قید میں ڈال دیا اور خود چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گیا۔ ایک برس بعد ضیاالحق نے پاکستان کے صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ اس وقت تک واضح ہو چکا تھا کہ وہ ایک نیا کلچر متعارف کرانے جا رہا ہے۔ اسے ہوٹلوں یا سیاحت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ ہوٹلوں کی تعمیر کے جاری منصوبے بھٹو کی جانب سے رقم ضائع کرنے کے مترادف تھے۔ اس نے ان منصوبوں میں بھٹو کے غیر قانونی مالی مفادات کے متعلق تحقیق شروع کر دی۔ ہلٹن، آواری کے مشہور پارسی مالک نے جلد ہی ضیاالحق کے ساتھ دوستی کر لی، اسے اپنی حمایت کا یقین دلایا اور پہلے کی طرح اس کا کام چلتا رہا۔ دیگر منصوبے اس قدر خوش قسمت نہ تھے۔ چوں کہ بھٹو نے بینکوں کو قومی ملکیت میں لے لیا تھا، اس لیے انہوں نے کراچی ہالیڈے ان (اب میریٹ) سمیت ہوٹلوں کے کچھ منصوبوں کے لیے قرض دینے سے انکار کرنا شروع کر دیا جس سے مراد یہ تھی کہ ہم بڑے بڑے تھوک فروشوں کو اپنی دکانیں کرایہ پر دے دیں۔ میں نے کرائے کی رقم کا انتظار کرنے کے بجائے متوقع کرائے داروں سے رابطہ کیا اور ان سے بھاری پگڑی طلب کی جو ہوٹل کے مکمل ہو جانے پر کرایہ میں سے منہا کی جانا تھی۔ اس کے باعث نقدی کے حصول کا مسئلہ حل ہو گیا۔ میں نے لاگت کے اخراجات میں بھی کمی شروع کی لیکن تحفظ اور معیار پر کوئی سمجھوتا نہ

کیا اور میں سامانِ تعمیر خود خریدتا۔ نتیجتاً میں نے یہ دونوں ہوٹل اپنے حریفوں سے نصف سے بھی کم لاگت میں تعمیر کر لیے۔

جب دونوں ہوٹل کھل گئے تو دونوں ہوٹلوں کے میرے قرضے 3 ملین ڈالر تک پہنچ چکے تھے۔ اس کے برعکس، شیرٹن جو 1982ء میں کراچی میں کھلا تھا، اس نے صرف کنسلٹنسی فیس کی مد ہی میں 3 ملین ڈالر ادا کیے تھے۔ یہ ایک ناگزیر صورتِ حال تھی اور جب میں نے پہلی دفعہ یہ سنا، میں نے محض اپنا سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ دیگر معاملات میں بھی میں نے سیدھے بلے سے کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ ہوٹل کے لیے ترقیاتی کام انجام دینے والے اداروں کو بیرون ملک سے غسل خانوں اور خوابگاہوں کی تنصیبات، ائیر کنڈیشننگ کا سامان، روشنی کے آلات اور برقی سیڑھیاں درآمد کرانے کے لیے درآمدی لائسنس دیا گیا جو پاکستان میں تیار نہیں کی جاتی تھیں۔ مزید برآں اس دَور میں ہوٹلنگ کی صنعت کے لیے ترقیاتی کام کرنے والے اداروں نے وہ اشیا ضرورت سے زائد منگوالی تھیں اور زائد اشیا کو دولت مند پاکستانیوں کے ہاتھ بلیک مارکیٹ میں فروخت کر دیا تھا، یوں انہوں نے اضافی آمدن حاصل کر لی۔ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا، مجھے اس قسم کے مکارانہ اور گھٹیا طور طریقوں اور دھوکہ بازی کے ذریعے حاصل کی گئی دولت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کراچی ہالیڈے اِن کا افتتاح 21 مارچ 1981ء کو میری والدہ کے ہاتھوں ہوا۔ یہ 'نوروز' یعنی نئے سال کا پہلا روایتی خوشی کا دن اور ایران سے تعلق رکھنے والے اسماعیلیوں کے لیے ایک مبارک موقع تھا۔ اپنی والدہ کے ساتھ جو ہمارے لیے دعا گو تھیں، ہم نے کافی شاپ، بینکوئٹ ہال اور مہمانوں کے کمرے کی پہلی منزل کا آغاز و افتتاح کیا۔ ہمیں کامیابی کی امید تھی لیکن یقین نہیں تھا۔ تاہم 1981ء میں، ہمارے خدشات تحلیل ہو گئے۔ ہوٹل کی کارکردگی حوصلہ افزا جا رہی تھی اور آمدن آ رہی تھی۔ ہمارے پاس اس قدر اضافی رقم آ گئی کہ ہم دوسری منازل بھی تعمیر کر سکیں اور اپنے تصور کے مطابق پہلا مرحلہ مکمل کر سکیں۔ میں نے انتہائی مسرت کے ساتھ بینکوں کو بتایا کہ انہیں مزید رقم دینے کی ضرورت نہیں اور اب ہمیں ان کی نقدی درکار نہیں۔

اس سے پہلے بینکوں کے ساتھ میری جھک جھک ہوتی رہی تھی۔ فروری 1981ء

میں کراچی ہوٹل میں مہمانوں کی آمد شروع ہونے سے ایک ماہ قبل مجھے بینکنگ کونسل آف پاکستان کی طرف سے طلب کیا گیا۔ قومیائے گئے تمام بینکوں کے صدور موجود تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ ہوٹل کی تکمیل کے لیے قابلِ ادا رقوم جاری کرنے سے قبل نئی شرائط عائد کی گئی ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ انہیں مجھ پر اعتماد نہیں اور وہ یہ رقم مجھے نہیں بلکہ براہ راست، ٹھیکیداروں، رنگ سازوں، ترکھانوں اور دیگر اشیاء فراہم کرنے والوں کو ادا کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ادائیگیاں تاخیر کا شکار ہو جاتیں جس کے باعث وہ ٹھیکیدار اور فروخت کنندگان ناراض ہو جاتے جو میرے ساتھ بطور گاہک کام کرنا چاہتے تھے اور فوری ادائیگی کے خواہاں تھے۔ مزید یہ کہ ایک سرکردہ اور مشہور کاروباری جس نے اپنے قرضے اور ٹیکس ہمیشہ بروقت ادا کیے تھے، اسے بتایا جا رہا تھا کہ جن بینکاروں کے ساتھ وہ عرصہ دراز سے کام کر رہا ہے، اب وہ اس پر اعتماد نہیں کرتے۔ یہ میرے لیے باعث توہین تھا اور میں اندر ہی اندر مشتعل ہو رہا تھا۔ میں نے استفسار کیا: ''کیا مجھے بینکوں سے رقم دینے یا بھیک مانگنے کے لیے بلایا گیا ہے، آپ کے سامنے بیٹھنے سے تو بہتر ہے کہ میں مسجد کے باہر کھڑا ہو جاؤں۔ مجھے آپ کے قرضوں کی ضرورت نہیں، اپنے قرضے اپنے پاس رکھیں، ایک ماہ بعد میرا ہوٹل کھل جائے گا۔'' اس میٹنگ کو بیچ میں چھوڑ کر میں طوفانی انداز سے باہر نکل گیا۔ جیسے ہی میں اپنے دفتر پہنچا، مجھے مسلم کمرشل بینک کے صدر عزیز سکرانی اور حبیب بینک کے سربراہ حبیب پاریکھ کا ٹیلیفون موصول ہوا۔ سکرانی نے کہا: ''اپنی پوری زندگی میں، میں نے ایسے الفاظ نہیں سنے جو تم نے آج استعمال کیے، لوگ تو پیسے مانگتے پھرتے ہیں، تم نے موقع گنوا دیا۔'' پاریکھ کا لہجہ کہیں زیادہ عامیانہ تھا: ''تم نے رتی بھر ہماری پروانہ کی، لوگ کانپتے لرزتے ہمارے پاس آتے ہیں لیکن تم تو انتہائی بے باکی سے ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کر رہے تھے۔''

جب ہوٹل کی تعمیر آخری مراحل میں تھی، صاف اور سیدھے الفاظ میں ہاتھی نکل گیا تھا، صرف دُم باقی رہ گئی تھی، اس اہم مرحلے پر بینکنگ کونسل نے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ آخری کام جاری تھے اور ہم اپنے ٹھیکیداروں اور فروخت کنندگان کو ادائیگی کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس نازک وقت پر سرمایہ کی کمی بہت زیادہ نقصان دہ

تھی۔ بہرحال ایک بار پھر میں نے اپنے ذاتی ذرائع اور اپنے فراخ دل خیر خواہوں کی طرف توجہ مبذول کی۔ میں ان مغرور بینک افسران اور ضیاالحق کی حکومت کو اپنے اوپر آخری بار ہنسنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ ایک ماہ کے اندر ہوٹل کام کرنے لگا۔ تین سال قبل جب اسلام آباد میریٹ مکمل ہوا تھا، میں نے دھوم دھڑ کے سے اس کا افتتاح کرنے کے بجائے محض ایک سادہ لنچ پر ہی اکتفا کیا تھا کیوں کہ ایک بڑی تقریب، اس وقت کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ضیاالحق کو اس طرف متوجہ کر دیتی۔ میں اس سے احتراز ہی برتنا چاہتا تھا کہ یہ حکمت کا تقاضا تھا۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ میرے ہوٹل کے چہرے پر کوئی سیاسی رنگ چڑھے۔ فروری 1981ء کے بینکنگ کونسل کے تجربے نے مجھے بتا دیا تھا کہ میں نے اس شخص کے متعلق درست فیصلہ کیا تھا۔

ملک کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد ضیاالحق کے ساتھ میری پہلی ملاقات 22 فروری 1978ء کو ہوئی تھی۔ مجھے مدعو کیا گیا تھا۔ ایک ریٹائرڈ فوجی افسر جنرل حبیب اللہ کاروباری حلقوں کی ایک انتہائی جانی پہچانی شخصیت تھے اور وہ ضیاالحق کی حکومت میں وفاقی سطح پر خدمات انجام دے چکے تھے۔ اس دن ضیاالحق دورے پر آئے ہوئے رومانیہ کے وزیراعظم کے اعزاز میں عشائیہ دے رہا تھا۔ اس تقریب میں 20 سے 25 مہمان تھے اور جنرل ضیا الحق نے بھی اس میں شرکت کی تھی۔ یہ اس کی حکومت کے ابتدائی ایام تھے، اور مہمان ایک دوسرے سے متعارف ہو رہے تھے۔

بھٹو حکومت کے بہت سے ناقد یہاں موجود تھے اور بہت بے تکلفی کا اظہار کر رہے تھے۔ جنرل حبیب اللہ کو بھی بھٹو نے قید میں ڈالا تھا کیوں کہ وہ جنرل کو ایوب خان کے قریب سمجھتا تھا۔ وہاں موجود ایک مہمان اردشیر کاؤس جی بھی تھے، جو کراچی کی ممتاز پارسی فیملی سے تھے، جس کی شپنگ کمپنی کو بھٹو نے قومی تحویل میں لے لیا تھا۔ منہ پھٹ کاؤس جی جو بعد ازاں 2012ء میں اپنی وفات سے قبل ایک مشہور اخباری کالم نگار بن چکے تھے، انہیں بھی بھٹو نے احمقانہ اور آمرانہ حکم کے تحت جیل بھجوا دیا تھا۔ اس تقریب میں کاؤس جی نے جنرل ضیا سے یہ استفسار کرتے ہوئے حالات کو انتہا تک پہنچا دیا، ''شیمپین کی میری بوتل کہاں ہے؟'' ضیاالحق

کی بطور ایک قدامت پسند مسلمان کی حیثیت سے شہرت جو الکوحل سے احتراز کرتا تھا، کوئی راز نہ تھی۔ میں ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے یہ گفتگو سن رہا تھا کہ جنرل ضیاالحق کس ردعمل کا اظہار کرتا ہے؟...... کیا وہ اسے بطور مذاق محض ہنسی میں اڑا دیتا ہے؟...... کیا وہ اپنے کندھے جھٹکتا اور موضوع تبدیل کر دیتا ہے اور اگلے مہمان کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ ضیاالحق کی آنکھوں میں خون اتر آیا...... وہ مشتعل ہو چکا تھا۔ اب میں اپنے لیے ضیاالحق کا رویہ دیکھنا چاہتا تھا۔ جب ضیاالحق کھانے میں مصروف تھا میں نے اپنا تعارف کرایا اور میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی تاکہ پتا چلے کہ کیا وہ واپس مجھ سے آنکھیں ملاتا ہے یا نظریں چرالیتا ہے؟ میرے تجربے کے مطابق دوسرے شخص کا ردعمل صاف ظاہر ہو جاتا ہے اور آنکھیں ایک پیغام پہنچاتی ہیں۔ ضیاالحق کی آنکھوں سے مکاری اور عدم برداشت کا اظہار ہو رہا تھا جس کے باعث میں بے چینی محسوس کرنے لگا۔ یہ میرے ملک کا خود ساختہ حکمران تھا۔ وہ پاکستان کے لیے کس طرح مفید ثابت ہوتا یا ہو سکتا تھا۔

ایک ماہ بعد میں دوبارہ جنرل ضیاالحق سے ملا۔ ضیاالحق اس وقت کراچی کے دورے پر تھا اور سندھ حکومت کے ایک وزیر نے اس کے اعزاز میں عشائیہ دیا تھا۔ اس دفعہ وہ اپنے سینئر مشیروں اور اپنے قریبی رفقاء، چاپلوسوں اور مفاد پرستوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور گفتگو ختم کرنے کی اجازت چاہی۔ خلاف توقع اس نے مجھے روک لیا اور ایک سوال پوچھا: ''کیا خبر ہے؟'' میں اس سوال کا جواب کئی ایک طریقوں سے دے سکتا تھا لیکن میں اندرونی کیفیات ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں شروع ہو گیا۔ ''خبر؟...... کوئی خبر نہیں...... بھٹو صاحب نے ملک کو تباہ کر دیا اور آپ انہی بیوروکریٹس کو نواز رہے ہیں۔'' یہ ایک عمومی حوالہ تھا لیکن اسے اس تقریب میں موجود کسی بھی شخص پر منطبق کیا جا سکتا تھا۔ ضیاالحق ششدر رہ گیا لیکن میں تو ابھی شروع ہوا تھا۔ میں نے طنزاً کہا، ''بھٹو صاحب نے صرف یوٹیٹو کارپوریشن آف پاکستان قائم نہیں کی...... صرف اسے قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ ٹی وی کو کھولیں تو ملا ہی ملا نظر آئیں گے...... براہ کرم معیشت پر توجہ دیں ورنہ ہم ڈوب رہے ہیں۔ کارپوریشنوں کو ان بیوروکریٹس سے نجات دلایئے، کرپشن

میں کئی گنا اضافہ ہو رہا ہے، لوٹ مار اور چوری چکاری زوروں پر ہے، براہ کرم کاٹن کارپوریشن کے گودام کا دورہ کریں، ٹرکوں پر راتوں رات مال چوری ہو رہا ہے۔'' ضیاالحق نے کچھ نہیں کہا۔ انتہائی نازک خاموشی کے چند ثانیوں کے بعد وہ اپنے آگے بیٹھے ہوئے شخص کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا: ''آیئے! کھانا کھاتے ہیں۔'' مجھے اس نے اہمیت نہ دی۔ اس کا غصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ عادی نہیں تھا کہ اسے سچ بتایا جائے۔

سزا بہت سخت تھی۔ اگلی صبح جلد ہی آٹھ بجے، مجھے نور لغاری چیف آف انٹیلی جینس بیورو کراچی کی طرف سے فون موصول ہوا۔ لغاری میرا دوست تھا لیکن میں یہ بھانپ چکا تھا کہ وہ مجھے ٹٹولنے کی کوشش کر رہا تھا اور قدرے پریشان تھا۔ میں نے اسے بات کرنے کو کہا۔ بالآخر وہ بول ہی پڑا: ''صدرو بھائی، ضیاالحق کی طرف سے ایک پیغام ہے، براہ کرم! اس کے ساتھ بات مت کرنا اور نہ ہی اس سے ملنے کی کوشش کرنا، تمہیں اس سے منع کر دیا گیا ہے۔'' میں پھٹ پڑا۔ ''جہنم میں جاؤ اور براہ کرم! میرا یہ پیغام جنرل ضیا کو پہنچا دو۔'' مجھے ناپسندیدہ شخص قرار دے دیا گیا تھا۔ ایک ہفتے کے اندر ہی نہ صرف میں بلکہ میرے پورے خاندان کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل کر دیا گیا تھا، حتیٰ کہ میرے والد کو بھی نہیں بخشا گیا جو ایک برس قبل 14 مئی 1977ء کو انتقال کر گئے تھے۔ میں ملک نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میری کمپنی کے امور اور میرے مالیاتی معاملات کے متعلق ظالمانہ تحقیقات کا بھی آغاز ہو گیا۔ اب میری زندگی کے ہر پہلو کے متعلق تفتیش کی جا رہی تھی۔ ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے! میں ہوٹل تعمیر کرنے اور میزبانی و مہمانداری کے حوالے سے پاکستان کی ساکھ بہتر بنانے کی کوشش کر رہا تھا...... اور ایک آمرانہ حکومت میرے پیارے پاکستان کو میرے لیے نامہربان بنانے پر تلی ہوئی تھی۔

زیرِ نظر کتاب، میں اپنے آباؤ اجداد کے نام منسوب کرتا ہوں، جو اپنے شاندار کردار کی بدولت ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ انسانی قدریں، جو وہ اپنی آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ گئے، کامل یقین، سچائی اور ایمانداری پر مشتمل اقدار ہیں۔ خدا کرے کہ اُن کی دعائیں سدا ہمیں راہِ راست پر کاربند رکھیں۔ آمین

دادا، کمادیا عبداللہ باشو

پردادا، مُماھی باشوتھورانی

والدہ، زیور حسین باشوانی

والد، مُماھی حسین باشوانی

کرکٹ کے شیدائی صدرالدین ہاشوانی 1950ء کی دہائی میں اپنی فاسٹ باؤلنگ کی وجہ سے مشہور تھے

صدرالدین ہاشوانی اپنے کیریئر کی ابتدا میں پاکستان کے طول وعرض کا سفر کرتے رہے۔ یہ بولان میل ہے جو انہیں ہر دو ہفتے بعد کراچی سے کوئٹہ لے جاتی تھی

صدرالدین ہاشوانی اپنی والدہ زیور حسین ہاشوانی کے ساتھ ایک انتہائی مضبوط قریبی تعلق رکھتے تھے

اپنی والدہ کی یاد میں، اُن کی جائے پیدائش گوادر بلوچستان میں تعمیر کردہ زیور پرل کانٹی نینٹل ہوٹل

حکومت پاکستان کی درخواست پر اسلام آباد میں
تعمیر کردہ ہالیڈے ان، جس نے 1978ء
میں کام شروع کیا

1992ء۔ میریٹ انٹرنیشنل کمپنی کے مسٹر کارل کلبرگ
اور صدرالدین ہاشوانی، میریٹ فرنچائز پر
دستخط کرتے ہوئے

توسیع شدہ ہالیڈے ان ہوٹل، اب میریٹ اسلام آباد

1985ء میں صدرالدین ہاشوانی نے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹلز خرید کر پاکستانی بزنس کمیونٹی کو
حیران کر دیا، انٹر کانٹی نینٹل سے بنایا گیا پرل کانٹی نینٹل کراچی
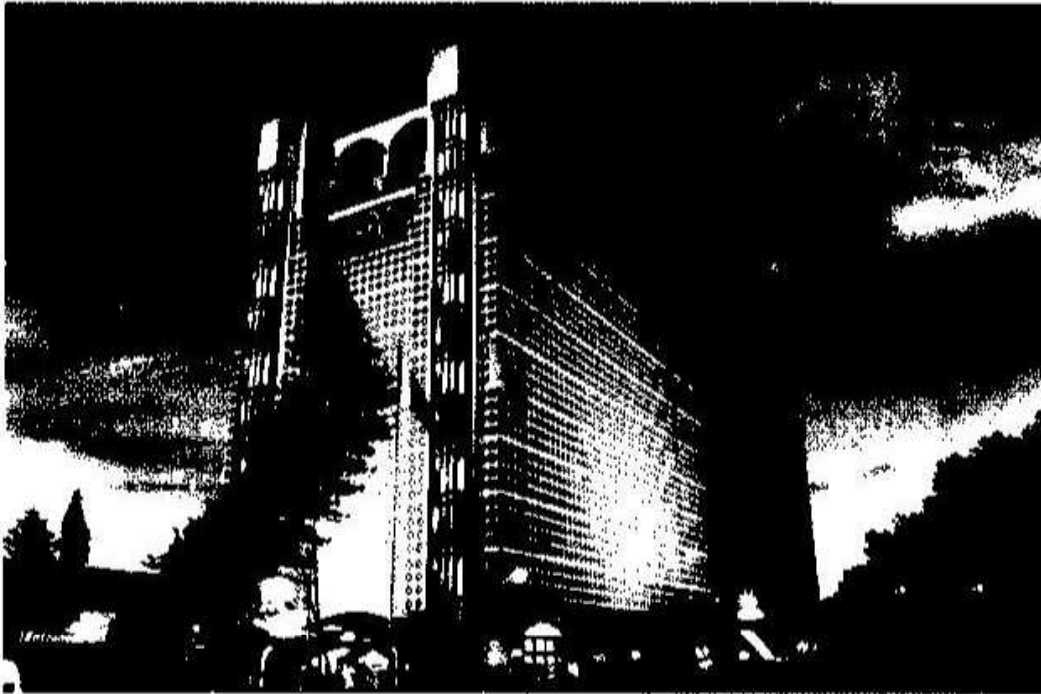
صدرالدین ہاشوانی نے ہوٹلز کی نئی برانڈ، پرل کانٹی نینٹل کا تصور دیا، جو آج پاکستان میں ہوٹل انڈسٹری
میں سرکردہ نام ہے

20 ستمبر 2008ء کو اسلام آباد میریٹ ہوٹل بم حملے کا نشانہ بنا جس میں 60 افراد ہلاک اور تقریباً 300 لوگ زخمی ہوئے
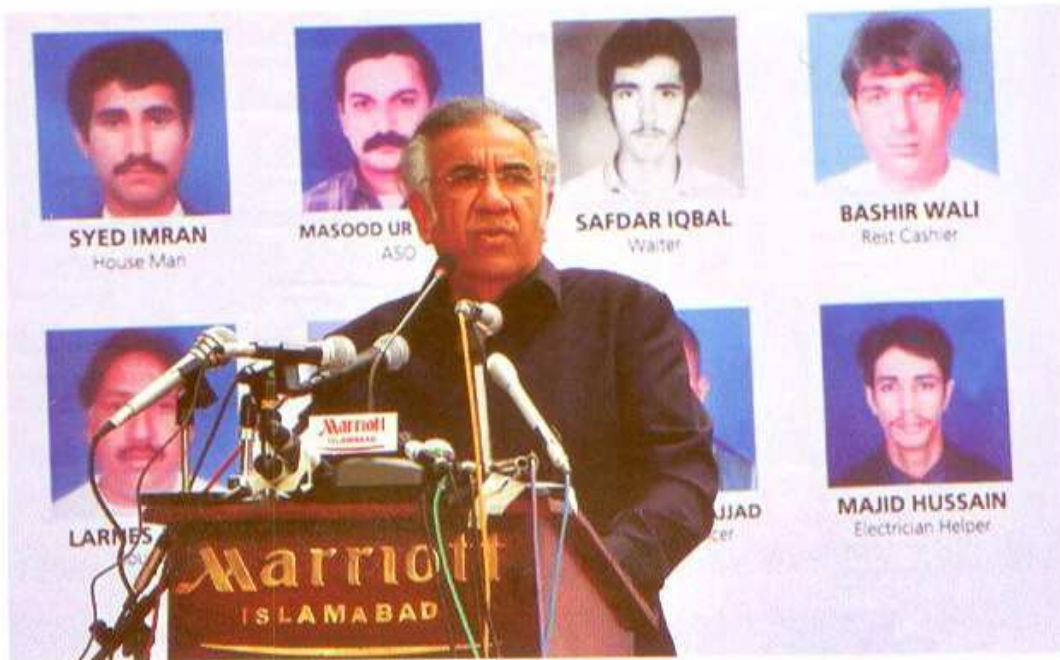
صدرالدین ہاشوانی، اکتوبر 2008ء میں میریٹ بم دھماکے کے شکار افراد کی یاد میں منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے
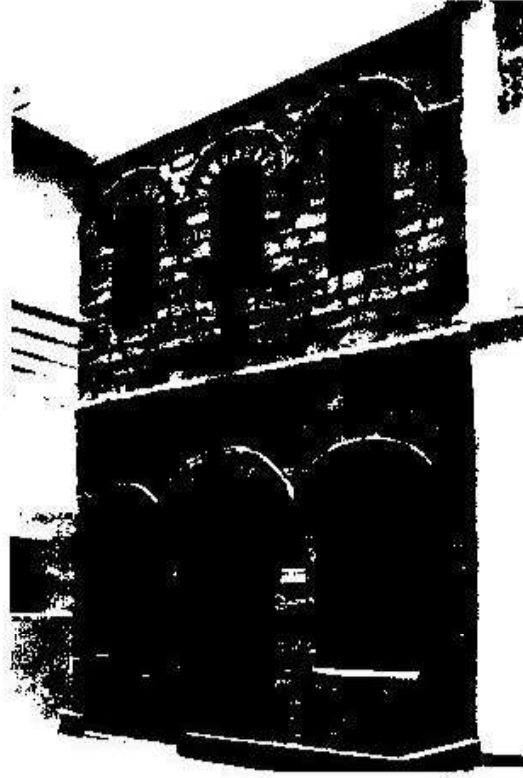
1894ء سے منگھی باشو کی رہائش گاہ، جسے صدرالدین ہاشوانی نے ہاشو میوزیم میں تبدیل کر دیا۔ اس کا افتتاح 11 مئی 2008ء کو ہوا۔ تاریخی اور مذہبی اہمیت کی حامل دیگر اشیا کے علاوہ، یہاں قرآن پاک کا چار سو برس پرانا ہاتھ سے تحریر کردہ نسخہ بھی موجود ہے

صدرالدین ہاشوانی، ہاشو فاؤنڈیشن کی پہلی ایلومینائی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے۔ ہاشو فاؤنڈیشن 1988ء سے انسانی ترقی اور غربت میں کمی کے میدان میں مصروفِ عمل ایک نان پرافٹ تنظیم ہے

صدرالدین ہاشوانی، اپنے قریبی دوست
مرحوم جنرل آصف نواز جنجوعہ کے ہمراہ
جو بعدازاں پاکستان کے آرمی چیف بنے

29 اپریل 2014ء۔ بیلجیم کے بادشاہ
ہز ہائی نس فلپ کی طرف سے سفیر بیلجیم ہز
ایکسی لینس پیٹر کلائس، بیلجیم کے ایوارڈ
''نائٹ کمانڈر آن آرڈر آف لیوپولڈ II''
سے صدرالدین ہاشوانی کو نواز رہے ہیں۔

باب 6

اپنے ہی وطن میں مفرور

میرے اور ہاشو گروپ کے خلاف تحقیقات بھرپور انداز میں شروع کر دی گئیں۔ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کراچی نے یہ تفتیش بریگیڈیئر تجمل حسین کے سپرد کر دی جو ایک کینہ پرور شخص معلوم ہوتا تھا۔ تقریباً ہر روز تجمل حسین مجھے مارشل لاء سمری کورٹ طلب کر لیتا۔ اس کے ساتھی اور وہ میری گردن کے گرد پھندا کسنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کے پاس کوئی ٹھوس، مضبوط اور ناقابل تردید ثبوت نہیں تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے پاس سرے سے کوئی ثبوت تھا ہی نہیں کیوں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے خلاف تمام مقدمے خارج ہو گئے۔ لیکن جب بھی طلب کیا جاتا انتہائی مستقل مزاجی کے ساتھ باقاعدگی کے ساتھ مجھ سے وہی سوال پوچھا جاتا: ''کیا ذوالفقار علی بھٹو تمہارا خفیہ شراکت دار ہے؟'' میں ان سے کہتا کہ ''ذوالفقار علی بھٹو سے شراکت داری تو ایک طرف رہی، میری تو ان سے ملاقات بھی کبھی نہیں ہوئی۔''

''تم اس سے کیوں نہیں ملے؟'' بریگیڈیئر تجمل حسین کو یقین نہ آتا اور وہ اپنے شبہ کا اظہار اس سوال کی صورت میں کرتا۔

''میں ان سے کیوں ملتا؟ مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی۔'' میں کہتا۔

''لیکن اس نے تمہیں ہوٹل کی تعمیر کے لیے اس قدر قیمتی قطعہ زمین دیا!''

''کراچی میں میرا اپنا بھی ایک قطعہ زمین تھا لیکن مجھے ایک بہتر اور بڑے قطعہ

زمین کی ضرورت تھی۔ اسلام آباد میں حکومت نے مجھے قطعہ زمین الاٹ کیا کیوں کہ حکومت کی خواہش تھی کہ میں اس پر ہوٹل تعمیر کروں۔ حکومت نے محسوس کیا تھا کہ دارالحکومت کو ایک اچھا ہوٹل درکار ہے۔ اگر آپ چاہیں تو براہ کرم یہ قطعہ زمین واپس لے لیں۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن مجھے بتاؤ کہ بھٹو صاحب نے تمہارے لیے کیا کچھ کیا؟''

''میں نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی شخص سے کبھی کوئی مدد طلب نہیں کی۔ اور بھٹو صاحب نے تو نہایت ہی اچھے دنوں میں میرے روئی کے کاروبار کو سرکاری تحویل میں لے کر تقریباً مجھے تباہ کر دیا تھا۔ اگر اس نے میری یہی مدد کی تھی تو پھر مجھے بتاؤ کہ یہ کہاں کی اور کیسی مدد تھی؟'' میں اسے برجستہ جواب دیتا۔

میرا کام اور پیشہ ورانہ ذمہ داریاں متاثر ہونے لگیں۔ دفتر اور کاروباری ملاقاتوں میں شرکت کے بجائے مجھے اس بریگیڈیئر کے ذریعے خوف زدہ کیا جانے لگا جسے تجارت اور اکاؤنٹینسی کے متعلق کم ہی علم تھا اور اسے یہ بھی قطعی علم نہ تھا کہ میں نے زندہ رہنے کے لیے کیا پاپڑ بیلے۔ وہ تو بس میری زندگی مشکل بنانے پر تلا ہوا تھا۔ مجھے اکثر سمری کورٹ طلب کر لیا جاتا اور گھنٹوں انتظار کرانے کے بعد وہی سوالات پوچھے جاتے جن کے جواب میں دے چکا تھا۔ تجمل حسین کی از حد کوششوں کے باوجود بالآخر تفتیشی ٹیم اس نتیجے پر پہنچی کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ سینٹرل بورڈ آف ریونیو سے انکم ٹیکس اتھارٹیز تک، تمام محکموں نے باری باری مجھے اور میری کمپنیوں کو تمام الزامات سے بری قرار دے دیا اور مجھ پر دباؤ ختم ہو گیا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں نے ضیاالحق کی غلط سماجی و معاشی پالیسوں پر تنقید جاری رکھی۔

ممکن ہے کہ سمجھ دار قارئین یہاں تضاد محسوس کریں۔ میں نے اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں کہا تھا کہ میں نے بھٹو سے اس لیے ملنے سے احتراز کیا کہ میں اسے اپنا دشمن نہیں بنانا چاہتا تھا اور مجھے احساس ہو چکا تھا کہ وہ ایسا شخص ہے جو اختلافات کو شخصی اور ذاتی نوعیت کی حد تک لے جاتا ہے۔ مگر اس کے برعکس میں ضیاالحق کے خلاف بولنا چاہتا تھا۔ کیوں؟ کیا فرق تھا ان دونوں میں؟ صاف بات تو یہ ہے کہ مجھ میں ضیاالحق کے خلاف بولنے اور اس پر تنقید کرنے کی ہمت تھی کیوں کہ مجھے علم تھا کہ اپنے اختیار اور بے پناہ طاقت کے

باوجود ضیاالحق کے پیروں میں ایک ادارے یعنی فوج کی بیڑیاں تھیں۔ اگر وہ اخلاقیات کو روندتا یا قطعی غضب آلود اور متعصبانہ اقدام اٹھاتا تو دیگر جرنیل اور کور کمانڈر حتیٰ کہ سابق جرنیل جن کا پاکستانی معاشرے میں اثر ورسوخ تھا، وہ لازماً مداخلت اور احتجاج کرتے اور ان کی بات جنرل ضیاالحق آسانی سے مسترد نہ کرسکتا۔ اس کے برعکس 1970ء کی دہائی کے اوائل میں اپنے عروج کے ایام میں بھٹو کسی کے سامنے جواب دہ نہ تھا۔ عوام میں بے پناہ مقبولیت اور سحر انگیز شخصیت نے اسے بدمست کردیا تھا۔ اگرچہ ظاہری طور پر وہ ایک سیاسی اور جمہوری رہنما نظر آتا تھا مگر عملاً وہ سرتاپا آمرانہ بلکہ جابرانہ ذہنیت کا مالک تھا۔ وہ جب جس کو چاہتا بغیر کسی قانونی جواز کے جیل بھیج دیتا۔

پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ یہاں سیاسی رہنماؤں نے بھی آمر بننے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس فوجی آمروں نے اپنی شرائط پر حقیقی جمہوریت پسند بنے بغیر سیاسی جواز ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس قسم کی منافقت کا آغاز قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی ہوگیا جس کے باعث حقیقی جمہوریت کے لیے راستے تنگ اور امکانات دھندلا کر رہ گئے۔ فوجی آمر تو جمہوریت پر یقین ہی نہیں رکھتے اور سیاستدان اپنے مخصوص مفادات کے لیے جمہوریت کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔ پاکستان میں دونوں قسم کے رہنماؤں کی طرف سے اختیار کے جائز و ناجائز استعمال کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں، فوج کے ادارہ جاتی ڈھانچے میں اختلاف رائے کی گنجائش موجود ہے۔ بند دروازوں کے پیچھے ہی سہی لیکن اختلافی نقطۂ نظر بیان کیا جاسکتا ہے اور مجاز حکام سے اپیل کی جاسکتی ہے۔ ضیاالحق جس فوج کے سربراہ تھے اس میں یہ گنجائش موجود تھی۔ بھٹو کے ہوتے ہوئے ایسا ممکن نہ تھا کیوں کہ وہ پی پی پی کے غیر متنازع قائد تھے اور ان کی کابینہ خوشامدیوں پر مشتمل تھی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں ہمیشہ سے ہی قائل تھا کہ کاروبار کا مقصد محض نفع ونقصان اور تجارتی سودے بازی نہیں۔ کاروبار کو اخلاقی اقدار اور معاشرے کو درپیش مسائل سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے تو اپنی کمپنیوں، ملازمین اور اپنے گاہکوں سے والہانہ حد تک لگاؤ تھا اور اس سے بھی کہیں زیادہ عشق مجھے پاکستان سے تھا۔ اس ملک نے مجھے اور میرے خاندان کی اگلی نسلوں کو بہت کچھ

دیا۔اس پس منظر میں میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ اس ملک کی معیشت، معاشرے اور نظام حکومت کے قیام اور ترقی کے لیے کردار ادا کرنا میرا فرض ہے۔ اگر اس فرض کی ادائیگی سے مراد یہ ہے کہ میں کسی بھی فوجی حکمران کے غلط اقدام کے خلاف احتجاج کرتا تو میں نے اس میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میرے بہت سے کاروباری دوست ٹوکتے:

''صدرو، تم یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو؟'' مجھ سے اکثر کہا جاتا،''تم ایک کاروباری ہو، اپنے کاروبار پر توجہ دو، تم ہر ایک کی ذمہ داری نہیں لے سکتے۔'' میرا جواب ہمیشہ ایک ہی ہوتا،''یہ میرا ملک ہے، میری سرزمین ہے، اس کا مجھ پر قرض ہے۔ مجھے لازماً وہ کہنا چاہیے جسے میں ٹھیک سمجھتا ہوں۔ اگر جرنیل کچھ غلط کام کرتا ہے اور ہم بزدلوں کے مانند خاموش رہتے ہیں، اس سے ملک کو کس طرح فائدہ ہوسکتا ہے؟ دو غلط کاموں کا نتیجہ ایک درست کام نہیں ہوسکتا۔''

سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ضیاالحق کے پسندیدہ و چنیدہ ان افراد کی منافقت تھی جو ضیاالحق کی چاپلوسی کے ذریعے دولت مند اور طاقت ور ہو گئے تھے۔ لڑکپن کے دوران میں نے قرآن میں پڑھا تھا کہ منافقت اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف ہے۔ پاکستان میں 1980ء کی دہائی کے اوائل ہی سے قومی سطح پر منافقت اور غیبت وقت گزاری کا بہترین ذریعہ بن چکی تھیں۔ 1985ء میں ضیا انتظامیہ کے خلاف بے چینی و اضطراب کا سلسلہ شروع ہوا اور جلد ہی عروج پر پہنچ گیا۔

مزید برآں عالمی برادری کی طرف سے بھی تنقید کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ امریکہ کا پسندیدہ ہونے کے باوجود ضیاالحق پر تنقید کی جا رہی تھی کہ اس نے جمہوریت کی طرف فوری واپسی اور 1977ء کے اوائل میں انتخابات کرانے کے وعدے پورے نہیں کیے۔ فوجی بغاوت کے بعد اس کے اقتدار کے آٹھ برس گزر چکے تھے اور جمہوریت یا سیاست کی طرف واپسی یا ضیاالحق کی طرف سے اقتدار چھوڑنے کے خفیف سے آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ دسمبر 1984ء میں ضیاالحق نے ایک ریفرنڈم کروایا۔ وہ واحد امیدوار تھا اور لوگوں کو اس کی صدارت کو تسلیم یا مسترد کرنے کا حق دیا گیا مگر یہ واضح نہیں تھا کہ اگر عوام نے اسے مسترد کر

دیا تو پھر کیا ہوگا۔ اس کے سوا کوئی اور امیدوار نہیں تھا اور کسی کو بھی سنجیدگی سے یہ توقع نہیں تھی کہ ضیاالحق خاموشی سے اقتدار چھوڑ دے گا۔ اس مضحکہ خیز ریفرنڈم میں دس فیصد پاکستانی بالغ افراد نے ووٹ ڈالے اور ضیاالحق 95 فیصد اکثریت سے جیت گیا۔

دو ماہ بعد اس نے پارلیمانی انتخابات کی اجازت دے دی لیکن سیاسی جماعتوں کو امیدوار کھڑا کرنے یا جماعتی نشان استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یوں سندھ کے ایک جاگیردار خاندان سے تعلق رکھنے والا ضیاالحق کا ایک خدمت گار محمد خان جونیجو وزیراعظم بن گیا۔ جونیجو بظاہر سادہ اور اطاعت گزار معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے پیچھے ایک بدعنوان اور گھٹیا ذہن کا شخص چھپا ہوا تھا۔ منجھے ہوئے سیاست دان کی حیثیت سے جونیجو نے جعلی دستاویزات کے ذریعے ایک مرسیڈیز کار درآمد کی تھی۔ ایک دن اس کے سیکریٹری اقبال جونیجو نے مجھے ٹیلیفون کیا اور کار خریدنے کی درخواست کی۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ میں نے کہا، ''مجھے کار کی ضرورت نہیں اور میں تو مرسیڈیز نہیں چلاتا۔'' اقبال نے اصرار کیا، ''لیکن براہ کرم کار خرید لو، جونیجو صاحب بہت خوش ہوں گے۔ اگر تم کار خرید لو گے تو جونیجو کو مسرت ہوگی۔'' میں نے کار اور درآمدی دستاویزات دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب میں نے ان دستاویزات کی چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ یہ جعلی ہیں۔ یہ کار امپورٹ ڈیوٹی بچانے کے لیے اسمگل کی گئی تھی اور جونیجو اپنی سیاسی حیثیت کا استعمال کرتے ہوئے کار کو مقامی طور پر فروخت کر کے کثیر منافع کمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پاکستان کا کیا قصور تھا کہ اسے اس قسم کا شخص بطور وزیراعظم نصیب ہوا۔ جنرل ضیا بھی دہرے چہرے کا مالک تھا۔ اس نے تجارتی طور پر بھارتی فلمیں دکھانے پر پابندی عائد کر دی اور ایک عام شہری کو بھارتی فلمیں دیکھنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا لیکن اپنے گھر میں وہ خود بھارتی فلمیں دیکھتا تھا۔ مجھے یہ حقیقت ان مشترکہ دوستوں کے ذریعے معلوم ہوئی جنہیں ضیاالحق کی طرف سے یہ فلمیں دیکھنے کے لیے مدعو کیا جاتا تھا۔

ضیاالحق کی قوت اس کے اقتدار کی بقا میں تھی۔ اگرچہ وہ ایک فوجی تھا لیکن سازشوں اور دغا بازی کے لیے اس کا ذہن سیاسی تھا جس کے باعث وہ اقتدار سے چمٹے رہنے میں کامیاب رہا۔ اس نے بھٹو کو بے وقوف بنایا جنہوں نے اسے ان گیارہ جرنیلوں

پر ترجیح دے کر چیف آف آرمی سٹاف بنایا جو ضیاالحق سے کہیں زیادہ اس عہدے کے مستحق تھے۔اس نے بھٹو کے دل میں کیسے گھر کیا، یہ ایک قابل ذکر داستان ہے۔وہ اس کورٹ مارشل کی عدالت کا جج تھا جس میں اٹک سازش کا مقدمہ چل رہا تھا۔اس مقدمے میں چند سینئر فوجی افسروں پر بھٹو حکومت کے خلاف فوجی بغاوت کی سازش کے الزام میں فردِ جرم عائد کی گئی تھی۔ ضیاالحق نے ان افسروں کو مجرم ٹھہرایا اور ان کے لیے سزائے موت مقرر کی۔یہ سزا انتہائی سخت تھی اور خود بھٹو کو بھی سزا میں نرمی کے متعلق کہنے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ بالآخر ضیاالحق کی طرف سے سزا میں بہت زیادہ نرمی کر دی گئی لیکن ضیاالحق نے بھٹو حکومت کے لیے خطرہ بننے والے کسی بھی شخص کو سزائے موت کا حق دار ٹھہرا کر بھٹو کو متاثر کر لیا۔ جب دونوں شخصیتوں کی ملاقات ہوئی تو ضیاالحق نے اپنا سر جھکاتے ہوئے اس طرح نرمی اور منکسر المزاجی سے بات کی جیسے وہ کسی شہنشاہ یا روحانی رہنما سے مخاطب ہو۔اس طرح بھٹو کو یہ یقین ہو گیا کہ ضیاالحق ان کا وفادار اور موم کی ناک ہے۔بھٹو نے کبھی گمان بھی نہیں کیا ہو گا کہ ان کا نااہل آرمی چیف انہی کا جلاد بننے کی تیاری کر رہا ہے اور اپریل 1979ء میں انہیں تختہ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔

ضیاالحق کی قسمت نے یوں پلٹا کھایا کہ دسمبر 1979ء میں سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔اس کے باعث پاکستان کی فضا تبدیل ہو گئی اور ضیاالحق کے حوالے سے امریکیوں کا طرزِ عمل بدل گیا۔ایک ایسا آمر جس نے بھٹو کو پھانسی کے تختے تک پہنچایا تھا، اب اسے سرد جنگ کے ضمن میں ایک سرکردہ حلیف تصور کیا جا رہا تھا۔ضیاالحق نے بذاتِ خود بھی پاکستان میں افغان جہاد کو فروغ دینا شروع کر دیا۔بہت سے ممالک کے عام افراد ہی نہیں بلکہ آسودہ حال مسلمانوں کو بھی پاکستان آنے، روسی افواج سے لڑنے اور افغانستان کو آزاد کرانے کے لیے اس ملک کو اڈہ بنانے کی ترغیب دی گئی۔ضیاالحق نے افغانستان میں مجاہدین کی مدد کرنے اور وطن میں ایک سیاسی حلقہ تشکیل دینے کی خاطر پاکستان میں مذہبی قوتوں اور انتہا پسندوں کو متحرک کر کے لندن اور واشنگٹن ڈی سی میں مقبولیت حاصل کی۔ پاکستان، افغانستان کے لاکھوں پناہ گزینوں کی منزل بن گیا جن میں کچھ نے ہتھیار اٹھا

لیے ۔اس صورت حال کے پاکستان اور دنیا پر جو دیرپا اثرات مرتب ہونے تھے، 1980ء کی دہائی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آج ان اثرات کو ضیاالحق کے ورثہ کی حیثیت سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔ مغربی دنیا جس نے 30 برس پہلے ضیاالحق کی تعریف اور مدد کی تھی اب اس پر تنقید کرتا ہے۔ یہ مغربی دنیا بہت سے پہلوؤں کے لحاظ سے ضیاالحق سے کہیں بڑا منافق ہے لیکن یہ ایک الگ کہانی ہے۔

مجھے عالمی سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور میں اپنے کاروبار کے لیے نت نئے مواقع کی تلاش پر توجہ مرکوز کیے ہوئے تھا۔ میں نے تمباکو کی بہت بڑی کمپنی، فلپ موریس کے ساتھ مشترکہ کاروبار شروع کیا اور اس کے پاکستانی ذیلی ادارے، پریمیر ٹوبیکو کا 40 فیصد کا مالک بن گیا۔ ایک دفعہ پھر یہ میرے لیے نیا شعبہ تھا اور میں اس میں یہ ادراک کیے بغیر ہی داخل ہو گیا کہ مجھے اس سے کیا منافع حاصل ہوگا۔ پاکستان میں تمباکو کے کاروبار کے موجودہ کھلاڑی جن میں کچھ وسیع البنیاد منظم جرائم میں ملوث تھے، تھرتھرا گئے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے میں نے مگرمچھوں کو جگا دیا ہو۔ اس کے نتیجے میں مجھے اپنے کاروباری حلیفوں کی جانب سے ایک خفیہ مہم اور شدید قسم کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

ضیاالحق کو میرے متعلق بتایا گیا تھا کہ میں بھٹو کی پارٹی پی پی پی کے لیے رقوم مہیا کرتا ہوں جس کی قیادت ان کی موت کی بعد ان کی بیٹی بینظیر بھٹو کر رہی تھیں۔ ضیاالحق نے بینظیر کو گرفتار کر کے لندن جلا وطن کر دیا۔ 1986ء میں وہ پاکستان واپس آئی اور ایک بڑے ہجوم نے ان کا استقبال کیا۔ اس صورت حال نے ضیاالحق کو پریشان کر دیا۔ میں تو بینظیر کو جانتا تک نہیں تھا اور پی پی پی کو رقم فراہم کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود بینظیر کی واپسی کے چند ہفتے بعد فوجی حمایت یافتہ حکومت نے میرے گھر پر چھاپہ مارا اور مجھے اس الزام کے تحت گرفتار کر لیا کہ میں نے سیاسی چندہ کی مد میں بینظیر اور پی پی پی کو 25 لاکھ روپے دیے اور مبینہ طور پر حکومت کا تختہ الٹنے کی کوششوں میں معاونت کی۔ یہ نہایت احمقانہ حرکت تھی۔ مجھ پر الزام عائد کیا گیا کہ میں نے اپنے کزن اور پی پی پی کے ایک ممتاز رہنما پیار علی الانہ کے ذریعے بینظیر کو رقم ادا کی۔ غلام علی الانہ جو ایک معروف

اسکالر اور سرکاری ملازم تھے، 1985ء میں ان کا انتقال ہوا تو انہوں نے ترکے میں ایک ٹرسٹ چھوڑی جس کا سرپرست مجھے بنا دیا تھا۔ میرا کام یہ تھا کہ میں اس ٹرسٹ فنڈ سے دوسروں کے علاوہ کچھ رقم غلام علی الانہ کے بیٹے پیار علی الانہ کو ایک مقررہ مدت بعد ادا کروں۔ اسے سیاسی چندے کا رنگ دے دیا گیا اور میرے کاروباری حریفوں نے مجھے ایک سازشی کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا۔ جلد ہی میرے ٹیلیفون کی نگرانی شروع ہوگئی۔ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ میرے خلاف یہ الزامات کیوں عائد کیے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ میرے ایک قریبی دوست نے جو حکومت میں تھا، اس نے مجھے سے رابطہ کیا اور غصے میں مجھ سے پوچھا، ''تم کیا کر رہے ہو، کیا تم جنرل ضیا کا تختہ الٹنے کے لیے رقوم فراہم کر رہے ہو؟ تم بینظیر کو کیوں رقم بھیج رہے ہو؟'' میں بھونچکا رہ گیا اور جلد ہی مجھے ادراک ہو گیا کہ ایک سیاسی مقدمہ میرے خلاف بنایا جا رہا ہے۔ مجھے میرے دیگر دوستوں نے ملک چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ ''حکومت تمہارے خلاف انتہائی سخت کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔'' ان میں سے ایک دوست نے مجھے خبردار کیا۔ میں نے کہا کہ میں یہیں رہوں گا اور مقابلہ کروں گا۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا، میں بھاگوں گا نہیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے گھر پر چھاپہ گیا۔ چھاپے کا آغاز صبح سات بجے ہوا۔ 40 افراد کی ایک ٹیم، جو سادہ لباس میں تھے اور جن کی سربراہی فیڈرل انویسٹی گیشن ایجنسی (FIA) کا سربراہ کر رہا تھا اس نے عملی طور پر کراچی میں میرے گھر پر قبضہ کر لیا۔ دروازے پر دستک دینے یا گھنٹی بجانے کے بجائے، انہوں نے دیواریں پھلانگیں اور یوں اندر داخل ہو گئے جیسے وہ کسی دشمن ملک کو فتح کر رہے ہوں۔ انہوں نے ہر کمرا چھان مارا، ہر الماری کھول کر دیکھی، کپڑے، کتابیں اور کاغذ فرش پر بکھیر دیے گئے۔ یہ دیکھنے کے لیے تکیوں کی چیر پھاڑ کی گئی کہ کہیں ان میں خفیہ کاغذات یا سونا نہ چھپایا گیا ہو۔ میری چھوٹی بیٹیاں ابھی تک نائٹ ڈریس میں تھیں لیکن ان کے ساتھ مردوں پر مشتمل ٹیم نے نہایت بے دردی کا سلوک کیا اور چادر اور چاردیواری کے پیش نظر کسی حساسیت یا خوش خلقی کا مظاہرہ نہ کیا گیا۔ میری بوڑھی والدہ کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ وہ بے ہوش ہوگئیں۔ مجھے بتایا گیا کہ ایف آئی اے کی ٹیم

مجھے ''جرم میں ملوث کرنے پر مشتمل دستاویزات'' تلاش کر رہی ہے جن کے ذریعے حکومت کے خلاف ''سازش'' میں میرا کردار متعین ہو سکے۔ درحقیقت اس قسم کی ''سازش'' کا کہیں وجود نہ تھا اور نہ اس ضمن میں کوئی دستاویزات موجود تھیں لیکن اس جنونی، سازش سے بھرپور لمحہ میں کون سنتا۔ مسلسل چار گھنٹے تک ہماری تذلیل جاری رہی۔ انتہائی اشتعال کے عالم میں، میں نے ایف آئی اے کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر سے کہا جو اس چھاپے کا ایک حصہ تھا کہ ''تمہیں یہاں سے کچھ نہیں ملے گا، اگر تم چاہو تو جعلی دستاویزات برآمد کر سکتے ہو۔'' اس نے جو جواب دیا وہ میں کبھی فراموش نہیں کر پایا۔ ''ہم اس طرح کبھی نہیں کرتے، ہمارا ابھی ضمیر ہے۔'' وہ ایک اچھا آدمی تھا، ہم سارے پاکستانی اچھے لوگ تھے۔ لیکن ہماری حکومتوں اور سیاستدانوں نے ہمارے اور ہماری اخلاقی اقدار کے ساتھ یہ کیا کیا؟

میرا بھائی اور اس کے اہل خانہ، اس مکان کی پہلی منزل پر رہتے تھے۔ یہیں پر ایف آئی اے کے افراد کو رم سے تیار شدہ مشروب کی ایک بوتل مل گئی۔ چھاپہ مار پارٹی یوں خوش ہوئی جیسے اس نے کوئی جوہری بم دریافت کر لیا ہو۔ اکبر کو امتناعی قوانین کی خلاف ورزی پر گرفتار کر لیا گیا۔ مجھے بتایا کہ میرے خلاف پریمیر ٹوبیکو کمپنی کی ایکسائز ڈیوٹی کے تین لاکھ روپے غبن کرنے کا الزام ہے۔ یہ مقدمہ میرے خلاف تمباکو کے کاروبار کے ایک حریف کی سازش پر تیار کیا گیا تھا۔ تاہم میں پریمیر ٹوبیکو کمپنی میں منیجر سے کہیں زیادہ ایک سرمایہ کار تھا جسے تنخواہ دار افسران چلا رہے تھے۔ چھاپے کے بعد مجھے جناح ہسپتال لے جایا گیا اور میں وہاں چند گھنٹوں کے لیے داخل رہا۔ ایک ڈاکٹر میرے بازو سے خون کا نمونہ لینے کے لیے آیا۔ چند ہی منٹ بعد، اس نے مجھ سے سوال پوچھا ''کیا تم شراب پیتے ہو؟'' وہ اردو بول رہا تھا لیکن اس کے لہجے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ سندھی ہے۔ اس لیے میں نے سندھی میں جواب دیا اور اسے بتایا کہ میں شراب نہیں پیتا۔ پھر میں نے پوچھا، ''کیا تم سندھی ہو؟'' ڈاکٹر نے جواب دیا، ''تم میرے بھائی ہو...... مجھے کہا گیا ہے کہ تمہیں ایک غلط مقدمہ میں ملوث کر دوں اور یہ تصدیق کر دوں کہ تمہارے خون میں الکوحل کی علامات پائی گئی ہیں۔'' ڈاکٹر کو یہ رپورٹ بنانے کی ہدایت کی گئی تھی کہ تقریباً ایک بجے دوپہر مجھے ہسپتال لایا گیا تو

میں شراب کے نشے میں دھت تھا گویا صبح سے اب تک جب میرے گھر کی تلاشی لی جارہی تھی تو میں پیتا ہی رہا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ جونیجو اور اس کے سیکریٹری اقبال کے دفتر سے ہی کہا جارہا تھا۔ لیکن اس اچھے ڈاکٹر نے جھوٹ بولنے سے انکار کر دیا اور یوں مجھے امتناعی قوانین کی خلاف ورزی کا مرتکب نہیں ٹھہرایا جاسکا جن کا اطلاق مسلمانوں پر ہوتا تھا۔

ہسپتال سے ہی مجھے ایف آئی اے کے دفتر واقع کوئنز روڈ لے جایا گیا اور مجھے وہاں دو دن تک نظر بند رکھا گیا۔ میرے بھائی کو بھی مشروب کی ایک بوتل کے معاملے میں گرفتار کر کے یہاں لایا گیا۔ مجھے اکبر کے متعلق بہت افسوس ہوا۔ اسے اس لیے سزا دی جارہی تھی کہ وہ میرا بھائی تھا۔ حالانکہ وہ نہیں بلکہ میں حکومت کا ہدف تھا۔ بہرحال ایف آئی اے والے غلطی پر تھے۔ قانون کے مطابق اگر آپ مسلمان ہیں تو بھی الکوحل کی موجودگی کوئی جرم نہیں بلکہ صرف شراب نوشی ہی جرم تھی۔ یوں اکبر کی گرفتاری غلط تھی۔ میں نے افسر سے کہا کہ مشروب کی بوتل کی موجودگی کا الزام میرے خلاف عائد کر دیا جائے اور جس طرح میرے خلاف پہلے ہی بہت زیادہ الزامات عائد کیے گئے ہیں، ان میں ایک اور الزام کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔ اسی دوران اکبر کو گھر واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔ تاہم افسر نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ اس نے کہا، ''ہم یہ نہیں کر سکتے، تمہارے بھائی کے خلاف مقدمہ پہلے ہی درج ہو چکا ہے، ہم اسے واپس نہیں لے سکتے۔'' میں نے ضمانت کے لیے درخواست دی کیوں کہ جن جرائم کا مجھے مرتکب ٹھہرایا گیا تھا، وہ قابل ضمانت تھے۔ جج کو حکومت کی طرف سے میری درخواست مسترد کرنے کے لیے کہا گیا تھا اور اس نے یہی کچھ کیا جس کے نتیجے میں مجھے باقاعدہ جیل بھیجا جانا تھا۔ جب میں نے اپنے وکیل سے کہا، ''مجھ پر یہی رحم کیا گیا ہے کہ مجھے ہتھکڑی نہیں لگائی گئی۔'' تو میرے کچھ دوستوں نے جج پر کسی نہ کسی طرح دباؤ ڈالا اور اس سے نظر ثانی کرنے کی درخواست کی۔ اس نے یہ درخواست قبول کر لی اور نظر ثانی کی ایک اپیل کے بعد ضمانت کی منسوخی کا فیصلہ واپس لے لیا۔ اب میں گھر جانے کے لیے آزاد تھا اور جب میں گھر پہنچا تو میری بیوی، بچوں، بہنوں اور والدہ نے استقبال کیا۔ جب میں اپنی والدہ کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے بیٹھا، ایک سینئر سیاست دان کا فون آیا۔ الٰہی

بخش سومرو میرے پرانے دوست تھے اوران کی آواز سے پریشانی واضح تھی۔ ''تم کہاں ہو؟ فوراً کراچی سے باہر چلے جاؤ! وہ تمہیں دوبارگرفتار کرنا چاہتے ہیں، وہ ایم پی او کے تحت تمہارے خلاف ایک اور مقدمہ دائر کررہے ہیں۔'' پھراس نے جلدی سے فون بند کردیا۔ میں گنگ رہ گیا۔ایم پی او maintenance of public order کامخفف ہے۔ یہ ایک ایسی قانونی دفعہ ہے جواس وقت استعمال کی جاتی جب ایک شخص معاشرے اورعمومی امن وامان کے لیے خطرہ ثابت ہوتا۔ ایم پی او کی شقوں کے تحت گرفتاری سے مراد یہ تھی کہ میں 90 دن جیل میں گزارتا اوراس دوران ضمانت کی درخواست دائرکرنے کی بھی اجازت نہ ہوتی۔ مجھے معلوم تھا کہ پولیس کی تحویل میں کیا ہوتا ہے......اذیت رسانی، جبر، تشدد......کوئی بھی چیز ممکن تھی۔

میں نے فوراً ہی گھر چھوڑدیا اورکراچی کے مضافات میں واقع ایک دوست کے گھر رات بسرکی۔ اگلی صبح میں ہوائی جہاز کے ذریعے اسلام آباد چلا گیا جس کی ٹکٹ کسی اور نام سے لی گئی تھی۔ اس امکان کے پیش نظرکہ میں اسلام آباد میں اپنے ہوٹل آجاتا، حکام نے پولیس کے سپاہیوں کا دستہ وہاں بھیج دیا تھا۔ میں ہوٹل نہیں گیا اوراپنے ایک کاروباری دوست مرحوم آصف علی کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ ملک بھرمیں میری تلاش کا سلسلہ جاری ہے جیسے مجھے غدار یاعوام کادشمن قراردیے دیا گیا ہو۔ یہ نہایت ہی جنونی صورت حال تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے اسلام آباد میں کسی سینئرشخص سے رابطہ کرنا چاہیے۔ میں وزیرداخلہ اسلم خٹک کی رہائش گاہ پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی اسے بہت صدمہ ہوااورکہنے لگا: ''تم یہاں کیاکررہے ہو؟ میں نے تمہاری ایم پی او کی فائل پردستخط کردیے ہیں۔'' ایک مشترکہ دوست کے ذریعے میں نے جونیجو اور جنرل ضیا کو یہ پیغام بھیجا کہ جوکچھ میرے ساتھ ہورہا ہے، وہ قطعی طورپرناانصافی ہے۔ انہوں نے مجھ سے ملاقات یا مداخلت کرنے سے انکارکردیا۔ تین دن بعد میں نے اپنے ہوٹل میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن وہاں پولیس کے سپاہی تعینات تھے اورمیں وہاں سے کھسک گیا۔ میں اسلام آباد کے جڑواں شہرراولپنڈی میں ایک دوست کے گھر چلا گیا، نئے کپڑوں کے علاوہ اپنے زیراستعمال ادویات خریدیں اور

دیہی پنجاب میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے ملک میں غائب ہو گیا۔ اب مجھے مزید کوئی تدبیر نہیں سوجھ رہی تھی۔ بالآخر مسلم لیگ کے ایک ممتاز رہنما حبیب اللہ، جو ضیاالحق اور جونیجو دونوں کے علاوہ مجھ سے بھی قریب تھے، انہوں نے ایک تدبیر بتائی۔ انہوں نے مجھے پیغام بھجوایا کہ میں پیر پگارا سید شاہ مردان شاہ دوئم سے مداخلت کی درخواست کروں۔ وہ ساتویں پیر پگارا تھے جو 2012ء کو اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے اور ان کی جگہ ان کے بیٹے آٹھویں اور موجودہ پیر پگارا نے گدی سنبھالی۔ پیر پگارا ایک قابل احترام مذہبی اور سماجی رہنما اور انتہائی جانی پہچانی پاکستانی شخصیت تھے۔ وہ صوفی مسلمانوں، حروں کے روحانی پیشوا تھے اور ان کی اخلاقی سند دیگر وجوہ کے علاوہ اس حقیقت میں بھی مضمر تھی کہ ان کے والد کو استعمار مخالف جدوجہد کے دوران انگریزوں نے پھانسی دے دی تھی۔ حبیب اللہ نے کہا، ''اگر وہ مداخلت کرنے پر تیار ہو گئے تو ممکن ہے کہ جنرل ضیا کا رویہ کچھ نرم ہو جائے۔'' ہماری ملاقات لاہور میں حبیب اللہ کے گھر پر ہوئی اور زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب مجھے پیر پگارا سے مخاطب ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ فوراً ہی اصل موضوع پر آ گئے۔ ''تو کیا تم نے اس لڑکی (بینظیر) کو رقم دی ہے؟''

''نہیں، پیر صاحب، بالکل نہیں!''

''لیکن پیار علی الانہ کے ساتھ تمہاری گفتگو کا کیا مطلب لیا جائے......؟''

میں نے انہیں غلام علی الانہ کے چھوڑے ہوئے اس ٹرسٹ فنڈ سمیت تمام پس منظر سے آگاہ کیا۔ ''میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے بینظیر یا اس کی پارٹی کے کسی فرد کو سیاسی چندہ نہیں دیا۔ ملاقات تو دور کی بات ہے، میں نے اسے (بینظیر کو) دیکھا بھی نہیں۔ یہ سب کچھ تمباکو کی صنعت کے میرے کاروباری حریفوں کی سازش ہے۔''

پیر پگارا نے اپنا سر ہلایا اور ایک لمحہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر انہوں نے نہایت ہی مبہم انداز میں کہا، ''ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔''

چند دن بعد، مجھے پیغام ملا کہ میں کراچی واپس جا سکتا ہوں۔ پیر صاحب نے جونیجو اور ضیاالحق سے بات کی تھی۔ ایم پی او کے احکامات واپس لے لیے گئے لیکن ایکسائز اور دیگر

مقدمات بدستور موجود تھے۔ روحانی پیشوا نے مجھے بچا لیا تھا۔ میں واپس کراچی چلا گیا۔ لندن اور لاس اینجلس جانے سے قبل میں نے وہاں چند دن قیام کیا اور پھر ملک سے باہر چلا گیا کیوں کہ میری ایک بیٹی کی سرجری تھی۔ جب وہ صحت یاب ہوگئی تو ہم ہوائی جہاز کے ذریعے پاکستان واپس آ گئے۔ اپنے ہی وطن میں مفرور بن جانے کے تجربے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اپنی اس حالت سے سنبھلنے میں مجھے چند مہینے لگے اور تب ہی میں بے شمار قانونی مقدمات سے نمٹنے کے قابل ہو سکا۔ لیکن اب میں کم از کم نصف شب کو دروازے پر دستک ہونے اور پولیس وین میں دھکیل کر بٹھانے کے خطرے سے محفوظ ہو گیا تھا۔

اس واقعہ کے بعد کی صورت حال، نہایت ہی دلچسپ بلکہ مزاحیہ تھی۔ گھر پر چھاپے کے چند دن بعد بینظیر نے پیار علی الانہ سے کہا، ''وہ رقم کہاں ہے جو تم نے ہاشوانی سے وصول کی؟'' بینظیر نے مطالبہ کرتے ہوئے کہا، ''وہ رقم میرے یا پارٹی کے پاس کیوں نہیں پہنچی؟'' گویا بینظیر بھی حکومت کے پراپیگنڈا کا شکار ہوگئی تھیں۔

باب 7

موتیوں کی لڑی

جوں جوں ضیاالحق اور اس کے حاشیہ نشین میری مخالفت میں کمر بستہ ہو کر مجھے ہراساں کر رہے تھے، توں توں میرا کاروبار مسلسل ترقی کر رہا تھا۔ میں اب غیر منقولہ املاک کی تعمیر و ترقی کے کاروبار میں داخل ہو چکا تھا اور کراچی میں چند تجارتی اور خریداری مراکز تعمیر کرنے کے علاوہ دو کامیاب ہوٹل بھی چلا رہا تھا۔ اس کے علاوہ کانٹی نینٹل گرین کے نمائندہ کی حیثیت سے میں ابھی تک پاکستان سے بیرون ملک چاول بھی برآمد کر رہا تھا۔ چوں کہ نیشنلائزیشن کی پالیسی کے بعد نجی افراد کے درمیان خریداری اور فروخت کاری روک دی گئی تھی اس لیے مجھے حکومت کی تشکیل شدہ رائس کارپوریشن آف پاکستان کے ساتھ کانٹی نینٹل کے نمائندے کی حیثیت سے چاول خریدنے پڑتے۔ میں کانٹی نینٹل اور بیرون ملک اپنے گاہکوں کی جانب سے کاغذات تیار کرتا، چاول اپنے تحویل لیتا اور انہیں اپنے گاہکوں کو بھجوا دیتا۔ اس کے عوض کانٹی نینٹل اور دوسری کمپنیاں مجھے کمیشن ادا کیا کرتیں۔

چوں کہ مجھے ڈالروں میں ادائیگی کی جا رہی تھی اور میں پاکستان کے لیے زرِمبادلہ کما رہا تھا اس لیے مجھے بیرون ملک کچھ رقم رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ رقم میں اپنے سفری اخراجات اور بعد ازاں برطانیہ اور امریکہ میں اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے استعمال کیا کرتا۔ دو ہوٹلوں کی تعمیر کے تجربے نے میری پیاس تو بجھا دی تھی لیکن یہی شعبہ تھا جس میں مجھے مزید کچھ کرنے کی خواہش تھی۔ ایم پی او کی کہانی جسے میں گزشتہ باب میں بیان کر چکا ہوں

اس سے ایک سال پہلے 1985ء میں مجھے ایک موقع ملا۔حکومت نے پاکستان سروسز لمیٹڈ (PSL) کی نجکاری کا فیصلہ کیا جس کی ملکیت میں چار ہوٹل کراچی، لاہور، راولپنڈی اور پشاور میں کام کر رہے تھے۔ یہ چاروں ہوٹل دہائیوں قبل حکومت کی طرف سے تعمیر کیے گئے تھے مگر مہمانداری کی صنعت سے قطعاً ناآشنا بیوروکریٹس نے انہیں تباہ کر دیا۔ یہ چاروں ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل گروپ کے زیر انتظام تھے۔اگرچہ ان کی شناخت انٹرکانٹی نینٹل کے نشان سے کی جاتی تھی لیکن یہ عالمی معیار کے پُرآسائش یا تجارتی ہوٹلوں کے زمرے میں نہیں آتے تھے۔عوامی رقم کو مزید ضائع کرنے کے بجائے کچھ ٹیکنوکریٹس نے حکومت کو مشورہ دیا کہ مکمل کمپنی ہی فروخت کر دی جائے اور ان ہوٹلوں کے انتظام وانصرام کی خاطر انہیں کسی نجی کاروباری گروپ کو کرائے پر دے دیا جائے۔ پاکستان بینکنگ کونسل کو پیشکشیں طلب کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔میں نے بھی اپنی طرف سے پیشکش جمع کرائی اور ہوٹلنگ کی صنعت میں میرے تجربے کے علاوہ میری مالی ساکھ کے باعث میری پیشکش بھی حتمی پیشکشوں میں شامل کر لی گئی۔یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کراچی میں میرا ہوٹل (موجودہ میریٹ ہوٹل) حکومت کے زیر انتظام ہوٹل کو مات دے رہا تھا اور واضح طور پر انٹرکانٹی نینٹل سے کہیں زیادہ مقبول تھا۔

جب میں نے منتخب شدہ حتمی پیشکشوں کا جائزہ لیا تو مجھے معلوم ہوا کہ دو افراد میرے ممکنہ حریف ہو سکتے ہیں۔ پہلا شخص میر افضل خان تھا جو شمال مغربی سرحدی صوبہ (اب خیبر پختونخوا) کا ایک دولت مند اور بارسوخ شخص تھا اور پیشہ ورانہ ہوٹل چلانے والے افراد کے ایک کنسورشیم کا سربراہ تھا۔میر افضل خان آسانی سے قابو میں آنے والا شخص نہیں تھا۔یہ وہ شخص تھا جو 1990ء کی دہائی میں اپنے صوبے کا وزیر اعلیٰ بن گیا۔دوسرا شخص ڈان گروپ کا محمود عبداللہ ہارون تھا جو پاکستان کے انتہائی بارسوخ میڈیا گروپ کا چیئرمین تھا۔اس کا تعلق ایک قدیم اور ممتاز گھرانے سے تھا اور وہ عوامی زندگی میں بھی بہت فعال تھا۔اس نے وزیر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی تھیں۔جب پیشکشیں کھل رہی تھی تو وہ اس وقت بھی وزیر تھا اور بعد ازاں اسے سندھ کا گورنر بنایا گیا۔کہا جاتا ہے کہ اس نے دبئی کے ایک مشہور

کاروباری گروپ گلاداری برادرز کی معاونت کی تھی۔ گلاداری برادرز اور ہارون کے درمیان پرانی یاد اللہ تھی اور انہوں نے باہمی اشتراک عمل سے 1978ء میں اخبار 'خلیج ٹائمز' نکالا تھا۔ سرمایہ کاروں کی حیثیت سے گلاداری برادرز پہلے ہی PSL کے 17 فیصد حصص کے مالک تھے۔ اگر ہارون اور اس کے شراکت دار 51 فیصد کا خطرہ مول لینے کے بجائے حکومت کی مذاکراتی ٹیم کے اصرار پر 34 فیصد پر بھی راضی ہو جاتے تو گلاداری برادرز کے حمایت یافتہ بولی دینے والے کو PSL کا انتظام وانصرام دے دیا جاتا۔ اس قسم کے مشکل حریفوں کے خلاف یہ ایک مشکل لڑائی ہوتی۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ جو سرکاری ملازم انتہائی اعلیٰ سطحی نجکاری کے نگران مقرر ہوئے تھے، وہ انتہائی ایماندار اور بے داغ کردار کے مالک تھے۔ غلام اسحٰق خان ایک انتہائی تجربہ کار سول سرونٹ اور وزیر خزانہ تھے جنہوں نے 1988ء میں جنرل ضیا کے بعد صدر پاکستان کا عہدہ سنبھالا۔ وہ انتہائی سخت گیر اور بے لچک تو تھے لیکن انتہائی ایماندار بھی تھے۔ وہ قواعد وضوابط کے پابند تھے اور سیاسی مفادات کے لیے قواعد کو تبدیل کرتے اور نہ ہی ان سے ناجائز فائدہ اٹھاتے۔ ان کے ماتحت افسر ایچ یو بیگ سیکریٹری خزانہ تھے اور وہ بھی پاکستان کے ایک ایماندار، باصلاحیت اور بہترین سرکاری ملازم تھے۔

جب ان پیشکشوں کا جائزہ لیا گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ جنگ تین بڑے خواہش مندوں کے درمیان تھی۔ بینکنگ کونسل آف پاکستان نے ہم تینوں کو معاملات طے کرنے کراچی میں دوپہر کے کھانے پر بلایا تاکہ ہم کسی حتمی معاہدے پر پہنچنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کر سکیں۔ اس وقت تک میں نے اپنے کارڈ اپنے سینے سے لگا رکھے تھے۔ میں نے دوپہر کے کھانے پر ملاقات سے قبل ہی اپنی حکمت عملی طے کر لی تھی جس کے متعلق مجھے علم تھا کہ اہم ہوگی۔ اس قسم کے مسابقتی مذاکرات تاش کی بازی کے مانند ہوتے ہیں۔ آپ کا اہم ہتھیار بے رحم رازداری ہوتی ہے تاکہ آپ کے مخالفین کو یہ معلوم نہ ہو کہ آپ کون سا پتا پھینکنے والے ہیں۔ اگر آپ اپنے مخالف کو احمق بنا سکیں کہ آپ اس سے کمزور ہیں تو یہ سب سے بہتر ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سارا کچھ نہایت ہی ہوشیاری اور نفاست سے کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ میں کوئی بے لچک بولی دہندہ

نہیں اور اگر مجھے یہ لوگ راضی کر لیں یا ان بولی دہندوں میں کوئی ایک مجھے مناسب رقم ادا کر دے تو میں اس مقابلے سے دستبردار ہو سکتا ہوں۔ میں نے ایک بڑی چال چلی تھی۔ اس تصور کو تقویت بخشنے کے لیے، میری ایک کمپنی گلاداری برادرز کے زیر ملکیت دبئی بینک پہنچی اور اپنے اکاؤنٹ میں سے کچھ اضافی رقم طلب کی۔ یہ خبر کاروباری حلقے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور بہت سوں کو یقین ہو گیا کہ مجھے روپوں کی کمی کا سامنا ہے۔ یہ وہی منظر نامہ تھا جو میں دکھانا چاہتا تھا۔ کراچی میں اس فیصلہ کن اور اہم دن ہر بولی دہندہ کو بینکنگ کونسل کی ٹیم کے ساتھ بالمشافہ ملاقات کے لیے طلب کیا گیا جو نجکاری کے عمل کی نگرانی کر رہی تھی۔ مجھے پہلے بلایا گیا لیکن میں نے کہا کہ یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ میں اپنے سینئرز سے پہلے جاؤں، لہٰذا مجھے بعد میں بلایا جائے۔ یوں سب سے پہلے میر افضل خان کو بلایا گیا۔ وہ پندرہ منٹ کے اندر ہی اس عالم میں باہر آ گیا کہ اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔ میں نے استفسار کیا، ''کیا میں تمہیں مبارکباد پیش کروں؟'' اس نے منہ بناتے ہوئے کہا، ''نہیں، یہ بہت مشکل ہے۔'' اس کے بعد ڈان گروپ کا نمائندہ خواجہ عبدالرحمن اندر گیا۔ اس نے کمرۂ ملاقات میں تقریباً ایک گھنٹہ صرف کیا۔ جب وہ باہر آیا تو غصے سے اس کا چہرہ سرخ تھا۔ اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ اس نے کمرے کے اندر ایک سخت لڑائی لڑی ہے اور تلخ دلائل کا تبادلہ ہوا ہے۔ وہ ایک بھی لفظ کہے بغیر طوفانی انداز میں باہر نکل گیا۔

اب میری باری تھی۔ میں نے بیٹھتے ہی اپنی بولی سے آگاہ کر دیا۔ وہ تمام پیشکشیں جو سربمہر لفافوں میں بینکنگ کونسل کے روبرو پیش کی گئی تھیں، بہت ہی کم تھیں اور یوں قبول نہیں کی جا سکتی تھیں۔ میں نے کسی جذباتی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا، نہایت ہی پُرسکون انداز میں کہا کہ کراچی ہوٹل کی شہرت یہ ہے کہ ''یہاں مہمانوں سے زیادہ لال بیگ ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا، ''یہ پاکستان کا فخر ہو سکتا تھا لیکن اسے زمین بوس کر دیا گیا ہے، اس کا مالک نہیں بلکہ اس کا انتظام کار راتھر کانٹی نینٹل مینجمنٹ فیس کی صورت میں رقم کما رہا ہے۔ کیا آپ پاکستان کا امیج بحال نہیں کرنا چاہتے؟'' مذاکرات کاروں نے موضوع بدل دیا۔ مجھے بتایا گیا، ''ہم اس سے زیادہ چاہتے ہیں جو تم نے پیشکش کی ہے۔'' میں نے نہایت سخت

نظروں سے مذاکراتی ٹیم کے سربراہ کو دیکھا اور کہا، ''میں ایک سخت سوال کرنا چاہتا ہوں، براہ کرم ناراض نہ ہوئیے۔ کیا اس کمیٹی کو ہوٹل فروخت کرنے کا اختیار ہے یا پھر یہ کمیٹی محض سودا بازی کرنا چاہتی ہے؟'' ...... ''تمہارا کیا مطلب ہے؟'' چیئر مین نے لال پیلا ہوتے ہوئے کہا، ''براہ کرم یہاں سے چلے جاؤ، ہم تمہیں بلائیں گے۔'' میں پلک جھپکنے سے پہلے باہر نکل آیا۔

میں نے اس ملاقات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مذاکراتی ٹیم، نہایت اضطراب کے عالم میں ہے اس لیے انتہائی سخت رویہ اپنائے ہوئے ہے۔ ایک بولی دہندہ یہ کہتے ہوئے باہر چلا گیا کہ یہ نیلام ''بہت ہی مشکل ہے۔'' دوسرا بولی دہندہ یہاں سے جاتے ہوئے بہت غصے میں تھا۔ صرف میں ہی باقی رہ گیا تھا۔ یہ ایک اہم ذمہ داری تھی اور بینکنگ کونسل آف پاکستان بہرحال اسے نہایت کامیابی سے نبھانے کی خواہاں تھی۔ اگرچہ انہوں نے میرے ساتھ بھی انتہائی سخت رویہ اپنایا تھا لیکن میں بتا سکتا ہوں کہ وہ متفکر اور مضطرب تھے۔ میں تاش کا کھیل ان سے کہیں بہتر انداز میں کھیل رہا تھا۔ 30 منٹ بعد انہوں نے مجھے ملاقاتی کمرے میں طلب کیا اور کہا کہ انہوں نے اسلام آباد میں ہدایات کے لیے وزارتِ خزانہ کو فون کیا ہے۔ غلام اسحٰق خان نے تصدیق کی ہے کہ بینکنگ کونسل کی ٹیم کو معاہدے کو حتمی شکل دینے اور PSL کو عملی طور پر فروخت کرنے کا مکمل اختیار ہے۔ میں نے کہا، ''بہت خوب، اس لیے اب ہمیں چاہیے کہ ہم ایک قیمت پر باہم رضامند ہو جائیں اور سودا طے کر لیں۔'' ہم نے سودا بازی شروع کی اور ایک ایسی قیمت طے کر لی جو میری ابتدائی بولی سے بہت زیادہ اور بینکنگ کونسل کی خواہش کے بہت قریب تھی۔ مجھے بولی کے کاغذات کے ساتھ جمع کروائی گئی رقم کے علاوہ مزید پچاس لاکھ روپے کی رقم جمع کروانے کے لیے کہا گیا۔ میں نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا، ''میں ابھی جمع کروا دوں گا لیکن مجھے قبولیت کی چٹھی (Acceptance Letter) فوری طور پر درکار ہے۔'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور میں نے اپنے دفتر کی طرف دوڑ لگائی جو مختصر پیدل راستے کی مسافت پر تھا۔ میں نے بینک آف امریکہ کی چیک بک لی، رقم لکھی اور چیک پر دستخط کر دیے اور پھر انہی قدموں پر چند منٹوں کے اندر بینکنگ

کونسل کے دفتر پہنچ گیا۔ چیک ان کے حوالے کرتے ہوئے میں نے قبولیت کی چٹھی (Acceptance Letter) کے متعلق استفسار کیا۔ مجھے بتایا گیا: ''کل تشریف لائیں، ہم تیار رکھیں گے۔'' میرا لہجہ نہایت شائستہ لیکن پُر زور تھا۔ ''مجھے یہ لیٹر آج ہی چاہیے، ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا۔'' بینکنگ کونسل کے چیئرمین نے کہا، ''ٹھیک ہے، ہمیں ایک گھنٹہ دو۔'' ایک گھنٹے بعد مجھے وہ چٹھی مل گئی جس میں میری پیشکش کی قبولیت اور PSL کے نئے مالک کی حیثیت سے میرا ذکر کیا گیا تھا بشرطیکہ میں بقایا رقوم ادا کردوں۔ میں معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا واپس اپنے دفتر چلا گیا لیکن مجھے معلوم تھا کہ چند ہی گھنٹوں کے اندر ایک دوسری جنگ شروع ہوگی۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اگلی صبح کراچی اور اسلام آباد میں انتہائی سراسیمگی کا عالم تھا۔ ڈان گروپ عدالت میں چلا گیا لیکن عدالت نے معاہدے کو کالعدم قرار دینے یا اس میں مداخلت کرنے سے انکار کردیا۔ میں کسی بھی طرح ضیاالحق کی پسندیدہ شخصیت نہیں تھا اور ہارون اس وقت وفاقی وزیر تھا۔ وہ بھاگم بھاگ ضیاالحق کے پاس گیا، اس سے شکایت کی اور مطالبہ کیا کہ مجھے ہوٹلوں کی فروخت روکنے کے لیے مداخلت کی جائے۔ ضیاالحق بذات خود انتہائی غصے میں تھا۔ اس نے غلام اسحٰق خان کو طلب کیا۔ وزیر خزانہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا اور اس نے نہ صرف اس شفاف معاہدے کا دفاع کیا بلکہ یہ واضح کردیا کہ وہ اس وجہ سے معاہدے کو منسوخ نہیں کرسکتا کہ کسی شخص کو صدرالدین ہاشوانی کا چہرہ پسند نہیں۔ جنرل نے یہ جانتے ہوئے مزید کچھ نہیں کہا کہ غلام اسحٰق کو اس معاہدے کی منسوخی کے متعلق کہنا بے کار ہے کیوں کہ وہ چیک اینڈ بیلنس کے ایک ایسے اعلیٰ اور بعید از قیاس نظام کا پیروکار ہے جو پاکستان میں فوجی آمروں کے لیے بھی خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ تب ضیاالحق نے اے یو بیگ کو طلب کیا اور اسے کہا کہ غلام اسحٰق خان کے علم میں لائے بغیر کراچی جائے اور چھان بین کرے کہ کن حالات میں یہ معاہدہ طے پایا۔ بیگ، بینکنگ کونسل کے دفتر پہنچا اور معاہدے کی تمام دستاویزات کو اپنی تحویل میں لے کر ان کا جائزہ لیا اور واپس اسلام آباد پہنچ گیا۔ چند دن بعد اس نے اپنی رپورٹ پیش کردی جس میں کہا گیا تھا کہ معاہدہ بلاشبہ

صاف وشفاف ہے۔ اس کی اطلاع ضیاالحق کو دے دی گئی۔ مجھے بقایارقم ادا کرنے کے لیے کہا گیا اور PSL کے حصص میرے نام منتقل کردیے گئے۔ اب میں اپنے آبائی شہر کراچی میں دو ہوٹلوں سمیت چھے ہوٹلوں کا مالک بن چکا تھا۔ میری زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہو چکا تھا۔

ہوٹلوں کو اپنی تحویل میں لینے کے بعد میرے لیے یہ ثابت کرنے کا موقع تھا کہ میں ان کی گزشتہ شان وشوکت بحال کرسکتا ہوں۔ ان چاروں ہوٹلوں کی انتظام کاری کا ٹھیکہ انٹر کانٹی نینٹل ہی کے پاس تھا۔ جب بھی ٹھیکہ ختم ہوتا، وہ سفارت خانے اور سیاسی دوستوں کے ذریعے پاکستانی حکومت کا بازو مروڑ کر یقینی طور پر مزید منفعت بخش شرائط پر اس ٹھیکے کی تجدید میں کامیاب ہو جاتے۔ جب میں نے P S L کا انتظام سنبھالا تو معاہدے کی تجدید کے لیے انٹر کانٹی نینٹل نے مجھ سے رابطہ کیا۔ میں نے ایک مشکل گیند کھیلی۔ میں نے انٹر کانٹی نینٹل کے مقامی نمائندہ کو واضح طور پر بتایا۔ ''نہیں، اب انتظامی ٹھیکہ نہیں۔ جس طرح میں نے اپنے دوسرے ہوٹلوں کے لیے ہالیڈے سے ان کی فرنچائز لی ہوئی ہے، اسی طرح مجھے انٹر کانٹی نینٹل کی فرنچائز چاہیے۔'' میرا جواب سن کر وہ نمائندہ بھونچکا رہ گیا اور مزید ہدایات کے لیے اپنے بڑوں کو لکھا۔ چند دن بعد انٹر کانٹی نینٹل کے علاقائی (ایشیا پیسفک) کے ڈائریکٹر کن روفی (Ken Roofe)، ہونولولو سے ہوائی جہاز کے ذریعے پاکستان آ گیا۔ ہماری ملاقات مختصر اور دوٹوک تھی۔ میں نے فرنچائز پر اصرار کیا اور بتایا کہ اس کے بغیر کوئی معاہدہ نہیں ہوگا۔ روفی نے کہا، '' مجھے افسوس ہے کہ ہم تمھیں فرنچائز نہیں دیں گے، ہم فرنچائز نہیں دیتے۔'' وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ ''تم نے بمبئی میں انٹر کانٹی نینٹل کی فرنچائز تاج گروپ کو دی ہوئی ہے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''ہالیڈے ان ہوٹل پاکستان میں تمہارے انٹر کانٹی نینٹل سے کہیں زیادہ اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کررہے ہیں، یہی وجہ ہے میرے ہوٹلوں نے مسابقت کی فضا قائم کی اور تمہاری سرگرمیوں میں اس قدر رخنہ ڈالا کہ PSL کو نقصان ہوا اور حکومت اسے فروخت کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اور اب تم مجھے کہتے ہو کہ میں تمہاری فرنچائز حاصل کرنے کے لیے اہل نہیں؟'' روفی کے پاس حقیقتاً کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ وہ نیویارک میں

صدر دفتر سے رابطہ کرے گا۔ معاملے پر غور کرنے کے لیے بورڈ کا اجلاس نیو یارک میں ہوا اور بالآخر فیصلہ کیا کہ معاہدے کی تجدید کروائی جائے یا پھر اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ دو دن بعد روفی نے مجھے بتایا، ''اگر انتظام کاری کے لیے ہمارے معاہدے کی تم تجدید نہیں کرو گے، تو ہم 30 دن کے اندر اپنا جھنڈا واپس لے لیں گے۔'' وہ مجھے توڑنے کی کوشش کر رہے تھے اور انہیں یہ اعتماد تھا کہ مجھ میں چار ہوٹلوں کو تیس دن کے اندر چلانے کے لیے سمجھ بوجھ اور حوصلہ نہیں۔ تاہم، اس کے جواب میں، میں نے روفی کو اپنے گھر پر رات کے کھانے پر مدعو کر لیا۔

اس وقت تک میں کلفٹن باتھ آئی لینڈ پر ایک نئے گھر میں منتقل ہو چکا تھا۔ میں 1976ء میں یہاں منتقل ہوا اور اپنے خوابوں کا ایک گھر تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنے گھر کے لیے سینیٹری کا درآمد شدہ سامان خریدا تو مجھے علم ہوا کہ یہ سامان ہوٹل مالکان نے اس برآمدی لائسنس کا غلط استعمال کرتے ہوئے منگوایا ہے جو انہیں اپنے ہوٹلوں کی سجاوٹ کے لیے دیا گیا تھا۔ بہت سے لوگ حیران ہوئے کہ میں نے اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا اور میں نے اپنے کراچی اور اسلام آباد کے ہوٹلوں کے لیے درآمد کیا گیا سامان اپنے نجی استعمال کے لیے کیوں نہ رکھ لیا حالانکہ اس وقت میں ہوٹلوں کے ساتھ ساتھ اپنے گھر کی تعمیر کی منصوبہ بندی بھی کر رہا تھا۔ یہ گھر جہاں روفی اور اس کے ساتھیوں کو مدعو کیا گیا، 2014ء میں فروخت کر دیا۔ میں نے انٹر کانٹی نینٹل کے وفد کے اعزاز میں بہت اچھا کھانا، لذیذ خول دار مچھلی اور بہترین سمندری غذائیں پیش کیں۔ روانگی کے وقت روفی نے استفسار کیا، ''ہمارے بورڈ کے فیصلے کا تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔'' میں نے ایک کشادہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ''اچھا، وہ دراصل میں چاہتا تھا تم لذیذ کھانے سے لطف اندوز ہو۔ ٹھیک ہے، تیس دن کے اندر میں تمہیں تمہارا جھنڈا واپس کر دوں گا، شب بخیر!'' اس کا منہ لٹک گیا۔ یہ وہ آخری چیز تھی جس کی اسے توقع ہو سکتی تھی۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں نے پہلے ہی ہوٹلوں کے متعلق چھان بین شروع کر دی ہے۔ یہ محض تیس دن میں نام واپس کرنے کا کام نہیں تھا بلکہ مجھے 468 چیزیں تبدیل کرنا تھیں جن میں ہوٹلوں کے سامنے لگے نام، برتن، کانٹے، چھریاں اور چمچے، جن پر

انٹر کانٹی نینٹل کندہ تھا...... اور پھر سٹیشنری کا سامان، جن پر انٹر کانٹی نینٹل کا نشان بنا ہوا تھا۔ قصہ مختصر یہ مشق اگلے ہی روز شروع ہوگئی۔

پہلے تو ہم نے ان تمام چیزوں کے لیے ادائیگی کر دی جو ابھی تک انٹر کانٹی نینٹل کو دینا تھیں۔ پھر میں نے اپنے ہوٹلوں کے سلسلے کے لیے ایک نام تلاش کرنے کا سوچا۔ کافی سوچ بچار کے بعد کسی نہ کسی طرح میں نے ایک نام کا فیصلہ کر ہی لیا...... پرل کانٹی نینٹل ہوٹلز...... بلکہ میں نے پیشہ ورانہ تقاضوں کے پیش نظر اس کے متعلق مشیروں اور اشتہاری اداروں سے بھی پوچھا اور پھر میں نے ہوٹل کے لیے درکار چیزیں خریدنے کے لیے کہہ دیا۔ چوں کہ ان دنوں ہوٹلنگ کی صنعت کے لیے ماہر پاکستانی افراد اور ہوٹل کی انتظام کاری سکھانے والے اداروں اور نصاب کی کمی تھی اس لیے میں نے جنرل منیجر کے عہدے کے لیے بیرون ملک سے موزوں فرد تلاش کرنا شروع کیا۔ تیسویں دن، ہم نے انتہائی خوشی کے عالم میں انٹر کانٹی نینٹل کا جھنڈا اتار دیا اور نیا جھنڈا لگا دیا۔ اس ضمن میں ہر ہوٹل میں ایک بڑی تقریب منعقد ہوئی۔ انٹر کانٹی نینٹل کو خدا حافظ کہنے اور پرل کانٹی نینٹل یا پی سی کو خوش آمدید کہنے کی تقریب! ہمارے ہوٹلوں کے مستقل گاہکوں نے نہایت محبت کے عالم میں اسے مختصر نام 'پی سی' دیا...... جو اب اپنی منزل کی طرف گامزن ہو چکا تھا۔

انٹر کانٹی نینٹل کے ساتھ مینجمنٹ کے معاہدے کی بھاری فیس کی عدم ادائیگی ہمارے لیے رحمت کا باعث ہوئی کیوں کہ اس طرح ہمیں ایک بھاری بھرکم رقم کی بچت ہوئی۔ چوں کہ ہم نے ہوٹل کے غیر ضروری اخراجات کو یکسر ترک کر دیا تھا۔ اس اقدام کے باعث ہمیں اس قدر نقدی دستیاب ہوگئی کہ ہم اضافی مالی وسائل استعمال کرنے کے علاوہ اپنے ہوٹلوں کو مزید جدید بنا سکیں۔ ہم نے ان متوقع اچھے نئے ہوٹلوں کو دوبارہ تعمیر کرنا شروع کیا جو تقریباً زمین بوس ہو چکے تھے۔ میں نے نئے لوگ بھرتی کیے اور ہر ہوٹل میں موجود مزدور یونین سے میں نے انتہائی حکمت کے ساتھ معاملات طے کیے۔ میری خواہش تھی کہ پرانے ملازمین اپنے نئے مالکان کو نہ صرف اپنے شراکت دار اور دوستوں کی حیثیت سے دیکھیں بلکہ انہیں پیشہ ورانہ منیجروں کا درجہ بھی دیں اور ان سے قابلیت، لیاقت اور معیار کا بھی

تقاضا کریں۔ یہ سب کچھ نظم وضبط اور خوش اخلاقی لانے ہی کے لیے تھا جو گاہکوں کی میز بانی پر مشتمل کاروبار اور گاہکوں کی زیادہ سے زیادہ طمانیت کے لیے نہایت لازمی اقدار تھیں۔ ملازمین کا اعتماد حاصل کرنے کی خاطر میں نے ہوٹل کے عملے کے ارکان کے لیے تربیتی پروگرام شروع کیے تاکہ انہیں بھی محسوس ہو کہ انہوں نے بھی کمپنی سے کچھ سیکھا۔

آہستہ آہستہ ہم نے منافع کمانا شروع کر دیا۔ 300 کمروں پر مشتمل کراچی ہوٹل، ان سب ہوٹلوں میں سے بڑا تھا جو ہم نے خریدے تھے۔ لاہور اور راولپنڈی کے ہوٹلوں میں دو دو سو کمرے تھے جبکہ پرل کانٹی نینٹل پشاور کا آغاز 150 کمروں سے ہوا۔ ان سب ہوٹلوں کو بہت حد تک وسیع کیا گیا۔ مثال کے طور پر پرل کانٹی نینٹل لاہور ہی کو لیجئے، ہم نے ایک نئی شاخ، Atrium Wing تعمیر کی اور 400 کمروں کی تعمیر کے باعث قابل استعمال جگہ تین گنا ہوگئی۔ ایک قابل افسوس حالت سے یہ ہوٹل اب ایک شاندار حیثیت اختیار کر چکا تھا اور اب اسے ایک حقیقی پنج تارہ شاندار اور پُرآسائش ہوٹل کے طور پر پہچانا جا رہا تھا۔ اولاد کی مانند میں اپنے ہوٹلوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر آپ مجھ سے استفسار کریں تو ایمانداری کی بات یہ ہے کہ پرل کانٹی نینٹل ہوٹل لاہور پاکستان کا بہترین ہوٹل ہے۔ دریں اثنا PSI کے حصول کے تقریباً تھوڑی دیر بعد 1980ء کی دہائی کے وسط میں، میں نے اسلام آباد میں ایک دوسری شاخ اسلام آباد (اب میریٹ) میں تعمیر کرنا شروع کی اور 300 کمروں کی گنجائش کے اس ہوٹل کی تعمیر جلد ہی مکمل ہوگئی۔ کراچی میں اپنے اصلی ہوٹل (اب یہ بھی میریٹ) میں، میں نے بہت سے بینکوئٹ ہالوں کے علاوہ باغِ جناح کے نیچے 600 کاروں کی گنجائش پر مشتمل زیرِ زمین گاڑیاں ٹھہرانے کی جگہ تعمیر کی جو آپ کو یاد ہوگا کہ ہوٹل کے قریب تھی۔

دونوں میریٹ ہوٹلز کے علاوہ چاروں پرل کانٹی نینٹل ہوٹل (جو اب ایک درجن کے قریب ہیں) بہت جلد مشہور ہو گئے۔ کراچی میریٹ کا ڈسکو کلب، شہر کی زندگی تھا جہاں ہر شام کو نوجوان اُمڈ آتے۔ 1983ء کی ایک شام......! مجھے یاد ہے کہ یہ جمعرات کا دن تھا، مجھے گھر پر رات ساڑھے گیارہ بجے جی ایم رولف بائر (Rolf Bauer) کی طرف سے ٹیلیفون

موصول ہوا۔ اس نے کہا، ''ڈسکو کلب میں ایک ہنگامہ برپا ہو چکا ہے، دو افراد اور ان کے گروہوں کے درمیان لڑائی ہو رہی ہے جو ایک دوسرے پر گولیاں برسا رہے ہیں، بے شمار نوجوان خواتین افراتفری کے عالم میں ادھر اُدھر بھاگ رہی ہیں۔ یہ صورت حال انتہائی پریشان کن ہے۔'' میں پریشان ہوگیا کہ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ صورتِ حال کو کنٹرول کرنے کے لیے کیا کیا جائے۔ یقینی طور پر اسے معلوم ہونا چاہیے کہ صورتِ حال پر کس طرح قابو پانا چاہیے؟ میں نے بھاری لہجے میں کہا، ''بائز تم جی ایم ہو، تمہارے پاس محافظوں کی ایک فوج ہے، بلیک بیلٹ تمہارے پاس ملازم ہیں، ان لوگوں کو پکڑواؤ اور اٹھا کر باہر پھینک دو، اگر ضرورت محسوس ہو تو انہیں ٹھڈے مار کر نکال باہر کرو۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس اعتماد کے ساتھ ٹیلیفون بند کر دیا کہ بائز میرے احکامات پر پورا عمل کرے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ کچھ ہی دیر میں یہ معاملہ اپنے ذہن سے نکالنے کے بعد میں سو گیا۔

اگلے دن تب میری آنکھ کھلی جب مجھے ایک چھوٹے سندھی جاگیردار اور ہوشیار سیاسی شخصیت حاکم علی زرداری کی کال آئی۔ اس کے ساتھ میری سرسری واقفیت تھی۔ اس نے دھاڑتے ہوئے کہا، ''یہ تم نے کیا کر دیا، تمہیں میرے بیٹے کے ساتھ یہ سلوک کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟'' یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گزشتہ شام ڈسکو کلب میں جن دو تند خو اشخاص کے درمیان تلخ کلامی ہوئی جو بالآخر بندوقوں کی لڑائی میں تبدیل ہوگئی، ان میں سے ایک حاکم علی زرداری کا بگڑا ہوا پلے بوائے بیٹا آصف علی زرداری اور دوسرا زہری خاندان کا ایک نوجوان شخص تھا جو ایک ممتاز بلوچی قبیلے کا سربراہ تھا۔ بائز نے باقاعدہ طور پر دونوں کو باہر پھینکوا دیا تھا اور محافظوں نے انہیں دو چار گھونسے بھی جڑ دیے تھے۔ اب میں بائز اور اس کی ٹیم کو نیچا نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ میں نے حاکم علی زرداری کو بتایا، ''اگر یہی تمہارے بیٹے کا کردار ہے تو پھر تم اسے گھر پر کیوں نہیں رکھتے؟ معاشرے میں انتشار پھیلانے کے لیے اسے بندوقوں کے ساتھ ہوٹلوں میں مت بھیجا کرو، خاص طور پر میرے ہوٹل میں۔ ہم اچھے لوگوں کے ساتھ بُرا سلوک نہیں کرتے، میں تو خاکروبوں کے ساتھ بھی مصافحہ کرتا ہوں۔''

انتہائی غصے اور کرختگی کے عالم میں ٹیلیفون بند کر دیا گیا۔ میں نے اپنے کندھے

جھٹکے اور دن بھر کی مصروفیات کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چار سال بعد بینظیر بھٹو نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو کراچی سمیت دنیا بھر سے ان کی نگاہِ انتخاب جس ایک شخص پر ٹھہری اس کا نام آصف علی زرداری تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ 1983ء کی اس شام کو ہوٹل سے باہر پھینکے جانے اور داخلے پر پابندی کا واقعہ آصف زرداری نے فراموش نہیں کیا اور اسے ابھی تک مجھ سے پرخاش تھی...... لیکن اس کہانی کا ذکر بعد میں آئے گا۔

باب 8

دلکش نظارہ اور نیا منصوبہ

جب میرے مختلف ہوٹلوں کی آہستہ آہستہ اور مرحلہ وار تعمیر جاری تھی، میری ذاتی زندگی میں بھی طوفانوں اور المیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ 1974ء میں میرے بھائی حسن علی کی وفات ایک ایسا صدمہ تھا جس سے شاید میں ابھی تک سنبھل نہیں سکا تھا۔ آپ اپنے دادا یا دادی یا پھر ایک ضعیف العمر چچا کی وفات تو برداشت کر سکتے ہیں لیکن اگر آپ کا کوئی عزیز بھائی 42 برس کی عمر میں آپ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائے تو اسے بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے۔ تین برس بعد میرے والد بھی ہمیں چھوڑ گئے۔ وہ کچھ عرصے سے بیمار تھے اور ان کے تھائرائیڈ گلینڈز کے آپریشن کے لیے انہیں لندن لے جایا گیا تھا جو ناسور بن چکا تھا۔ ان کی صحت مکمل طور پر بحال نہ ہو سکی تھی۔ یہ 14 مئی 1977ء کا دن تھا، صبح کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ میں اس وقت اپنے کمرے میں تھا جب میرے تین سالہ بیٹے مرتضیٰ نے دروازے پر دستک دی اور کہا کہ دادا کی طبیعت اچھی نہیں۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے وہ کومے کی حالت میں چلے گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر آتا، انہوں نے اپنا سر ہلایا، ان کی دائیں آنکھ سے آنسو کا آخری قطرہ ٹپکا اور وہ اس دنیائے فانی سے باقی رہنے والی دنیا کی طرف کوچ کر گئے۔ وہ ایک خاموش اور سادہ مزاج شخص تھے، جس طرح انہوں نے بے ضرر زندگی بسر کی، اسی طرح وہ کسی کو تکلیف دیے بغیر اور بغیر کوئی شور شرابا کیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جب میرے بھائی اکبر اور میں نے انہیں اٹھایا تو ان کا وجود ایک بچے کے مانند ہلکا پھلکا محسوس

ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے انہیں دنیا کے بوجھ سے آزاد کر دیا گیا ہو۔ اپنے والد کی وفات کے بعد یک لخت مجھے محسوس ہوا جیسے میں اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑا ہو چکا ہوں۔ انتہائی دردناک حقیقت تو یہ ہے کہ وہ حسن علی کی وفات کے تین برس بعد ہی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ ان دونوں کی وفات نے باپ کی حیثیت اور اپنے بچوں کی تعلیم کی اہمیت کے لحاظ سے مجھے اپنی ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ آگاہ کر دیا تھا۔

میں نے 1981ء میں اپنی دونوں بڑی بیٹیوں، نادیہ اور شازیہ کو اسلام آباد کے نزدیک ایک پہاڑی مقام، مری میں واقع جیسس اینڈ میری کانونٹ (Jesus and Mary Convent) بھجوا دیا جس کا قیام انیسویں صدی میں عمل میں آیا اور جو پاکستان کا ایک بہترین بورڈنگ سکول تھا۔ ہر پندرھویں دن میں اپنی بیٹیوں کے پاس جاتا جس کے لیے مجھے پہلے ہوائی جہاز کے ذریعے اسلام آباد اور پھر گاڑی کے ذریعے مری جانا ہوتا۔ ایک دن میں انہیں مری سے دس میل کے فاصلے پر واقع ایک خوبصورت مقام بھوربن میں تفریح کے لیے لے گیا۔ سطح سمندر سے 7000 فٹ بلند بھوربن...... مری (6000) سے بھی بلند انتہائی دلکش اور خوبصورت مقام تھا۔ ہمالیہ کے دامن میں واقع بھوربن سے پہاڑوں اور وادی کشمیر کا ایک دلکش نظارہ نظر آتا تھا۔ قریبی جنگل انتہائی سرسبز و شاداب تھے۔ بھوربن میں 9-hole پر مشتمل گالف کا میدان بھی تھا جس میں میری بیٹیوں اور میں نے پیدل سیر کی اور پھر دوپہر کے کھانے میں اسلام آباد ہوٹل سے لائے گئے سینڈوچ کھائے۔ یہ میرے لیے شدید جذباتی لمحہ تھا اور میں نے اسی لمحے بھوربن میں ایک ہوٹل تعمیر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ شہر ابھی تک اچھی حالت میں تھا اور اس کی آبادی بھی زیادہ نہیں تھی۔ زمین کوڑیوں کے مول -/5000 روپے فی کینال (600 گز) دستیاب تھی۔ میں نے حکومت پنجاب سے جنگل کا ایک قطعہ زمین پٹے پر لینے کے لیے درخواست دی۔ اس قطعہ زمین کو ہوٹل کے لیے اس وجہ سے نہیں خرید سکتا تھا کہ یہ حکومتی ملکیت تھا۔ میں نے ایک بوتیک اور 50 کمروں پر مشتمل ہوٹل تعمیر کرنے کی منصوبہ بندی شروع کی۔ اگرچہ یہ منصوبہ انتہائی اولوالعزمی کا مظہر اور متقاضی نظر آتا تھا مگر اس علاقے میں پکانے کے لیے گیس یا بجلی میسر نہ تھی۔ مقامی

افراد گھریلو ضرورت کے لیے قدرتی ندیوں سے پانی لاتے۔ 50 کمروں پر مشتمل ہوٹل کے لیے جو خاکہ ماہرین تعمیرات کو دیا گیا تھا، وہ پہاڑوں کی خوبصورتی کو سامنے لانے کے لیے مناسب اور کافی نظر نہیں آتا تھا۔ پھر یہ تجویز 100 کمروں پر پھیلا دی گئی۔ ہم نے پہاڑی علاقے میں کھدائی شروع کر دی اور پھر سامانِ تعمیر گدھوں کے ذریعے منتقل کرنا شروع کیا۔ یہ 1980ء کی دہائی کے آخر کا وقت تھا جب ہم نے بھوربن کی تعمیر کے ساتھ ساتھ پرل کانٹی نینٹل لاہور کی وسعت کے منصوبے پر بھی کام کا آغاز کیا۔ آج پرل کانٹی نینٹل بھوربن کی چھے منازل ہیں۔ جیسے جیسے ہم کام کرتے گئے، یہ ترقی کی منازل طے کرتا گیا۔ بالائی منازل سے پہاڑوں کا ایک دورخی ملکوتی منظر نظر آتا تھا۔ اس ہوٹل کی تعمیر کے لیے ہمیں جو پاپڑ بیلنے پڑے، اس کا تصور بھی رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہے۔ حالات انتہائی خراب اور موسم سرما اس قدر شدید تھا کہ ٹھنڈی ہوائیں ہڈیوں کے گودے میں اترتی محسوس ہوتیں۔ اس خراب موسم کے باعث مزدوروں کے لیے مطلوبہ جگہ پہنچنا اور کراچی سے سامانِ تعمیر پاکستان کے دل اور پھر پہاڑی علاقے میں لانا بہت ہی کٹھن تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں جب بھی بھوربن آتا، میرے منصوبے تبدیل ہو جاتے ..... میرے ان تبدیل شدہ منصوبوں کو ہوٹل کے بنیادی خاکوں کو نقصان پہنچائے بغیر لازمی طور پر شامل کرنا پڑتا۔ جب میں ایک دفعہ یہاں آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ ہم یہاں روایتی ہوٹل تعمیر کر سکتے ہیں اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اس وقت نصف ہوٹل تعمیر ہو چکا تھا کہ جب ہم نے ایک بینکوئٹ ہال، سکواش کورٹ، ملاقاتی کمرے، اضافی باورچی خانے اور 1000 افراد کے لیے بیضوی تماشا گاہ شامل کرنے کا فیصلہ کیا جس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ہدف نا قابل حصول اور نا قابل رسائی تھا۔ ہم نے وہاں ایک ہیلی پیڈ بھی تعمیر کیا۔ چوں کہ یہ علاقہ ماہرین کے مطابق زلزلوں کی پٹی پر تھا، اس لیے تعمیر کے دوران اس پہلو کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا کہ عمارت زلزلے کے جھٹکے برداشت کر سکے۔

پرل کانٹی نینٹل بھوربن کا افتتاح 1992ء میں میاں محمد نواز شریف کے ہاتھوں ہوا جو اپنی پہلی مدت اقتدار کے لیے وزیراعظم بنے تھے۔ افتتاحی تقریب کے موقع پر میں نے

تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کس طرح میں اپنی بیٹیوں کے ساتھ بھوربن آیا اور کس طرح میں نے یہاں ہوٹل تعمیر کرنے کا خواب دیکھا جہاں نہ صرف سیاح آتے بلکہ مقامی لوگ بھی مستفید ہوتے اور مقامی معیشت کو توانائی پہنچتی ۔ میں نے کہا، ''صاف بات تو یہ ہے کہ خدا ہی جانتا تھا اور اپنے دل میں مجھے یہ علم تھا کہ اس وادی کے ساتھ کیا حالات پیش آئیں گے ۔ میں چاہتا تھا کہ فائدہ بیرونی لوگوں کو نہیں بلکہ ان مقامی لوگوں کو پہنچے جو یہاں صدیوں سے آباد تھے ۔ چوں کہ منصوبہ تکمیل کے قریب تھا، بھوربن کی سیاحتی اور روایتی مرکزی حیثیت دوسروں کے سامنے واضح ہو چکی تھی ۔ ہوٹل کے متعلق ذیلی کاروبار مقامی لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کا ذریعہ بنے ہیں ۔ دوسرے لوگ بھی اس کاروبار کی طرف متوجہ ہو کر چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں کی تعمیر کی منصوبہ بندی کرتے ہیں جس سے زمین کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں ۔ جب ہوٹل رسمی طور پر کھول دیا گیا، اس سے ملحقہ زمین -/90,000 روپے فی کینال دستیاب تھی اور ایک ہی دہائی میں زمین کی قیمت اٹھارہ گنا ہوگئی ۔ آج اس کی قیمت بہت زیادہ ہو چکی ہے لیکن تعمیری عرصے کے دوران، میں نے بھوربن میں زمین خریدنے سے انکار کر دیا تھا ۔ واضح رہے کہ میں نے اپنے اس منصوبے سے منسلک ساتھیوں اور ٹھیکیداروں کو بھی زمین خریدنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا کیوں کہ میں منافع در منافع نہیں چاہتا تھا بلکہ میری خواہش تھی کہ مقامی افراد فائدہ اٹھائیں ۔

ایک شخص کی ہوٹل کے نزدیک رہائش تھی اور تعمیر کے عرصے کے دوران ہمارے ساتھ بطور ڈرائیور کام کرتا رہا تھا، اس نے بالآخر اپنی قسمت چمکانے کے لیے اپنا آبائی مکان فروخت کر دیا ۔ اس نے رقم سے ایک ٹویوٹا کرولا کار خرید کر کرائے پر دے دی، اپنے خاندان کے لیے ایک گھر بنایا اور اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کے لیے لاہور یونیورسٹی میں داخل کرا دیا ۔ آہستہ آہستہ بھوربن ایک قابل ذکر سیاحتی مقام بن گیا جہاں کئی ایک چھوٹے چھوٹے ریستوران اور ہوٹل قائم ہو گئے ۔ ہمارے ہوٹل کے باعث سیاحوں کا ایک طوفان امڈ آیا اور بھوربن کو لوگ جاننے لگے ۔ میں نے اسے محض نفع و نقصان کی حیثیت سے نہیں دیکھا تھا بلکہ میں نے تو اسے سماجی ذمہ دار ادارے کی حیثیت سے دیکھا تھا ۔ میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو رہا تھا ۔ رسمی افتتاح کے

دوسرے دن ہوٹل کاروبار کے لیے کھول دیا گیا اور ہم نے اس تقریب کو منانے کے لیے پاکستان کے اس وقت کے بہترین گلوکار نصرت فتح علی خان کا کنسرٹ منعقد کیا۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی، میرے ایک قریبی دوست، اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف، آصف نواز جنجوعہ تھے جو پاکستانی فوج کی تاریخ کے ایک انتہائی پیشہ ور جرنیل تھے۔

بعد ازاں، جنرل آصف نواز جنجوعہ کے ساتھ میری قربت کئی دوسرے لوگوں کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی اور نتیجے کے طور پر کئی لوگ میرے خلاف نواز شریف کے کان بھرنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس دوستی کا سیاست سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا اور ہم دونوں ایک غیر سیاسی دوستی کے بندھن میں بندھے ہوئے تھے۔ تاہم پاکستان کی تاریخ سازشی نظریات سے بھرپور تھی اور چوں کہ پاکستان کی تاریخ میں فوج اور سیاسی حکومت کے درمیان اختلافات بھی ہمیشہ ہی موجود رہے تھے، اس لیے ہر قسم کی افواہیں پھیل رہی تھیں۔ مزید برآں، پرل کانٹی نینٹل لاہور کی وسعت بھی تاخیر کا شکار ہوگئی تھی کیوں کہ تعمیری کام متوقع مدت میں پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ نواز شریف جن کی شدید خواہش تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے ان کے آبائی شہر میں ایک شاندار ہوٹل تعمیر کیا جائے، وہ اس میں تاخیر پر بھی پریشان تھے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ میں جان بوجھ کر اس منصوبے میں تاخیر کر رہا ہوں حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ میں تو خود اپنے اس سرمائے کے متعلق متفکر تھا جو منجمد ہوگیا تھا۔ بالآخر لاہور ہوٹل کی ایک نئی شاخ 1997ء میں کھل گئی۔ ہوٹل کا افتتاح نواز شریف کے بھائی اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ شہباز شریف نے کیا۔ یہ کیسا حسن اتفاق ہے کہ آج دو دہائیاں بعد نواز شریف ایک کہنہ مشق اور تجربہ کار سیاستدان کی حیثیت سے تیسری مرتبہ پاکستان کے وزیر اعظم منتخب ہو چکے ہیں جبکہ شہباز شریف ایک کامیاب وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے دوبارہ اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں۔

بھوربن کے بعد آزاد جموں کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد میں ہوٹل بنانے کا منصوبہ بھی اندھیرے میں چلائے جانے والے تیر کی طرح تھا۔ یہ ہوٹل مستقبل کے لحاظ سے ایک جوا تھا اور اب بھی ہے اور اسے فوری آمدنی یا مالی فوائد کے لحاظ سے بیان نہیں کیا

جا سکتا۔ اس کے پیچھے ایک کہانی ہے جس کا دوبارہ بیان از حد ضروری ہے۔ 1947ء میں ریاست جموں وکشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن یہاں کا حکمران ایک ہندو راجہ تھا۔ جلد ہی اس خطے میں بے چینی پیدا ہوئی اور ایک دلکش اور خوبصورت علاقہ ایک شورش زدہ خطے میں تبدیل ہوگیا۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی جس کے نتیجے میں جموں وکشمیر کے حصے بخرے ہوگئے اور یوں آزاد جموں وکشمیر جو پاکستان کی عملداری میں ہے اور وادیٔ کشمیر جو تقریباً 70 برس سے بھارتی توپوں اور لمبے فوجی بوٹوں کے مظالم کا شکار ہے، وجود میں آئے۔ میں مورخ ہوں نہ ہی سیاستدان ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ مسئلہ کشمیر کا حل کیا ہے۔ لیکن مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ مسئلہ کشمیر کا حل لازماً ایسا ہونا چاہیے جو کشمیر کے بدقسمت عوام کے لیے منصفانہ ہو اور پاکستان اور بھارت، دونوں کے لیے پُر وقار ہو۔

بہرحال، یہ حل میری نظر میں جیسا بھی ہو، اس حل کا ایک عنصر تجارت بھی ہونا چاہیے۔ کشمیر قدیم تجارتی راستوں کے وسط میں واقع ہے۔ ماضی میں ''شاہراہ ریشم'' اس میں سے ہوکر گزرتی تھی اور وسطی وجنوبی ایشیا کو باہم منسلک کردیتی تھی۔ کیا ہم ایک ایسے مستقبل کا تصور کرسکتے ہیں جہاں اشیاء اور مسافروں کے قافلے سرینگر سے مظفرآباد اور پھر شاہراہ قراقرم سے ہوتے ہوئے مغربی چین میں داخل ہوجائیں؟

یہ وہ سوال تھا جو میں نے 2002ء میں خود سے اس وقت پوچھا جب میں اس جگہ کا معائنہ کرنے کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز مظفرآباد پہنچا۔ آزاد جموں وکشمیر کی حکومت مجھے وہ جگہ دینے سے ہچکچا رہی تھی جو میں نے منتخب کی تھی۔ اسے آزاد جموں وکشمیر کے صدر کی سرکاری رہائش گاہ کی تعمیر کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ پہاڑی پر واقع ہونے کے باعث یہاں سے وادیٔ نیلم کا بہت خوبصورت نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ اس وادی کو دریائے جہلم اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ ایک نظر ڈالتے ہی معلوم ہوجاتا کہ دنیا میں اس سے خوبصورت اور کوئی جگہ نہیں۔ میں نے اپنی ذات میں موجود قائل کرنے کی تمام صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے مقامی حکومت کو یہاں ہوٹل تعمیر کرنے پر راضی کرلیا۔ اکتوبر 2005ء میں تعمیر شروع کیے ابھی ہمیں دو برس ہی گزرے تھے جب کشمیر اور شمالی پاکستان کو زلزلے نے آلیا۔ لاکھوں افراد

ہلاک ہوگئے اور مظفرآباد کے کئی ایک مضافاتی گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ ہمیں تعمیر روکنے کے علاوہ ڈھانچے کا دوبارہ معائنہ کرنا پڑا۔ ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ ایسی عمارت تعمیر کی جائے جو ریکٹر سکیل پر 7 درجے کے زلزلے کے جھٹکے برداشت کرلے۔ 2005ء کا زلزلہ اس سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ میرا اصرار تھا کہ موجودہ ڈھانچے کو اس قدر مضبوط بنادیا جائے کہ 10 درجے کے زلزلے کو سہار سکے۔ مجھے بتایا گیا کہ اس کی ضرورت نہیں کیوں کہ انسانی تاریخ میں اس درجے کا زلزلہ آج تک نہیں آیا۔ میں کسی کی بھی نہیں سن رہا تھا۔ بلا شبہ موجودہ ڈھانچے کو مزید مضبوط بنانے کا عمل مہنگا تھا اور بجٹ بھی 40 فیصد تک بڑھ جاتا۔ میں نے سوچا فکر کی کوئی بات نہیں اس پُراعتماد رویے ہی کے باعث میں رات کو سکون سے سوسکتا تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہوٹل میں قیام پذیر مہمان بھی سکون کی نیند سوسکتے تھے۔

ہوٹل کا ایک شعبہ 2007ء میں کھول دیا گیا اور 2011ء میں اس نے بھرپور کام شروع کردیا۔ 2002ء میں جب میں نے اس ہوٹل کا خواب دیکھا تھا تب پاکستان اور بھارت کے زیرانتظام کشمیر کے مختلف حصوں کے درمیان تجارت بالکل نہیں تھی حتیٰ کہ دونوں اطراف کے کشمیر کے مکینوں کو اپنے رشتہ داروں سے ملنے اور سفر کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اس وقت مظفرآباد ایک چھوٹا سا پہاڑی اور زرعی شہر تھا جہاں کاروباری سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر تھیں اور یہ کوئی سیاحتی شہر بھی نہ تھا۔ ہمسایہ ملک افغانستان میں جنگ چھڑ چکی تھی لیکن میں قائل ہو چکا تھا کہ امن کی دعوت تمام رکاوٹوں پر قابو پالے گی۔ بھارت اور پاکستان دونوں کے سیاستدان گولیوں کے ذریعے نہیں بلکہ مذاکرات کے ذریعے مسئلے کا حل تلاش کریں گے اور کشمیر کے دونوں حصوں کے لوگ ایک دوسرے کے ہاں سفر کریں گے، باہمی تجارت ہوگی اور ایک دوسروں کو دوستوں کی حیثیت سے خوش آمدید کہا جائے گا۔ میں نے محسوس کیا کہ عالمی حالات کے علاوہ نیو دہلی اور اسلام آباد دونوں دارالحکومتوں میں موجود سیاستدانوں کی تبدیل ہوتی ہوئی جبلتیں، کشمیر کے مجموعی علاقے میں تجارت اور سیاحت کے لیے سازگار حالات پیدا کردیں گی۔ لیکن ایسا ابھی اور فوری نہیں ہونا تھا۔

میں 102 کمروں پر مشتمل اپنے ہوٹل کا مسلسل دورہ کرتا رہتا ہوں۔ یہ ہمیشہ سے

ہی ایک پُرسکون اور خوبصورت جگہ رہی ہے۔ یہ پُرسکون فطرت کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہے۔ میری طرح یہ ہمیشہ ان انسانوں کا منتظر رہتا ہے جو اسے بھی سکون مہیا کریں۔

میرے لیے میرے ہوٹلوں کی اہمیت کاروبار سے کہیں زیادہ ہے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ میں نے خود اپنی ذات اور اپنے خوابوں کو اپنے ہوٹل کے منصوبوں میں سمو دیا تھا۔ میں نے ایسے فیصلے کیے جو تجارت کی کڑی تعریف پر پورا نہیں اترتے تھے۔ میرے نزدیک کاروبار سے مراد یہ نہیں ہے کہ آپ ہر قسم کی مشکلات ومصائب سے صرف نظر کر کے خود کو آرام و آسائش کی دنیا میں غرق کر دیں۔ بڑے بڑے امریکی یا یورپی سرمایہ کار بینکوں کے ساتھ ہمارا اختلاف یہ ہے کہ جب وہ سرمایہ کاری کر کے کسی بھی کمپنی کے حصص خریدتے ہیں، وہ کمپنی کی انتظامیہ کو حصص کی منڈی کی ضروریات کے مطابق کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ درست ہے کہ اس کی وجہ سے نظم وضبط پیدا ہوتا ہے لیکن تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اس سے آگے بڑھنے کی خواہش ختم ہو جاتی ہے۔ ایک کاروباری، جو وال سٹریٹ کی طرف سے پیشگوئیوں کے مکروفریب سے آزاد ہوتا ہے، متوقع طور پر اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ وہ ایک حقیقی کاروباری شخص کی مانند سوچ سکتا ہے۔ اگر وہ غلط قدم اٹھائے گا تو اس کے منصوبے ناکام ہو جائیں گے لیکن جب اسے کامیابی حاصل ہوگی تو یہ کامیابی اس قدر شاندار ہوگی کہ دوسروں کے ہوش اڑا کر انہیں مبہوت کر دے گی۔

میں نے اپنے ہوٹلوں کے کچھ منصوبوں خاص طور پر بھوربن کے ساتھ اس قسم کے جذبات محسوس کیے جن پر مجھے انتہائی فخر ہے کیوں کہ جب ہم نے کام کا آغاز کیا تو منصوبے کے خدوخال بس میرے ذہن میں ہی تھے۔ کچھ برس قبل طارق عزیز نے مجھے ایک انتہائی متاثر کن خط لکھا۔ طارق عزیز کالج کے زمانے کا پرویز مشرف کا دوست ہے اور اس نے پرویز مشرف کے دورِ صدارت میں نیشنل سکیورٹی کونسل کے سیکریٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس نے لکھا کہ اس کے بوڑھے اور بیمار والد فضا کی تبدیلی کے خواہشمند تھے اور ان کا بیٹا انہیں پرل کانٹی نینٹل بھوربن لے گیا۔ طارق عزیز کے والد جو بدقسمتی سے جلد ہی اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے، وہ اس پُرفضا مقام کی سحر انگیز اور پُرجلال خوبصورتی سے بہت

متاثر ہوئے۔ ایک شام بالکونی میں بیٹھے ہوئے انہوں نے اپنے بیٹے کو بتایا، ''جس کسی کے ذہن میں بھی یہ ہوٹل تعمیر کرنے کا خیال آیا، وہ یقینی طور پر جنت میں جائے گا۔'' جب میں نے یہ الفاظ پڑھے تو میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس بزرگ کی دعاؤں نے میری روح کو گرما دیا۔ چیک اور فوائد کے حصول یا منافع اور دولت کی بارش سے بڑھ کر یہ وہ لمحات ہیں جنہیں ایک کاروباری کی حیثیت سے میں روحانی خوشی و مسرت کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔

یہ عجب بات ہے کہ میں نے اپنے ہوٹلوں میں کبھی زیادہ وقت قیام نہیں کیا۔ جب میرے دوست مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو میں اپنے کاندھے جھٹکتا ہوں اور کہتا ہوں، ''میری پیاس ابھی بجھی نہیں۔'' میں بیس برس کے دوران بھوربن میں صرف ۵ راتیں سویا۔ میں نے محض اس کے افتتاح کے موقع پر وہاں قیام کیا اور نصرت فتح علی خان کے کنسرٹ میں شرکت کی اور بعد ازاں دو مواقع پر جو اتفاق سے دونوں ہی موسیقی کے پروگرام تھے، میں نے فریدہ خانم اور اقبال بانو کی محافل موسیقی میں شرکت کی۔ میں نے فریدہ خانم کی محفل موسیقی میں قطعی غیر متوقع طور پر شرکت کی۔ اس وقت لندن سے آنے والا میرا ایک دوست مجھے اسلام آباد میں ملنے آ رہا تھا۔ وہ ذہنی طور پر بہت پریشان تھا کیوں کہ اس کا کاروبار دگرگوں تھا۔ میں اس کی خوش طبعی کی خاطر اسے اپنی گاڑی میں بھوربن لے گیا تاکہ میں اسے ہوٹل اور پہاڑوں کے طلسم کا مشاہدہ کرا سکوں اور فریدہ خانم کا کنسرٹ سنوا سکوں۔ کم از کم جب تک وہ بھوربن میں رہا، اس کی افسردگی اور ذہنی پریشانی اس کے نزدیک نہ پھٹک سکی۔ میں اپنے دوست کو چند گھنٹوں کے لیے خوشی فراہم کر سکا، میرا یہ فعل سونے میں تولنے کے مترادف تھا۔ وال سٹریٹ میں بیٹھے نفع اندوز اور شاطر ذہن اس قسم کے جذبات کو کبھی بھی سمجھ نہ پائیں گے۔

جب ہم کراچی میں مقیم تھے تو میریٹ میرے کچھ دوستوں کے لیے ہر پندرہ دن بعد شام کو نجی میل ملاقات کا مرکز بن گیا تھا۔ پانچ یا چھے جوڑے جمع ہو جاتے اور غزل کے ایک گائیک کو اسی مقصد کے لیے حاصل کردہ ایک کمرے میں آنے اور غزل سرائی کی دعوت دی جاتی۔ ہم سب لوگ مل کر فنکار کا معاوضہ ادا کرتے۔ یہ ہمارا معمول اور دستور بن چکا تھا۔ فروری 1983ء کی ایک شام جب میں میریٹ کے قریب واقع کراچی جمخانہ میں سکواش کھیل

رہا تھا، میں نے ایک زوردار آواز سنی۔ اس وقت تو مجھے کچھ پتہ نہ چلا لیکن بعد ازاں معلوم ہوا کہ ہالیڈے اِن (کیوں کہ اس دور میں ہوٹل کا یہی نام تھا، اب میریٹ) پر راکٹ حملہ ہوا ہے۔ اس حملے کا ہدف، زیریں منزل پر واقع ایئر فرانس کا دفتر تھا۔ بہر حال، اس حقیقت سے بے خبر میں بدستور کھیلنے میں مصروف رہا۔ چند ہی منٹوں بعد میرا بھائی زوردار انداز میں سکواش کورٹ کا دروازہ کھول کر داخل ہوا۔ وہ بہت پریشان معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے حملے کے متعلق بتایا۔ میں نے اسے کہا، دس منٹ ٹھہرو، میں کھیل ختم کر لوں۔ اس دوران میں نے اپنے خیالات مجتمع کیے اور پھر میریٹ چلا گیا۔ وہاں میں نے جو صورت حال دیکھی اسے صرف ایک لفظ میں ''افراتفری'' اور ہنگامہ کہہ کر ہی بیان کر سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر کہ کوئی ہلاک نہیں ہوا اور فائر بریگیڈ بھی پہنچ گیا لیکن افراتفری اور ہنگامے کا عالم اب بھی طاری تھا۔ میں نے سب انتظام سنبھال لیا اور جی ایم سے لے کر جمعدار تک کو بالائی منزل پر بلا لیا اور جلی ہوئی اشیا کو ہٹانے کا کہا۔ زخمی ہونے والوں کو فوراً ہی ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ محض تین گھنٹوں کے اندر ہی ہم ضرورت کے مطابق سب چیزیں دوبارہ ٹھیک کر چکے تھے اور ہوٹل کے معمولات دوبارہ شروع ہو گئے تھے۔ یہ وہی وقت تھا جب مجھے اپنے ایک دوست کا فون موصول ہوا۔ وہ کہنے لگا، ''صدرو! میں نے حملے کے متعلق سنا ہے، کیا محفل غزل ختم ہو گئی۔'' میں نے کہا، ''نہیں...... ابھی جاری ہے، ابھی ایک گھنٹے میں ملاقات ہو گی کیوں کہ مجھے گھر جا کر محض غسل ہی کرنا ہے۔'' ہمارا ہوٹل واقعی ہدف نہ تھا۔ ایک عسکریت پسند گروپ ایئر فرانس پر حملہ کر کے فرانسیسی حکومت کو اس کے اس رویے کے متعلق کوئی پیغام دینا چاہتا تھا۔ یہ طریق کار سیاسی طور پر اس گروپ نے عراق ایران جنگ کے دوران اپنایا تھا۔ جب میں ہوٹل سے گھر کے لیے روانہ ہوا تو میں نے قطعاً محسوس نہیں کیا کہ شہر میں اب تک سفارتکاروں سمیت فرانسیسی اہداف پر کئی حملے ہو چکے ہیں۔ میری خوش قسمتی اور قدرت کی طرف سے تنبیہ تھی۔ میں تو سکون اور مہمانداری کے ایک نخلستان کے طور پر ہوٹل تعمیر کر رہا تھا۔ اس حملے کے ساتھ ہی اب بدقسمتی مجھ سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ یہ نہ صرف میرے کسی بھی ہوٹل پر پہلا دہشت گردانہ حملہ تھا بلکہ پچیس سال قبل کے دور کا خطرناک ترین واقعہ تھا۔

☆☆

ہوٹلنگ کے میرے کاروبار نے مجھے بیرون ملک جانے کا بھی موقع فراہم کیا۔ مجھے 1989ء میں اسماعیلی کاروباری افراد کے ایک گروپ نے کینیڈا میں ہوٹل کے ایک منصوبے میں سرمایہ کاری کرنے کی دعوت دی۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے اپنی رضامندی ظاہر کردی کہ ٹوٹا (Tota) اور لزبونا (Lisbona) کو بھی میرے ساتھ ہی سرمایہ کاری کی دعوت دی گئی تھی۔ بدقسمتی سے اس منصوبے کے ایک مرکزی کردار نے مجھے دھوکہ دیا۔ لندن میں مقیم یہ شخص بظاہر تو نیک تھا لیکن حقیقت میں مکار تھا۔ میں تو یہ ادراک ہی نہیں کرسکتا تھا کہ جس شخص کا اللہ تعالیٰ پر اس قدر گہرا اعتقاد و ایمان ہو، ایک معمولی چور کی جبلتوں کا حامل ہوسکتا ہے لیکن یہ شخص اسی قماش کا انسان تھا۔ ایک چوتھائی صدی گزر چکی ہے مگر میں ابھی تک اپنی رقم کی واپسی کے لیے کوشش کررہا ہوں۔ بہرحال، میں نے ایک کنسورشیم کے حصے کے طور پر ہوٹلوں میں سرمایہ کاری شروع کی۔ میں ہوسٹن میں ایک جائیداد خریدنے کا شدید خواہشمند تھا کیوں کہ اب میں تیل و گیس کے کاروبار میں قدم رکھنا چاہتا تھا۔ ہوسٹن، ٹیکساس ہی نہیں پورے امریکہ کے لیے توانائی کا دارالحکومت تھا اور ابھی بھی ہے۔ میں نے ہوسٹن میں ایک مناسب ہوٹل کی تلاش کے لیے ایک مشیر کی خدمات حاصل کیں اور ہم شہر کے مرکزی حصے میں واقع شیرٹن کے متعلق غور کرنے لگے۔ یہ اس وقت سٹی بینک کے پاس بطور گروی موجود تھا۔ ہم نے اپنی مکمل تیاری کی اور بات چیت شروع کردی۔ بالآخر ہم ایک معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے ہوسٹن پہنچ گئے۔ ہم نے سٹی بینک کے اعلیٰ افسران سے ملاقات کی اور یہ ملاقات سودمند رہی۔ اگلی صبح میں پیدل چلتا ہوا اس ہوٹل میں داخل ہوا جسے متوقع طور پر میں خرید رہا تھا۔ اس وقت میں بہت حیران ہوا جب میں نے دیکھا کہ ہوٹل تو مرکز خریداری بن چکا ہے جہاں مختلف قسم کا ساز و سامان، ٹی وی اور فرنیچر نیلام ہورہا تھا اور ہجوم امڈ امڈ کر آرہا تھا۔ ہوٹل کے ذمہ شہری حکام کے کچھ ٹیکس تھے اور ان کی ادائیگی کرنے یا ان کے متعلق مجھ سے ذکر کرنے کے بجائے سٹی بینک کے کسی ہوشیار ذہن کے مالک شخص نے ٹیکسوں کی رقم کی ادائیگی کے لیے ہوٹل کا ساز و سامان، نیلامی میں فروخت کردینے کا فیصلہ کیا تھا۔ لاکھوں کی

مالیتی اشیا کوڑیوں کے مول فروخت کی جا رہی تھیں۔ مجھے بہت غصہ آیا کیوں کہ سٹی بینک نے بدنیتی کا مظاہرہ کیا تھا اور محض خالی خولی شیرٹن ہوٹل لینے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں نے اس سودے سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کرلیا اور اپنا غصہ دور کرنے کے لیے بوسٹن کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے لگا۔ جب میں نے خود کو پُرسکون کرلیا تو میں حیات ریجنسی (Hyatt Rgency) کی کافی شاپ میں گیا جہاں میں قیام پذیر تھا۔ وہاں میں نے اپنے مشیر کے ساتھ کافی نوش کی۔ ہم نے اپنی اس مایوسی کے متعلق بات چیت کی جو اس معاہدے کی عدم تکمیل کے باعث ہم پر طاری تھی۔ رخصت ہوتے ہوئے میں نے انتہائی حسرت سے کہا، ''ایک دن، خدا ہمیں بوسٹن میں ایک ہوٹل دے گا.....شاید یہی ہوٹل.....'' یہ الفاظ کہتے ہوئے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، جب میں اپنے ہاتھ لہراتے ہوئے اس ہوٹل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا، جہاں ہم اس وقت کافی پی رہے تھے۔

اس شام میری کوئی مصروفیت نہ تھی۔ میں نے لندن کی پرواز میں اپنی نشست محفوظ کرا رکھی تھی اور اگلے دن میں نے پاکستان پرواز کر جانا تھا۔ خود کو مصروف رکھنے کے لیے میں نے حیات ریجنسی، 1000 کمروں پر مشتمل ایک روایتی ہوٹل کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ خلاف معمول نہیں تھا۔ جب بھی میں کسی ہوٹل میں پہلی دفعہ قیام کرتا ہوں، میں اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک لحاظ سے میں اپنی تجسس پسند طبع سے مجبور تھا اور ایک لحاظ سے ہوٹلنگ کی صنعت کے متعلق زیادہ سے زیادہ آگہی حاصل کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا کیوں کہ یہ صنعت مجھے اپنے وجود کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ اس شام میں نے حیات ریجنسی کی تمام منازل گھوم پھر کر دیکھیں جہاں ہوٹل کے کام کاج میں مصروف عملہ خالی کمروں میں اپنے کام میں مصروف تھا، باورچی خانے میں مجھے باورچی بھی نظر آئے۔ میں نے ہوٹل کے استقبالیوں میں موجود ایگزیکٹوز کو گپ شپ بھی لگاتے دیکھا۔ میں ہوٹل انتظامیہ کو بتا سکتا تھا کہ ہوٹل کی مالی حالت اگرچہ پتلی ہے لیکن اس میں ترقی کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ ان آوارہ گرد خیالات کو اپنے ذہن میں بسائے میں اپنے کمرے میں واپس پہنچ گیا، اپنا بیگ تیار کیا اور سو گیا لیکن اس سے پہلے میں صبح کے لیے الارم لگانا نہیں بھولا

تھا کیوں کہ مجھے ایئر پورٹ پہنچنا تھا۔

اس مشیر نے چند دنوں بعد مجھے کراچی فون کیا اور کہا، ''حیات ریجنسی کو یاد کرو! جہاں آپ نے قیام کیا تھا اب ایسے حالات ہیں کہ اس ہوٹل کو نیلامی میں خریدا جا سکے۔'' یک دم مجھے سنسناہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ میرے منہ سے نکلی ہوئی ایک فی البدیہہ اور بے ساختہ بات پیشگوئی ثابت ہوئی۔ پھر اس مشیر نے مجھے تمام حالات سے آگاہ کیا۔ یہ ہوٹل ٹینیکو آئل (Tenneco Oil) اور پروڈینشل انشورنس (Prudential Insurance) کی مشترکہ ملکیت تھا۔ اس ہوٹل کا انتظام حیات کے پاس تھا لیکن اس ہوٹل کی مالی حالت سے مطمئن نہ تھا اور اس کی طرف سے بحالی کے لیے ایک منصوبہ پیش کیا گیا تھا۔ ٹینیکو اور پراوڈینشل نے ہوٹل کے لیے محض 37 ملین ڈالر کا بجٹ مخصوص کیا ہوا تھا۔ ہوٹل منافع نہیں کما رہا تھا اور اس کے مالکان منافع کی یقین دہانی کے بغیر مزید سرمایہ کاری سے انکاری تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ایک مکروہ چکر ہے۔ ٹینیکو اور پروڈینشل اس وقت تک مزید سرمایہ کاری نہ کرتے جب تک ہوٹل منافع پیدا کرنا شروع کر دیتا اور ہوٹل منافع بخش ثابت نہ ہوتا جب تک اس کی از سر نو بحالی کا عمل مکمل نہ کیا جاتا۔ میں نے اپنے مشیر کو بتایا کہ میں تو مشتاق ہوں اور درحقیقت، ''جیسا بھی ہے'' کی بنیاد پر ہوٹل خریدنے کے لیے تیار ہوں۔ میری بات سن کر میرا مشیر بہت حیران ہوا اور کہنے لگا، ''لیکن یقیناً تمہاری خواہش ہوگی کہ تمہارے لوگ نہایت ہی ہوشیاری اور جانفشانی سے کام کریں۔'' میں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔'' میں نے خود اپنی ذہانت مستعدی اور ہوشیاری سے کام لیا ہے۔'' میں نے آنے والے دنوں میں یہی فقرہ دفتر میں اپنے ساتھیوں، دوستوں اور ان افراد خانہ کے سامنے بار بار دہرایا جو یہ سمجھتے تھے کہ میں ایک دور افتادہ مقام، ہوسٹن میں ہوٹل کو بغور دیکھے بغیر خرید کر اندھادھند قدم اٹھا رہا ہوں۔

اگلے چند دنوں کے دوران بولی کی رسمی دستاویزات تیار کی گئیں اور بھجوا دی گئیں۔ ٹینیکو اور پروڈنشل میری طرف سے ''غیر مشروط پیشکش'' کے باعث کامیاب رہے جس میں ہوشیاری اور عقلمندی کا کوئی عنصر موجود نہ تھا۔ امریکہ میں ایسا کبھی سنا ہی نہیں گیا تھا اور ان کا خیال تھا کہ میں ایک دولت مند لیکن احمق شخص ہوں۔ مالکان نے 42 ملین ڈالر کا مطالبہ کیا۔

ہم 40 ملین ڈالر پر متفق ہوگئے اور معاہدہ طے پا گیا۔ حیات کے ایگزیکٹوز جو ہوٹل کا انتظام وانصرام انجام دے رہے تھے، انتہائی چکر باز تھے۔ اب انہیں ایک نئے مالک کو برداشت کرنا تھا اور اس شخص پر اکتفا کرنا تھا جو فوری بلکہ اضطراری فیصلے ہی کرتا تھا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میری خواہش ہے کہ ہوٹل کامیاب ہو لیکن محسوس کیا کہ ازسرنو بحالی کے عمل کے لیے 37 ملین ڈالر کی رقم بہت زیادہ ہے۔ 1989ء میں بذات خود تین ماہ کے لیے ہوسٹن منتقل ہوگیا اور حیات کی طرف سے عائد کردہ شرائط اور مطالبات کی مکمل پابندی کرتے ہوئے ذاتی طور پر ہوٹل کی تعمیرنو کے کام کی نگرانی کی لیکن معیار پر کوئی سمجھوتا کیے بغیر میں نے ٹھیکیداروں اوران کے ملازمین کے ساتھ لاگت میں کفایت کو بھی پیش نظر رکھا۔ ہوٹل کی مکمل ازسرنو بحالی کے عمل کی تکمیل کے لیے 17 ملین ڈالرصرف ہوئے جس کے باعث حیات مطمئن ہوگیا تھا۔ یوں امریکہ میں میری ایک ایسی جائیداد وجود میں آ گئی جس پر میرے نام کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

ہوسٹن میں ہوٹل کے حصول کے پہلے معاہدہ نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا کہ کیا اس ڈیل کو بزنس ماڈل بنایا جاسکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ میں رہن رکھی ہوئی، خراب یا خستہ حال جائیدادیں خریدوں اور انہیں قابل استعمال بناؤں، اور پھر انہیں چلاؤں یا فروخت کردوں؟ میں نے یہی تجربہ ہلٹن ساؤتھ ویسٹ میں بھی دہرایا جو ہوسٹن ہی میں واقع تھا۔ پھر ہم نے فلوریڈا کے شہر بوکاراٹن (BOCA RATON) میں ایک ہوٹل خریدا۔ ان ہوٹلوں کی ازسرنو بحالی کے بعد میں نے انہیں فروخت کردیا۔ پاکستان میں رہتے ہوئے امریکہ میں ہوٹلوں کا انتظام وانصرام بہت ہی مشکل ہے۔ امریکہ میں ہوٹل کا میرا آخری سودا اورلینڈو (Orlando) فلوریڈا میں تھا۔ یہاں بھی میں نے مشکلات کو دعوت دینے والا ہوٹل خریدا، اسے بہت اچھی طرح بنایا اور جب اس کی کارکردگی بہتر ہوئی تو میں نے ہوٹل فروخت کردیا۔ 1990ء کی دہائی میں ایک ایسا زمانہ بھی تھا جب میں نے امریکہ خاص طور پر ہوسٹن میں مستقل قیام کیا جہاں میرا بیٹا حسن پڑھتا تھا۔ میری چھوٹی بیٹی سارہ بھی ٹیکساس کے ایک کالج چلی گئی تھی، اس لیے ہوسٹن میں ہمارا گھر گہما گہمی کا مرکز تھا اوراس کی خوشگوار یادیں ابھی تک ہمارے دل میں موجود ہیں۔

اس گھر کی شہرت انتہائی اچھی تھی۔ اس کے سابقہ مالکان میں سے ایک 1960ء کی دہائی میں ٹیکساس کا گورنر جان کونلے تھا اور اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ بھی اسی کار میں موجود تھا جس کار میں صدر جان ایف کینیڈی، ڈیلاس میں 22 نومبر 1963ء کے روز بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی دن بندوق کی ایک گولی نے صدر کینیڈی کو ہلاک کر دیا لیکن گورنر کونلے محض زخمی ہوا۔ یہ تاریخ سے میری مختصر سی واقفیت کا احوال تھا۔ یہ گھر اور وہ ہوٹل اب ماضی کا قصہ بن چکے ہیں۔ جب میرے بچوں نے گریجویشن مکمل کر لی اور ٹیکساس امریکہ سے رخصت ہو گئے تو میں نے ہوٹلوں میں اپنے حصص فروخت کر دیے اور بس۔ ان برسوں میں ہوٹلوں کے میرے دو منصوبوں کے علاوہ تمام منصوبے پاکستان میں تھے۔ بحیرۂ روم کے بالکل ساتھ طرابلس میں ایک بہت بڑی عمارت کی تعمیر کے لیے میری ایک کمپنی کا لیبیا کے انوسٹمنٹ فنڈ کے ساتھ ایک مشترکہ منصوبہ طے پایا۔ یہ عمارت ایک ہوٹل، دفتری منازل، رہائشی مکان اور ایک مرکز خریداری پر مشتمل تھی۔ یہ منصوبہ زیر تعمیر ہے۔ ہوٹل تیار ہونے پر ہم اس کا انتظام ایک مشہور بین الاقوامی کمپنی کے حوالے کر دیں گے۔ اپنی زیادہ تر جبلتوں کے برعکس ہوٹل چلانے کے لیے مجھے ہوٹل کی انتظام کاری کا ایک معاہدہ کرنا ہوگا جہاں مجھے انسانی وسائل کے علاوہ دیگر لوازمات بھی فراہم کرنا ہوں گے اور جو میرے لیے مشکل ثابت ہوگا۔ خرطوم میں ایک بہت بڑا قطعہ زمین موجود ہے جہاں ہم کئی برس سے ہوٹل تعمیر کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ سوڈان میں سیاسی شورش اور اس کے خلاف معاشی پابندیوں نے اس منصوبے کو ناقابل عمل بنا دیا ہے اور بینکوں سے قرضوں کا حصول انتہائی مشکل ہے۔ نیز 2011ء میں تیل سے مالا مال سوڈان کی تقسیم کے بعد، خرطوم کاروبار کے لیے اپنی کشش کھو چکا ہے اور جب بھی ہم ہوٹل کی تیاری کے لیے آغاز کریں گے تو ہمیں اپنے منصوبوں کی تشکیل نو کرنا ہوگی۔

☆☆

گزشتہ دہائی میں ہوٹل کے میرے تمام اہم منصوبے پاکستان میں تھے اور یہ تمام منصوبے اس امید کو پیش نظر رکھ کر بنائے گئے تھے کہ ہمارے ملک اور علاقے کے اگلے بیس برس بہت مختلف ہوں گے۔ میں نے مظفر آباد میں ہوٹل کی کہانی بیان کی ہے لیکن میری نظر میں

میرا سب سے اہم اور مرکزی منصوبہ وہ ہوٹل ہے جو میں نے گوادر میں تعمیر کیا ہے۔ اسے 2003ء میں صدر مشرف کے ایما پر تعمیر کیا گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ گوادر کی بندرگاہ تکمیل کے قریب ہے مگر گوادر کے نزدیک محض چھے کمروں پر مشتمل ایک چھوٹے سے ہوٹل کے علاوہ اوّل درجے کا کوئی ہوٹل موجود نہیں۔ اس نے مجھ سے یہ خلا پُر کرنے اور پاکستان کی خاطر یہ کام کرنے کی درخواست کی۔

گوادر بلوچستان کا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ شہر مجھے میری پیاری ماں کی جائے پیدائش کی حیثیت سے انتہائی عزیز ہے۔ گوادر کے ذریعے بحیرۂ عرب تک رسائی بہت آسان ہے اور پاکستان ایک عرصے سے گوادر کو بھرپور اور ترقی یافتہ تجارتی شہر کی حیثیت بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ گوادر بنیادی طور پر سلطنت عمان کا حصہ تھا۔ ایوب خان کی حکومت نے اسے 1958ء میں مسقط کے حکام سے خرید لیا جہاں تیل تھا اور نہ ہی پیسہ۔ گوادر کے قدیم قلعے کے سوا یہاں کچھ نہ تھا جہاں عمان کے ایک سابق سلطان نے ایک جنگ لڑی تھی، نیز ایک ویران ساحل بھی موجود تھا۔ کیا گوادر ایک دوسرا کراچی اور پاکستان کی ایک اہم ساحلی بندرگاہ اور تجارتی مرکز بن سکتا تھا؟ 1958ء سے ہی پاکستان کی نسلیں اسے امید افزا نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ 2002ء میں حکومت پاکستان نے ایک چینی کمپنی کو یہاں بندرگاہ کی تعمیر کے لیے کہا۔ اگلے سال مشرف نے مجھ سے ہوٹل تعمیر کرنے کی خواہش کی۔ یہ پس منظر اس لحاظ سے اہم ہے کہ بہت سے میرے بھارتی دوست جو جنگی جنون میں مبتلا ہیں، محسوس کرتے ہیں کہ بندرگاہ گوادر ایک چینی سازش اور بحری اڈہ ہے۔ انہیں یہ ادراک نہیں کہ گوادر میں ایک تجارتی مرکز قائم کرنے کی خواہش عرصہ دراز ہی سے پاکستانیوں کا ایک عزیز ترین خواب رہا ہے۔ اس کا فوجی مفادات یا عالمی سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک بنیادی اور حقیقی خیال ہے کہ گوادر پاکستان کی ایک بڑی اور اہم بندرگاہ کے طور پر پاکستانی عوام اور ان کی معیشت کے لیے واضح توسیعی فوائد کا منبع بن سکتا ہے۔

جب 2007ء میں گوادر کی بندرگاہ کا افتتاح ہوا، اس کا انتظام سنگاپور پورٹ اتھارٹی کے حوالے کر دیا گیا۔ دبئی پورٹس ورلڈ اور ایک چینی کمپنی بھی گوادر کے انتظامی حقوق

کے حصول کی بولی دینے میں دلچسپی رکھتی تھیں لیکن حکومت نے سنگاپور کی ایک کمپنی کو یہ ذمہ داری دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک سٹریٹیجک غلطی تھی کیوں کہ سنگاپوری اس کام کے اہل نہ تھے اور انہیں بندرگاہوں کے منصوبوں کے وسیع تر مضمرات کا ادراک تک نہ تھا۔ گوادر بندرگاہ محض اس وقت ہی مفید ثابت ہوسکتی ہے جب اسے بذریعہ سڑک براہ راست پاکستان کے دل پنجاب تک رسائی حاصل ہو۔ اس کے باعث نہ صرف وسط ایشیائی ممالک اور افغانستان کے لیے پاکستان سے اور پاکستان کے ذریعے تجارت ناگزیر ہو جاتی بلکہ زمین میں گھرے ملکوں کو سمندر تک رسائی مل جاتی۔ یوں مغربی چین سے مغربی ایشیا تک ایک متبادل راستہ فراہم ہوسکتا ہے۔ اب چینیوں نے سنگاپوریوں سے اس کا انتظام حاصل کرلیا ہے اور ایک چینی کمپنی گوادر سے ملتان تک شاہراہ تعمیر کررہی ہے۔ ہمارا ہوٹل جس کا افتتاح 2006ء میں ہوا، ابھی گوادر کی بندرگاہ کو عروج حاصل ہونے اور دنیا سے تجارتی بحری جہاز یہاں آنے کا منتظر ہے۔

پرل کانٹی نینٹل ہوٹل گوادر کو ایک مثالی ہوٹل کے طور پر سراہا جاتا رہا ہے۔ یہ ہوٹل شہر میں نیول کالونی کے قریب کوہِ باتیل نامی ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایستادہ ہے۔ 114 میں سے ہر ایک کمرے سے سمندر کا منظر نظر آتا ہے اور اس میں وسعت کی وسیع گنجائش موجود ہے۔ اس کی تعمیر کے دوران ہمیں افرادی قوت اور سامانِ تعمیر کراچی سے بھیجنا پڑتا تھا۔ ہمیں وہاں مزدوروں کے لیے رہائش کا انتظام کرنا پڑا۔ ہم ایک ایسے ویران علاقے میں ہوٹل تعمیر کررہے تھے جہاں انفراسٹرکچر کی بہت کم سہولیات موجود تھیں۔ میرے کچھ ایگزیکٹو اور ٹھیکیدار لاقانونیت کے باعث متامل تھے لیکن وہ بلوچی مہمان نوازی کے باعث خوشگوار حیرت میں مبتلا ہوئے۔ بلوچستان کو ہر پاکستانی حکومت نے نظرانداز کیا جہاں سماجی اور معاشی سہولیات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہاں چند قدرتی وسائل ہیں جن میں سب سے اہم گیس ہے جو تمام پاکستان کو فراہم کی جاتی ہے۔ بوچی ناراض ہیں اور ان کی ناراضی بجا ہے۔ دورانِ تعمیر میں نے محسوس کیا کہ یہاں کی مقامی آبادی بندرگاہ کی تعمیر کے لحاظ سے ذہنی کشمکش اور حیرت میں مبتلا ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ کیا اس بندرگاہ کی تعمیر سے ان کی زندگیوں میں انقلاب آئے گا یا پھر بیرونی افراد ہی کو فائدہ پہنچے گا۔ یہ ایک جائز سوال تھا۔ ہوٹل میرے

خیال سے کہیں جلد پایہ تکمیل تک پہنچ گیا لیکن فی الحال ہوٹل تقریباً خالی ہے اور رقم ضائع ہونے کا باعث بن رہا ہے۔ 2006ء میں افتتاحی سرگرمیوں کے لیے مجھے ہوٹل کا عملہ اور اشیائے خورونوش کراچی کے اپنے ہوٹل سے بذریعہ ہوائی جہاز یہاں لانی پڑتی تھیں۔ گوادر میں وسائل بہت کم ہیں۔ افتتاحی تقریب کے موقع پر میں نے انگریزی میں جذباتی تقریر کی اور پھر میں نے بلوچی زبان میں تقریر شروع کر دی جس کے باعث مقامی افراد بہت ہی زیادہ خوش ہوئے۔ مشرف جسے بلوچی نہیں آتی تھی اسے معلوم نہیں تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کہیں میں اس کی حکومت پر تنقید تو نہیں کر رہا ہوں۔ تب پرویز مشرف بلوچستان کے وزیر اعلیٰ جام میر محمد یوسف کی طرف متوجہ ہوئے اور استفسار کیا، ''ہاشوانی کیا کہہ رہا ہے؟'' ایک برس بعد مشرف دوبارہ آئے اور ہمارے ہوٹل میں قیام کیا۔ اس دفعہ وہ گوادر بندرگاہ کے افتتاح کے لیے یہاں موجود تھے۔

2013ء میں ہم نے پاکستان میں ہوٹلوں کے تین نئے منصوبوں پر کام شروع کیا۔ پہلا حیات آباد پشاور کے ایک جدید مضافاتی علاقے میں پرل کانٹی نینٹل کا منصوبہ تھا۔ شہر کے چھاؤنی کے علاقے میں پہلے ہی ہمارا پرل کانٹی نینٹل موجود تھا۔ حیات آباد پشاور کا ایک علاقہ ہے جو سماجی میل جول اور کاروباری سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ پشاور، جو خیبر پختونخوا کا دارالحکومت اور افغانستان کا گیٹ وے ہے۔ امکان ہے کہ 2014ء کے اواخر میں امریکی افواج کی واپسی کے بعد اس کی معاشی اہمیت میں اضافہ ہو جائے گا۔ دوسرا ہوٹل میرپور میں ہے جہاں حکومت آزاد کشمیر نے ہمیں ایک تفریح گاہ تعمیر کرنے کی اجازت دی ہے۔ پہلے مرحلے میں 150 کمرے تعمیر کیے گئے۔ ہوٹل کے عقب میں ایک جھیل واقع ہے۔ اس ہوٹل میں تھیم پارک (theme park) جیسی پُرتعیش سہولیات مہیا کی گئیں ہیں۔ اسلام آباد سے میرپور کا فاصلہ بذریعہ گاڑی ایک گھنٹے میں طے کیا جا سکتا ہے اور مجھے کامل امید ہے کہ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کے خوش باش سیاحوں کے لیے یہ ہوٹل باعث کشش ثابت ہوگا۔ آخر میں ملتان میں ایک پرل کانٹی نینٹل ہوٹل کا اولوالعزم منصوبہ ہے۔ ہم یہاں نہ صرف ایک ہوٹل بلکہ 375 بنگلے، مراکز خریداری اور دفتری عمارات بھی تعمیر کر رہے ہیں۔ ان

تمام منصوبوں میں ہوٹلنگ کے میرے گزشتہ منصوبوں کے مانند ان کا ڈیزائن اس طرح تیار کیا جا رہا ہے کہ وہ انداز تعمیر متذکرہ شہر کی اقدار کا حسین امتزاج ہو۔ 2015ء تک یہ تمام ہوٹل تیار ہوں گے اور پھر پاکستان میں ہمارے پاس درجنوں ہوٹل ہوں گے۔ ان کے علاوہ 15 متفرق بجٹ کے حامل ہوٹلوں کی انتظام کاری اور طویل المدت لیز کے لیے بات چیت بھی کر رہے ہیں۔ یہ ہوٹل جو ہماری ملکیت تو نہیں مگر ہماری ایک کمپنی کے زیر انتظام چلائے جا رہے ہیں، انہیں ''ہوٹل ون'' کا نام دیا گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں اپنے ہوٹلوں کو خود چلاتا ہوں اور دوسروں کو اس ذمہ داری میں شریک نہیں کرتا۔ ایک دفعہ ایک دوست نے مجھ سے اس کی وجہ پوچھی۔ میں نے ایک لمحہ کے لیے سوچا اور کہا، ''میرا خیال ہے کہ میں ایک ایسا شخص ہوں جو کسی سے مشورہ نہیں لیتا اور اپنی مرضی سے کام کرتا ہے، جب سے میں دبئی میں آیا ہوں، مجھے حالات نے اپنے رنگ میں نہیں ڈھالا بلکہ میں نے حالات ہی کو اپنے رنگ میں ڈھالا ہے اور ان ہوٹلوں کے ضمن میں بھی میرا یہی فلسفہ ہے!''

☆☆

میں نے ہوٹلنگ کی صنعت میں قدم رکھنے کا آغاز 1980ء کی دہائی میں کیا اور چاہتا ہوں کہ 2020ء تک یہ سلسلہ مزید آگے بڑھاؤں۔ درستگی کی خاطر مجھے واقعات کو ازسرنو ترتیب دینا ہوگا اور وہیں سے آغاز کرنا ہوگا جہاں سے میں نے شروع کیا تھا یعنی ضیاالحق کا دورِ حکومت۔ جب میں نے ضیا دور میں پرل کانٹی نینٹل ہوٹلوں کو اپنی تحویل لے کر کام شروع کیا تو پاکستان کے طاقت ور فوجی حکمران کے ساتھ میرے تعلقات تلخ اور کشیدہ ہی رہے۔

میں نے 1978ء میں انڈس ایئرویز شروع کرنے کی اجازت طلب کی اور ملک کی پہلی نجی ایئرلائن کے انتظام کے لیے پاکستان ایئرفورس سے حال ہی میں ریٹائر ہونے والے ایئر وائس مارشل ایرک ہل (Eric Hall) کی خدمات حاصل کیں۔ مجھے حکومت کی طرف سے اجازت نہیں دی گئی بلکہ ایک اور کمپنی 'شاہین' کو اجازت دے دی گئی۔ 'شاہین' کی حالت کمزور ہوگئی اور اس نے ایئر سروس کے بجائے ''بس سروس'' شروع کر دی۔

ہوٹلنگ کی صنعت کے تجربے اور شعبہ سیاحت کے متعلق گہرے ادراک و شعور کے

باعث مجھے اعتماد تھا کہ میں پاکستان کی طرف سے نہایت ہی شاندار پراجیکٹ پیش کر سکتا ہوں اور اس وقت پاکستان ایک خاصی معقول اور پیشہ ورانہ انداز میں چلائی گئی ایئر لائن پیش کر سکتا ہے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ بعد ازاں جنرل ضیا الحق نے پولیسٹر فائبر پلانٹ کی بھی اجازت نہیں دی جو میں قائم کرنا چاہتا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ہمارے تعلقات انتہائی بگاڑ کا شکار ہو گئے تھے۔ 1980ء کی دہائی میں برف اس وقت پگھلتی محسوس ہوئی جب جنرل ضیا نے باہمی کشیدگی پر کچھ قابو پانے کی کوشش کی۔ شاید اسے ادراک ہو گیا تھا کہ اس نے مجھ سے غلط رویہ اختیار کیا تھا۔ بہر حال جو بھی وجہ تھی اس نے کراچی میں ایک شادی کے موقع پر میرا کھلے عام استقبال کرتے ہوئے برف توڑ دی۔

ایک مشترکہ دوست اے۔ آر۔ شیفتہ جنہوں نے ایک جاپانی خاتون سے شادی کی تھی اور ٹوکیو میں ان کی رہائش تھی، انہوں نے بھی اس مصالحت میں اپنا کردار ادا کیا۔ شیفتہ میرے ہوٹلوں میں ٹھہرا کرتے تھے۔ وہ مجھ سے بہت بڑے تھے لیکن وہ مجھے پسند کرتے تھے۔ وہ جنرل ضیا کے بچپن سے دوست تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ 1987ء کا موسم سرما تھا جب شیفتہ ایک دفعہ اپنے معمول کے دورے پر پاکستان آئے۔ مجھے ایک دن ان کا فون موصول ہوا اور انہوں نے کہا کہ جس قدر جلد ممکن ہو، کراچی کے گیسٹ ہاؤس میں پہنچ جاؤ۔ جیسے ہی میں وہاں پہنچا، صدر دروازے پر شیفتہ نے میرا استقبال کیا۔ انہوں نے میرا بازو کھینچا اور مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ وہاں میں نے جنرل ضیا الحق کو دیکھا جس کے ہونٹوں پر اس کی روایتی مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ ''ہاشوانی، تم کیسے ہو؟'' اس نے ایسے کہا جیسے وہ اپنے کسی پرانے دوست کا استقبال کر رہا ہو۔ میں حیران رہ گیا لیکن میں نے اپنی یہ کیفیت ظاہر نہیں ہونے دی۔ میں نے جواب دیا، ''میں ٹھیک ہوں اور اس لیے یہاں موجود ہوں کیوں کہ شیفتہ نے مجھے بلایا ہے۔ کیا آپ مجھے دوبارہ گرفتار کرانا چاہتے ہیں؟'' جنرل ضیا ہنسنے لگا اور اپنا ہاتھ ہلایا، ''نہیں، میں نہیں بلکہ جونیجو تمہیں گرفتار کرانا چاہتا تھا۔'' اچانک اس دور کی اذیت ناک یادیں میرے ذہن میں ابھر آئیں، بجائے اس کے کہ میں طمانیت محسوس کرتا..... میں قدرے جذباتی اور مشتعل ہو گیا: ''جنرل صاحب، جس نے بھی یہ سب کیا، وہ

اذیت ناک موت مرے گا کیوں کہ اس نے میری پیاری ماں سے بدتمیزی کی۔ میں اپنی متوقع گرفتاری کے باوجود ملک چھوڑ کر نہیں جاؤں گا، میں ان حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں، کیا وجہ تھی کہ میرے افراد خانہ خاص طور پر میری بوڑھی والدہ کو اذیت دی گئی؟ میں کوئی بھاگا نہیں جا رہا تھا۔'' ماحول پر ایک ناخوشگوار خاموشی طاری ہوگئی لیکن شیفتہ نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھتے ہوئے اس موقع پر مزید کسی تلخی کو جنم نہیں لینے دیا اور کہا، ''بہت ناگوار اور مشکل صورت حال تھی لیکن ماضی کو فراموش کر دو اور مستقبل کی طرف بڑھو!''

آئندہ مہینوں میں جنرل ضیا سے میری کئی دفعہ ملاقات ہوئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ان الفاظ کا مداوا کرنے کی کوشش کر رہا ہے جن کے ذریعے اس نے مجھے ناپسندیدہ شخصیت قرار دیا تھا اور میرا چہرہ نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی۔ وہ میرا ہاتھ تھام لیتا اور پوچھتا کہ حالات کیسے جا رہے ہیں، میرے ہوٹلوں اور کاروبار کے متعلق استفسار کرتا۔ مجھے اعتراف کر لینا چاہیے کہ بعض اوقات میں اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ ایک دن اپنے ہوٹلوں کے متعلق بات کرتے ہوئے میں نے اسے بھوربن کے اپنے منصوبے کے متعلق بتایا اور یہ بھی بتایا کہ اس کا خیال مجھے کیسے آیا، میں نے اپنی بیٹیوں کے ساتھ تفریح پر جانے کی بھی کہانی سنائی، میں نے اسے خوبصورت منظر کے متعلق بھی بتایا کہ کس طرح اس کے باعث مقامی معیشت تبدیل ہوسکتی تھی اور اس حوالے سے میں نے اسے ہر تفصیل سے آگاہ کیا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ اس میں واقعی اس منصوبے کے متعلق دلچسپی پیدا ہوگئی ہے اور اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ میں نے اس سے استفسار کیا کہ کیا وہ پرل کانٹی نینٹل بھوربن کا سنگ بنیاد رکھنا پسند کرے گا۔ وہ فوراً ہی رضامند ہوگیا۔ ہم نے اس ضمن میں 8 اگست 1988ء کی تاریخ مقرر کی اور صدارتی دورے کے تمام انتظامات مکمل کر لیے گئے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے ایک فرضی گاؤں تعمیر کیا اور پرتکلف کھانے کا اہتمام کیا۔ 6 اگست کو جنرل ضیا کے سیکریٹری کی طرف سے مجھے ایک پیغام موصول ہوا۔ اس سے ایک دن پہلے ایک ممتاز شیعہ رہنما عارف حسین حسینی کو پشاور کی ایک مسجد کے باہر گولی مار کر قتل کر دیا گیا تھا۔ جنرل ضیا کو اس کی تدفین میں شرکت کرنی تھی کیوں کہ ایک اعلیٰ سطحی ایرانی

وفد بھی آ رہا تھا۔ یوں بھور بن میں ہونے والی تقریب ملتوی کرنا پڑی تھی۔

صورتِ حال مایوس کن لیکن ناگزیر تھی۔ میں نے جنرل ضیا کے سیکریٹری سے بات کی اور اس نے مجھے یقین دلایا کہ ایک نئی تاریخ مقرر کی جائے گی۔ بھاری دل کے ساتھ میں نے وہ دعوت نامے واپس لے لیے جو پہلے ہی بھجوا دیے گئے تھے اور فرضی گاؤں بھی مسمار کرا دیا۔ میں نے کام کے باعث ذہنی دباؤ اور پریشانی کے دوران کچھ تفریح کے لیے اپنے گھرانے کو بینکاک اور سنگاپور لے جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ اس دور میں ایک نجی دورہ تھا جب موبائل فون دستیاب نہیں تھے اور میں نے ہوٹل کے افسران کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ مجھے پریشان نہ کیا جائے۔ یہ وقت میرے بچوں کے لیے مخصوص تھا۔ 18 اگست کی صبح میں نے سنگاپور میں اپنے ہوٹل کے کمرے کے باہر موجود اخبار اٹھایا اور سرخیوں پر سرسری نظر ڈالی۔ جو کچھ میں نے پڑھا، مجھے اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایک دن پہلے جنرل ضیا جہاز کے حادثے میں موت کا شکار ہو گیا تھا۔ اب خیالات کے ایک طوفان نے مجھے حصار میں لے رکھا تھا۔ ماضی کے تمام برسوں کی تلخی اور پریشانی کے باوجود مجھے انتہائی صدمہ پہنچا تھا۔ میں پریشان ہو گیا اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی میں کیا کروں؟ میں جنرل ضیا کی غلطیوں پر پردہ نہیں ڈال سکتا تھا اور اس کی غلطیاں بہت سی تھیں اور پھر میرے لیے اس کا اذیت ناک اور جارحانہ رویہ۔ اس کے باوجود جنرل ضیا پاکستان کے منظرنامے پر گزشتہ ایک دہائی سے موجود تھا۔ اب پاکستان پھر ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔

دو دن بعد میں پاکستان واپس آ گیا۔ ایک نہایت ہی پھیکی اور بے مزہ افتتاحی تقریب کے بعد بھور بن میں تعمیر شروع ہو گئی۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ کوئی حادثہ نہیں تھا اور کچھ نے اسے سرد جنگ کا آخری قتل قرار دیا تھا، بعد ازاں میرے ایک دوست جو ملٹری انٹیلی جینس میں تھے ،انہوں نے بتایا کہ جن لوگوں نے اس فضائی حادثے کی منصوبہ بندی کی، عین ممکن ہے کہ انہوں نے 8 اگست کو بھور بن میں افتتاح کے موقع پر جنرل ضیا کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہو۔ یہ خیال آتے ہی میں لرز کر رہ گیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اس نے ہم سب کو بچا لیا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو بچانا اور اسے ایک نئی راہ پر چلانا تھا۔

باب 9

سیاستدانوں کی دہائی

کسی بھی انسانی نظام میں جب مستحکم اور بہت دیر سے قابض اتھارٹی یک لخت انحطاط پذیر ہوتی ہے یا اسے اچانک منظر عام سے ہٹا دیا جاتا ہے تو افراتفری اور فتنہ وفساد اور ناقابل تصور نتائج کے امکانات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی جگہ لینے کے لیے نئی طاقتیں سامنے آتی ہیں... کچھ مثبت اور کچھ منفی، جبکہ طاقت کا توازن اور اس کے پیمانے بھی بدل جاتے ہیں، طے شدہ تصورات پر سوال اٹھتے ہیں اور ان کی حقانیت کو چیلنج کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ سب کچھ مشرقی یورپ یا وسطی ایشیا کے زیادہ تر حصے میں پیش آیا جب سوویت یونین میں کمیونسٹ حکومتیں 1990ء کی دہائی میں انتہائی ڈرامائی انداز میں زوال پذیر ہوئیں۔ ایک معاشرہ کی حیثیت روس ہی نہیں یہ خطہ بلکہ پوری دنیا اس واقعہ کے جھٹکے اب تک محسوس کر رہی ہے۔ 1988ء میں جنرل ضیا کی موت کے بعد کے برسوں میں کچھ ایسی ہی صورت حال نے قدرے چھوٹے پیمانے پر پاکستان میں بھی جنم لیا۔ ایک ملک اور عوام کی حیثیت سے ہم نے خود کو دوبارہ دریافت کرنے کا آغاز کیا۔ خوفناک اور ہیبت ناک فوجی آمر جا چکا تھا۔ افغان جنگ کے باعث گزشتہ دہائی میں پاکستان کی قومی زندگی کا زیادہ تر حصہ اور اس کے کئی ایک انسانی اور مادی وسائل ضائع ہو گئے۔ جنہیں ہم اپنا دوست سمجھتے تھے اور جنہیں ہم نے اپنے دل میں بٹھایا ہوا تھا، وہ جیت گئے اور سوویت یونین جسے ہم اپنا دشمن سمجھتے تھے اسے شکست ہو چکی تھی۔ جنرل ضیا کی موت کے بعد بے یقینی اور خوف کا عالم طاری

ہوگیا لیکن ایک نئی شروعات کی امید بھی پیدا ہوگئی تھی۔ گردش دوراں کی یہ مثال کیسی دلچسپ ہے کہ ضیاالحق کے گیارہ برسوں میں ہم پاکستان میں ایک حقیقی اور آزاد انتخابات کا انتظار ہی کرتے رہ گئے مگر جب 1988ء میں ضیاالحق کا جہاز تباہ ہوا تو تب سے 1997ء تک کے نو برس کے دوران پاکستان میں ایک دو نہیں بلکہ چار عام انتخابات منعقد ہوئے۔ 1999ء میں پہیہ دوبارہ الٹا اور فوج نے جنرل مشرف کی قیادت میں اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ اس باب کا تعلق ضیاالحق اور مشرف کے درمیان گیارہ سال کے ان زیادہ تر واقعات سے متعلق ہے جو دو وزرائے اعظم (دونوں کی مدت اقتدار نامکمل رہی) کے عرصہ کے علاوہ سیاستدانوں کے دورحکومت پر مشتمل تھا اور یہ میری بلوغت کی زندگی کا سب سے طویل عرصہ بھی تھا۔

جنرل ضیاالحق کی موت کا باقاعدہ اعلان ہوتے ہی غلام اسحٰق خان نے صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ غلام اسحٰق خان ایک سینئر، سچے اور کھرے سول سرونٹ اور سابق وزیرخزانہ تھے۔ شاید قارئین کو یاد ہو کہ انہوں نے پاکستان میں کچھ صنعتوں کی نجکاری میں اہم کردار ادا کیا۔ غلام اسحٰق خان، سینٹ (پاکستانی پارلیمان کے ایوان بالا) کے چیئرمین کے عہدے تک جا پہنچے تھے۔ ضیاالحق کی وفات کے تین ماہ بعد ہی نومبر 1988ء میں عام انتخابات منعقد ہوئے۔ اگرچہ ایوان زیریں میں کوئی بھی جماعت اکثریت حاصل نہ کرسکی مگر کسی نہ کسی طرح بینظیر کی پی پی پی واحد اکثریتی جماعت کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئی۔ پنجاب کے ایک ابھرتے ہوئے سیاستدان نواز شریف کی قیادت میں اسلامی جمہوری اتحاد ایک مضبوط حزب مخالف کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ ہم میں سے کچھ نے محسوس کیا کہ اس وقت پاکستان دو جماعتی یا دو قطبی سیاسی نظام کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں centre-left اور centre-right کے درمیان ہی مسابقت کا عمل جاری رہے گا۔ جب بینظیر نے پاکستانی وزیراعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا تو وہ نہ صرف پاکستان بلکہ ایشیا کی بھی ایک مشہور شخصیت تھیں۔ وہ اسلامی دنیا کی ذہین اور حاضر دماغ خاتون قائد تھیں۔ علاوہ ازیں وہ ایک پرکشش نوجوان خاتون تھیں اور یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ان سے کوئی غلطی نہ ہوگی۔

بدقسمتی سے اپنے والد کے مانند وہ بھی یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ وہ عقل کل ہے اور محض اس

وجہ سے اس نے نقصان بھی اٹھایا۔ بینظیر سے میری ملاقات 1989ء میں اس وقت ہوئی جب راولپنڈی میں عزت مآب پرنس کریم آغا خان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد ہوئی جو پاکستان کے دورے پر تھے۔ یہ بینظیر کے عہد اقتدار کا آغاز تھا لیکن واضح طور پر نظر آ رہا تھا کہ وہ کوئی مشاق، منجھی ہوئی اور ماہر منتظم نہیں ہیں۔ غلام اسحٰق خان اور بینظیر کے درمیان آئے روز اختلافات پیدا ہونے لگے اور بالآخر بینظیر کو وزیراعظم کا عہدہ سنبھالے محض بیس ماہ ہی ہوئے تھے کہ صدر نے اس کی حکومت برخاست کر دی اور قومی اسمبلی (ایوان زیریں) تحلیل کر دی۔ اکتوبر 1990ء میں نئے انتخابات کرانے کا اعلان کیا گیا۔ بینظیر کی معزولی، متنازع بھی تھی لیکن اسے خوش آمدید بھی کہا گیا تھا۔ اسے ایک نہایت عجیب وغریب مظہر کے طور پر دیکھنے کے علاوہ اس دور کی پیچیدہ صورت حال کے تناظر میں سمجھا جا سکتا تھا۔ غلام اسحٰق کی طرف سے بینظیر حکومت کو برطرف کرنے کے فیصلے کی بنیاد آئین کی آٹھویں ترمیم تھی۔ یہ ضیاالحق کے دور میں کی جانے والی ایک ایسی ترمیم تھی جس کا مقصد صدر کو ایک سیاسی وزیراعظم کو معزول کرنے کا اختیار دینا تھا۔ یہ ضیاالحق کی حفاظتی چھتری تھی جب اس نے 1985ء میں ایک کنٹرولڈ سیاسی حکومت قائم کی اور کچھ اختیارات ایک سیاسی وزیراعظم محمد خان جونیجو کے حوالے کر دیے۔ کسی کو توقع ہی نہیں تھی کہ یہ اختیارات ایک علامتی صدر جمہوریت کی بحالی کے بعد بھاری اکثریت سے منتخب وزیراعظم کے خلاف استعمال کرے گا۔ غلام اسحٰق خان نے اپنے اس کردار کو قدرے مختلف انداز میں محسوس کیا۔ اس نے صدارت کو ایمان داری اور اخلاقیات کے محافظ کے علاوہ پاکستانی عوام کے آخری سہارے کے ضامن کے طور پر سمجھا۔ وہ ایمان دار تھا لیکن وہ افسر شاہی کے انداز کا تنگ نظر اور اصول پرست بھی ہوسکتا تھا۔ واضح رہے کہ جمہوریت کے کوئی طے شدہ حتمی ضابطے نہیں ہوتے اور یہ پہلے سے تحریر شدہ قوانین کی بھی محتاج نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست دان اور قواعد وضوابط کے پابند بیوروکریٹس اپنی اپنی طرف سے نیک عزائم رکھنے کے باوجود بعض اوقات ایک دوسرے کی دنیاؤں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اسی سوچ کے تحت غلام اسحٰق خان نے 1990ء میں بینظیر اور 1993ء میں نواز شریف کی حکومت ایک جیسے الزامات کے تحت برخاست کر دی۔ اگر غلام اسحٰق

خان بصیرت سے کام لیتے، اپنی لیاقت اور اثر و رسوخ کا بہتر استعمال کرتے تو کیا وہ دونوں یا کسی ایک وزیراعظم کی حکومت ختم کرنے کے بجائے انہیں غلطیوں کی اصلاح پر مجبور کر سکتے تھے؟ میرا خیال ہے کہ اس سے متعلق کچھ کہنا آسان نہیں۔

بہر حال میں اپنی کہانی کو آگے بڑھاتا ہوں۔ 1990ء میں جب بینظیر کو اس کے عہدے سے معزول کیا گیا تو عوام نے اس بات پر سکھ کا سانس لیا کہ وہ بدعنوان اور انتہائی مایوس کن حکومت ختم ہوگئی جس کی ساکھ نہایت تیزی کے ساتھ گرگئی تھی۔ بینظیر کی حکومت پاکستان کو درپیش معاشی مشکلات پر قابو نہیں پا سکی۔ بینظیر کی کچن کیبنٹ اور ان کے شوہر نے لاقانونیت اور جرائم کی جس صورت حال کو پروان چڑھایا اس نے حکومت اور معاشرے پر دیرپا اثرات چھوڑے۔ میں بذات خود اس صورت حال سے دوچار رہا۔ اسی دوران 1990ء میں مجھے اپنی جائے پیدائش کراچی سے اسلام آباد منتقل ہونا پڑا۔ اس منتقلی کے لیے میرا کوئی پیشگی منصوبہ نہ تھا اور نہ ہی آپ اسے کاروباری فیصلہ کہہ سکتے ہیں۔ درحقیقت یہ اپنے گھرانے کو ان جرائم پیشہ عناصر سے بچانے کی کوشش تھی جن کی پشت پناہی وہ سیاسی قوتیں کر رہی تھیں جو مجھے کراچی میں نشانہ بنانا چاہتی تھیں۔ اس کے برعکس ملک کا دارالحکومت ایک ایسا حساس اور محفوظ علاقہ تھا جہاں میرے دشمن مجھ پر حملہ آور ہونے کی منصوبہ بندی کرنے سے پہلے سو بار سوچنے پر مجبور ہوتے کیوں کہ اس شہر میں ہونے والی کسی بھی کارروائی پر میڈیا اور سیاسی و فوجی اسٹیبلشمنٹ کے کان کھڑے ہو جاتے۔ اب میں جس شخص کا ہدف تھا، وہ آصف علی زرداری کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ جیسے ہی اس کی بیوی اقتدار میں آئی، زرداری اور اس کے حواریوں نے سرکاری افسروں کو میری کمپنیوں کے متعلق تفتیش کرنے پر لگا دیا تاکہ کوئی ایسا ثبوت تلاش کیا جائے کہ جنرل ضیا نے کبھی مجھے کچھ مدد و معاونت فراہم کی تھی۔ قسمت کی ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے! ایک دہائی قبل جنرل ضیا نے مجھے اس لیے انتقام کا نشانہ بنایا کہ اس کے مطابق ذوالفقار علی بھٹو نے مجھے مدد و معاونت فراہم کی تھی۔ اب بینظیر حکومت اس شک کی بنا پر مجھے اپنا نشانہ بنا رہی تھی کہ میں نے ضیا سے مدد و معاونت حاصل کی تھی۔ چوں کہ زرداری مجھ سے اپنا ذاتی انتقام لینا چاہتا تھا جس کا تعلق 1983ء میں کراچی میں ڈسکو کلب

(باب ۸ ملاحظہ کیجیے) کے واقعہ سے تھا۔ مگر زرداری اس قسم کا سلوک دیگر کاروباری اور دولت مند افراد سے بھی روا رکھے ہوئے تھا کیوں کہ وہ اپنی بیوی کی انتخابی فتح کو دولت بٹورنے کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ میرے دوست اور وہ سرکاری ملازم جو مجھے جانتے تھے، ششدر رہ گئے۔ سابقہ حکومت سے کوسوں دور ہونے کے باوجود مجھے جنرل ضیا کی حکومت نے انتقام کا نشانہ بنایا اور پھر مضحکہ خیز بات یہ کہ مجھے پی پی پی کا ہمدرد سمجھا جا رہا تھا۔ لیکن زرداری جن دستاویزات کی تلاش میں تھا جن کے باعث مجھے کسی بھی جرم میں ملوث کیا جا سکے، اُن کا کہیں وجود نہ تھا۔ میرے بہی خواہوں نے مجھے خبردار کیا کہ میں حکومت کی نظروں میں پسندیدہ نہیں ہوں حالانکہ وہ اس کی وجہ بھی نہیں جانتے تھے۔ جب وزیراعظم نے پاکستان کی معاشی اور تجارتی حالت کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے کاروباری افراد کو مدعو کیا تو مجھے جان بوجھ کر شامل نہیں کیا گیا۔ شاید زرداری منتظر تھا کہ میں اس کے دروازے پر حاضری دوں لیکن میں تو جانے والا نہیں تھا۔

ایک دن زرداری نے مجھے فون کیا۔ بہت سال پہلے میں نے ایک پارسی خاندان سے ایک قطعہ زمین خریدا تھا۔ زرداری نے کہا، ''میں یہ قطعہ زمین خریدنا چاہتا ہوں کیوں کہ اس قطعہ زمین سے ملحقہ قطعہ زمین پر میرا ایک منصوبہ زیرِ تعمیر ہے۔ اگر میں یہ قطعہ زمین بھی اس میں شامل کرنے پر رضامند ہو جاؤں تو یہ بہت بڑی معاونت ہو گی۔'' میں نے حامی بھر لی۔ ''آپ اس کی قیمت کیا دیں گے؟'' میں نے حکمت سے کام لیتے ہوئے کہا، ''میں نے اسے برسوں پہلے بالکل صحیح قیمت دے کر خریدا تھا۔'' میں نے اسے اپنی قیمتِ خرید پر فروخت کرنے کی پیشکش کی حالانکہ گزرے برسوں کے دوران اس کی قیمت میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا تھا اور اس کی موجودہ قیمت بہت زیادہ تھی۔ زرداری مطمئن نہیں تھا۔ جب وہ اس معاہدے کو آخری شکل دینے کے لیے گھر آیا تو میں اسے باور کرا سکتا تھا کہ تم یہ پلاٹ مفت ہتھیانا چاہتے ہو مگر میں نے اس قسم کے اشارے نظر انداز کر دیے۔ میری کوئی خواہش نہیں تھی کہ میں اسے یہ قطعہ زمین بطور تحفہ یا رشوت دوں اور پھر اس کی طرف سے منتظر رہوں کہ ملکی خزانے کا استعمال کرتے ہوئے مجھے کب فائدہ پہنچاتا ہے۔ میں نے تو کبھی اس طرح

کاروبار نہیں کیا تھا۔ آخر کار میں نے یہ پلاٹ قیمت خرید پر فروخت کر دیا۔ زرداری سے ملاقات اور اس قطعہ زمین کی زرداری کو فروخت نہایت ہی ناخوشگوار تجربہ تھا جس نے مجھے اس کی حریص طبع اور کردار سے پوری طرح آشنا کر دیا۔

بہر کیف زندگی اپنی منازل طے کرتی رہی۔ 22 دسمبر 1989ء کو میری پیاری والدہ مجھ سے جدا ہو گئیں اور میں بکھر گیا۔ میرے والدین اس دنیائے فانی سے کوچ کر چکے تھے۔ میرا پسندیدہ بھائی حسن علی بھی وفات پا چکا تھا اور اب صرف اکبر ہی زندہ تھا جس کے ساتھ میرے تعلقات کشیدہ تھے۔ میں اب خود کو تنہا اور اداس محسوس کر رہا تھا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ کور کمانڈر کراچی جنرل آصف نواز جنجوعہ میرے بہت ہی قریبی دوست تھے۔ جنرل آصف نواز جو افواج پاکستان کی تاریخ کے نہایت ہی نفیس شخص اور ایک انتہائی پیشہ ور فوجی تھے جو بعد ازاں آرمی چیف بنے۔ 1990ء میں جنرل آصف نواز جنجوعہ نے مجھے ایک بہت ہی بڑے خطرے سے بچا لیا۔ یہ کہانی اس قابل ہے کہ اسے بیان کیا جائے کیوں کہ یہ کہانی اس دھوکے بازدنیا اور سازشوں کے متعلق ایک بصیرت افروز آگہی مہیا کرتی ہے جن کا سامنا پاکستان کے ایک عام کاروباری فرد کو بھی کرنا پڑتا ہے۔ میری والدہ کی وفات کو ابھی چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ میں نے محسوس کیا کہ میری کار کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ جب میں ہر صبح کام کے سلسلے میں باہر نکلتا یا پھر شام کے اوقات میں ملاقاتوں یا سماجی میل ملاپ کے لیے جاتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ میں نے قدرے پریشانی کے عالم میں اپنے لیے اپنی کار میں ایک محافظ رکھنا شروع کر دیا جو میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہوتا۔ اب بھی کچھ اجنبی افراد میرے اردگرد رہتے، میرے قریب آنے کی کوشش کرتے، میرے ساتھ بات کرنے کی کوشش کرتے، حتیٰ کہ کسی نہ کسی بہانے میرے دفتر بھی آتے کہ جیسے وہ ملازمت یا رہنمائی کی تلاش میں ہوں یا پھر میرے ساتھیوں کے ساتھ مختصر سی گفتگو بھی کرتے۔ ایک روز بعد دوپہر میں نے اپنے ایک بینکار دوست کی طرف سے فون موصول کیا۔ ایک دوسرے کے ساتھ گپ شپ کے بعد اس نے مجھے ایک ایسی بات بتائی جس نے مجھے ہکا بکا کر دیا۔ اس نے کہا، ''ہاشوانی صاحب! آپ کو یاد ہوگا کہ پاکستان سروسز لمیٹڈ کے تمہارے حصص کی دستاویزات

یونائیٹڈ بینک آف پاکستان کے لاکر میں پڑی ہیں، براہ کرم یہ دستاویزات یہاں سے نکال لو اور انہیں کسی دوسری جگہ رکھ دو، ان کسی کی بری نظر ہے۔'' یہ ایک الجھا ہوا پیغام تھا جس کے باعث میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ پاکستان سروسز لمیٹڈ وہ سرپرست کمپنی تھی جس کی ملکیت میں پرل کانٹی نینٹل ہوٹل تھے۔ اس کے حصص یونائیٹڈ بینک کے پاس رہن تھے اور ان کے عوض قرضے لیے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بااقتدار اور بارسوخ شخص اس بنیاد پر ان حصص کو ہڑپ کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ میں نے ان پر منافع ادا نہیں کیا یا پھر ان حصص کو سرے سے غائب ہی کر دیا جائے۔ یہ تو قطعی غیر قانونی ہوتا لیکن اس کے باعث مجھے بے شمار مسائل پیش آتے اور میں ایک نہ ختم ہونے والی قانونی جنگ میں مصروف ہو جاتا۔ فوراً ہی میں نے یونائیٹڈ بینک کا قرضہ ادا کیا، حصص کی دستاویزات اپنی تحویل میں لیں اور انہیں ایک ایسے بینک میں محفوظ کر دیا جہاں سیاسی مداخلت کا خطرہ انتہائی کم تھا۔

ان واقعات نے مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ زرداری کا ان واقعات کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق ہوسکتا تھا لیکن میں اس ضمن میں غیر یقینی کیفیت میں مبتلا تھا۔ بہرحال، وہ وزیراعظم کا شوہر اور ملک کا انتہائی طاقتور ترین شخص تھا۔ لہٰذا میں کیا کرسکتا تھا؟ ایک دن میں معروف قانون دان اور آئینی ماہر رفیع رضا کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا جو بھٹو دورِ حکومت میں وزیر رہے اور بعدازاں لندن منتقل ہو گئے تھے۔ یہ ایک طویل اور پُرتکلف کھانا تو تھا ہی مگر ہمارے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا کیوں کہ ہماری ملاقات کئی ماہ کے بعد ہوئی تھی۔ جب ہم ریستوران سے رخصت ہوئے تو میں فی الواقع دوڑتا ہوا اپنی کار تک گیا اور جلدی سے کار دوڑاتا ہوا کاٹن ایکسچینج بلڈنگ جا پہنچا جہاں میرا دفتر واقع تھا۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا، مجھے بتایا گیا کہ کچھ لوگ گھنٹوں سے مجھ سے ملاقات کے منتظر ہیں۔ میں قدرے حیران ہوا کیوں کہ اس قسم کی کوئی ملاقات طے شدہ نہیں تھی۔ جب میں سیڑھیوں کے ذریعے پہلی منزل پہنچا تو مجھے تین افراد نظر آئے جنہیں میں پہچانتا نہیں تھا۔ ان میں سے پہلا شخص سانولے رنگ کا تھا جس نے کمرے کے اندر بھی سیاہ چشمہ پہنا ہوا تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکا اور میں گھبرا گیا کیوں کہ میں تو وہ شخص تھا جو لوگوں کی

آنکھوں میں جھانک کر ان کے ارادے بھانپ لیا کرتا تھا۔ اب مجھے خاص طور پر کچھ بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ضرور تھی۔ میں نے سندھی میں پوچھا، ''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' جس شخص نے چشمہ پہنا ہوا تھا، اس نے جواب میں کہا، ''مہران یونیورسٹی میں 19 جنوری (1990ء) کو ایک تقریب ہو رہی ہے جس کے لیے ہم آپ سے چندہ لینے آئے ہیں۔'' مجھ پر اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی مگر میں نے یکدم جواب دیا، ''میں آج تمہیں چیک دے سکتا ہوں، لیکن اگر تمہیں نقد رقم چاہیے، براہ کرم کل تشریف لائیں۔'' اس شخص نے کہا، ''ٹھیک ہے، ہم کل آئیں گے۔'' رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے مجھے تقریب کا دعوت نامہ تھما دیا۔

میں اپنی نشست پر چلا گیا اور دعوت نامہ پڑھا۔ یہ ایک ایسی تقریب کا دعوت نامہ تھا جس کی صدارت پی پی پی کا ایک سینئر رہنما اور شہری حقوق کا ایک کارکن پی۔ کے۔ شاہانی کر رہا تھا۔ شاہانی ایک چارٹرڈ سرویئر تھا اور میری ایک کمپنی کا مشیر تھا اور ہم سے ایک چھوٹی سی رقم بطور فیس وصول کیا کرتا تھا۔ مجھے قدرے اطمینان محسوس ہوا۔ اگرچہ میرے شکوک ختم نہ ہوئے تھے مگر میں نے سوچا شاید انہیں شاہانی نے بھیجا ہو۔ جیسے ہی یہ تینوں اشخاص میرے دفتر سے باہر نکلے، میں نے اپنے ایک آفس اسسٹنٹ کو ان کا تعاقب کرنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرے پاس آیا اور بتایا کہ اس نے چند منٹ ان کا تعاقب کیا اور انہیں ایک دوسرے سے کہتے سنا، ''یہ وہی شخص ہے......!'' میں نے شاہانی کو فون کر کے اسے فوراً یہاں آنے کو کہا۔ جب میں نے اسے دعوت نامہ دکھایا تو اس نے کہا، ''یہ جعلی ہے کیوں کہ مہران یونیورسٹی میں ایسی کوئی تقریب منعقد نہیں ہو رہی تھی۔'' میں ہوشیار ہو گیا اور میں نے فوراً ہی پولیس میں اپنے دوستوں کو فون کیا۔ انہوں نے تینوں افراد کا حلیہ اپنے پاس درج کر لیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ جس شخص نے سیاہ چشمہ پہنا ہوا تھا، وہ بشیر قریشی ہے اور دیگر دو افراد میں سے ایک فرد اس کا دست راست لغاری تھا۔ وہ دونوں بدنام مجرم تھے اور جئے سندھ تحریک کا حصہ تھے جس نے سندھی شناخت کو اجاگر کرنے کے لیے ایک سماجی و سیاسی پلیٹ فارم کا آغاز کیا تھا لیکن جلد ہی اس تحریک میں سماج دشمن عناصر اور جھگڑالو طلبہ نے اپنی جگہ بنا لی جو جرم اور رقم اینٹھنے کی طرف

متوجہ ہو گئے تھے۔ بشیر اس گروہ کا سب سے جارح رکن تھا بلکہ ایک قسم کا سرغنہ تھا۔

اگلے دن یہ تینوں افراد نہیں آئے لیکن تفکرات اور خدشات نے مجھے گھیر لیا تھا۔ میں نے محسوس کر لیا کہ میری مستقل نگرانی کی جا رہی ہے۔ میں نے اس ضمن میں جنرل آصف نواز سے مشورہ کیا اور اس نے مجھے کہا کہ میں روزانہ اپنے آنے جانے کا راستہ تبدیل کر لیا کروں اور گھر کے علاوہ دفتر میں بھی حفاظتی عملے میں اضافہ کر دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا مگر مجھ پر مسلط وہ احساس رفع نہ ہوا کہ میری نگرانی کی جا رہی ہے۔ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی کوئی بڑا واقعہ، کوئی ہولناک صورت حال مجھے پیش آنے والی ہے۔ میں نے 14 جنوری کو اپنے بچوں کے لیے ٹکٹ خریدے اور انہیں دبئی اور پھر لندن بھجوانے کا منصوبہ بنایا۔ میں نے اس ضمن میں کسی کو کچھ نہیں بتایا لیکن میں نے اپنی والدہ کا چہلم، روایتی چالیس دن کے بجائے اکیس دن بعد کرنے کی تیاری کر لی۔ 13 جنوری کی شام میں نے اپنے گھرانے کو تیاری کرنے کا کہہ دیا۔ 14 جنوری کی صبح کو جب میری اور میرے بچوں کی پرواز میں محض گھنٹے ہی رہ گئے تھے، مجھے جنرل آصف نواز کی طرف سے فون موصول ہوا۔ ابھی صبح کے آٹھ بھی نہیں بجے تھے لیکن واضح طور پر اس کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ اس نے کہا، ''تیس منٹ کے اندر میرے دفتر پہنچ جاؤ لیکن کور ہیڈ کوارٹرز کا معمول کا راستہ استعمال کرنے کے بجائے کسی دوسرے راستے سے آؤ، احتیاط کرنا اور ہوشیار رہنا۔'' پچیس منٹ بعد انہوں نے مجھے دوبارہ فون کیا۔ میں گھر سے ابھی نہیں نکلا تھا اور وہ پریشان تھے کیوں کہ مجھے ان کے پاس آنے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ انہوں نے فون بند کرنے سے پہلے مجھے دوبارہ جلدی آنے کی تاکید کی۔ جب میں کور ہیڈ کوارٹرز پہنچا تو جنرل آصف نواز کے عملہ کے ارکان، صدر دروازے پر میرے منتظر تھے۔ وہ مجھے اس کمرے میں لے گئے جہاں میری ملاقات مہران فورس کے سینئر افسران سے ہوئی۔ مہران فورس، پاکستانی بری فوج کا ایک ایسا حصہ ہے جسے سندھ میں داخلی تحفظ کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ (اب مہران فورس، پاکستان رینجرز، سندھ کا ایک حصہ ہے)۔ مجھے ایک خط دکھایا گیا جو مہران فورس کے کمانڈروں نے حکومت سندھ کو لکھا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ مجھے تحفظ فراہم کیا جائے کیوں کہ مجھے اغوا کاروں سے خطرہ

ہے۔ دو ہفتے قبل، قریشی اور لغاری کو جیل سے رہا کر دیا گیا تھا۔ جب انہیں ان افراد کی اچانک رہائی کا علم ہوا تو انہیں اندازہ ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ضرور ہے۔ انہوں نے سندھ کے وزیر اعلیٰ قائم علی شاہ سے رابطہ کیا۔ انہیں یہ علم نہ تھا کہ قریشی کو رہا کر دیا گیا ہے۔ اس سے اگلے دن قائم علی شاہ نے جنرل آصف نواز کو بتایا کہ ان دونوں کو اسلام آباد سے احکامات ملنے پر رہا کیا گیا ہے۔ یہ ظاہر تھا کہ انہیں کسی خاص مقصد کے لیے جیل سے رہا کیا گیا تھا۔ اس پر فوج نے اپنے مخبروں کو فعال کیا اور معلوم ہوا کہ قریشی اور لغاری کو صدر الدین ہاشوانی کو اغوا اور ہلاک کرنے کا ٹاسک دیا گیا ہے۔ سازش کی تفصیلات مجھے بتائی گئیں۔ منصوبہ کے مطابق 19 جنوری کو ہاتھ آئی لینڈ سے نکلتے ہی میری کار روک لی جاتی، میرے محافظ کو گولی مار کر قتل کر دیا جاتا اور مجھے اغوا کر لیا جاتا۔ پھر مجھے ان کاغذات پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا جس کے باعث میں اپنی جائیداد خصوصاً ہوٹلوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا اور مجھے دریائے سندھ میں پھینک دیا جاتا۔

اس موقع پر جنرل آصف نواز نے کہا، ''اب تمہیں جانا ہی ہوگا، ہم تمہارے اسلام آباد جانے کے حق میں بھی نہیں کیوں کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ زرداری کیا کرے گا۔ میری تجویز ہے کہ تم لاہور چلے جاؤ، میں پہلے ہی تمہارے تحفظ کے لیے نواز شریف سے بات کر چکا ہوں۔'' اس وقت نواز شریف پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔ میں نے کہا کہ میں شکر گزار ہوں اور میں سمجھ گیا ہوں کہ میرے اردگرد ہجوم کیوں ہے جو میری نقل و حرکت پر مستقل نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ تاہم لاہور کے بجائے میں بیرون ملک جانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا، ''میں نے پہلے ہی دبئی جانے کے لیے چار بجے کی پرواز میں نشستیں محفوظ کروالی ہیں۔ میرے بچے بھی میرے ساتھ ہی آ رہے ہیں۔ میں انہیں لندن لے جاؤں گا اور انہیں بورڈنگ سکول میں داخل کرا دوں گا۔'' میں وردی میں ملبوس محافظوں کے دستے کی حفاظت میں گھر چلا گیا اور وہاں سے ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔ ایئرپورٹ کی طرف سفر اور میرے تحفظ کے لیے کیے گئے انتظامات ابھی تک میری یادداشت میں محفوظ ہیں۔ ہماری کاروں کے آگے اور پیچھے فوجیوں کے دو دو ٹرک تھے۔ میرے دونوں اطراف فوجی محافظ موجود تھے۔ میں نے

حسن علی کو سرے کے ایک سکول ،مل فیلڈ میں داخل کرا دیا جہاں میرا بڑا بیٹا مرتضیٰ پہلے ہی پڑھ رہا تھا۔ حسن علی کی عمر 12 برس تھی اور مل فیلڈ میں عموماً 13 برس کے بچوں کو داخل کیا جاتا تھا۔ میں نے حسن علی کے لیے رعایت حاصل کرنے کے لیے ہیڈ ماسٹر کو کہا کیوں کہ حسن علی کی عمر 13 برس سے چند ہی ماہ کم تھی ۔ پھر میں نے اپنی دو بڑی بیٹیوں نادیہ اور شازیہ کو سوئٹزرلینڈ کے ایک بورڈنگ سکول میں داخل کرا دیا۔ تاہم سارہ ابھی بہت چھوٹی تھی ۔ لندن واپس آنے پر میں نے پارک لین کے علاقے میں ایک مکان کرائے پر حاصل کیا اور وہاں قیام کیا کیوں کہ آصف نواز نے مجھے نصیحت کی تھی کہ میں کراچی سے دُور رہوں ۔

تین ماہ بعد حالات اچھے معلوم ہونے لگے تھے ۔ یہ خبر پھیل گئی تھی کہ آصف زرداری نے ایک مشہور کاروباری کو اغوا کرنے اور ہلاک کرنے کی سازش کی تھی ۔ اسی دوران جنرل آصف نواز کو چیف آف جنرل شاف کے عہدے پر ترقی دے دی گئی تھی ، جو بری فوج کے سربراہ سے ایک درجہ کم عہدہ تھا اور اسے راولپنڈی تعینات کر دیا گیا تھا جہاں پاکستانی بری افواج کا صدر دفتر واقع ہے ۔ اس نے مجھے مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ میں کراچی سے بوریا بستر لپیٹوں اور اسلام آباد میں مستقل قیام پذیر ہو جاؤں ۔ اس ملکی دارالحکومت میں جو افسر شاہی ،فوج اور سفارت کار ہمیت اقتدار کے دیگر مراکز کے بالکل قریب تھا۔ ممکن ہے کہ زرداری محتاط ہوگیا ہو۔ میں نے اسلام آباد میں گھر کرائے پر لے لیا۔ کچھ عرصہ بعد میں میری بڑی بیٹی نادیہ کی شادی ہوگئی اور وہ اپنے خاوند کے ساتھ اسلام آباد چلی آئی اور میرے گھر کے قریب ہی ایک گھر میں رہنے لگی ۔ میں اکثر لندن چلا جاتا اور بالآخر ہیروڈز (Harrods) کے قریب ہانس پلیس (Hans place) میں ایک گھر مختصر عرصے کے لیے لیز پر حاصل کر لیا تاکہ دونوں بیٹے ہر ہفتہ وار تعطیل پر ''گھر آ سکیں'' ۔ چوں کہ حسن علی کو یہ سکول پسند نہیں تھا اس لیے تقریباً دو برس بعد میں نے حسن علی کو مل فیلڈ سے ہٹا لیا اور ایک بہت ہی مشہور سوئس سکول 'لی روزے' میں داخل کرا دیا۔ سارہ بھی یہیں داخل ہوگئی ۔ایک برس تک میں باقاعدگی کے ساتھ ان کے ہاں جاتا رہا اور اس فکر میں غلطاں رہا کہ وہ اپنے گھر سے بہت دور ہیں اور پاکستان کے سماجی ماحول میں ان کی پرورش نہیں ہو رہی ۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ

مغربی ماحول میں پروان چڑھنے کے بعد پاکستانی ماحول میں اجنبیت محسوس کریں۔ تقریباً ایک سال بعد میں حسن علی اور سارہ کو واپس پاکستان لے آیا اور اسلام آباد میں امریکن سکول میں داخل کرادیا۔ اب ان کے لیے اچھی اور عالمی معیار کی تعلیم یقینی ہوگئی تھی اور وہ پاکستان میں میرے ساتھ رہ سکتے تھے۔ مرتضیٰ جو ابھی تک مل فیلڈ میں تھا، اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے امریکہ چلا گیا۔ دریں اثنا میں اسلام آباد میں مستقل آباد ہوگیا اور پھر میں نے ایک قطعہ زمین پر مکان تعمیر کرلیا۔ جو قطعہ زمین اور اس پر بنا ہوا پرانا مکان میں نے خریدے، جنرل ایوب خان کی ملکیت تھے۔ ایوب خان کی فیملی نے اسے پنجاب ٹورازم کارپوریشن کے ہاتھ بیچ دیا تھا اور پھر اس کارپوریشن نے اسے میرے ہاتھ فروخت کردیا۔ جو مکان میں نے بنایا، اسلام آباد میں اب بھی یہی میرا گھر ہے۔

☆☆

اگست 1990ء میں غلام اسحٰق خان نے اپنے صدارتی اختیارات استعمال کرتے ہوئے بینظیر حکومت کو معزول کردیا۔ نومبر 1990ء میں عام انتخابات کا اعلان کیا گیا جس میں نواز شریف کی قیادت میں ایک اتحاد جیت گیا۔ میری نواز شریف سے تھوڑی بہت آشنائی تھی۔ وہ ایک معزز اور قابل احترام کاروباری کا بیٹا تھا اور وہ ہمیشہ مجھ سے خوش اخلاقی سے پیش آتا۔ میں نے اسے ایک عملی انسان پایا جو سوشل ازم کے کتابی نظریات کے علاوہ بھٹو کی لفاظی سے بہت دور تھا۔ وہ معاشی مسائل کے علاوہ پاکستان میں موجود وسائل اور امنگوں سے خوب واقف تھا۔ نواز شریف اپنی پہلی مدت اقتدار میں 1990ء سے 1993ء تک وزیراعظم رہا اور بعدازاں غلام اسحٰق خان نے اس کی حکومت برطرف کردی۔ سچ تو یہ ہے کہ نواز شریف کا یہ دور پاکستان کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہوا۔ اس نے جنرل آصف نواز جنجوعہ کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کردیا اور معیشت پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہوئے نیشنل اکنامک ری کنسٹرکشن پروگرام شروع کیا۔ انہوں نے نجکاری کے ایک تیز رفتار عمل کا آغاز کیا جو 1970ء کی دہائی میں بھٹو کی طرف سے قومیانے کی پالیسی کے اثرات زائل کرنے کی پہلی بھرپور کوشش تھی۔ نواز شریف کے ایجنڈے میں نجی شعبے میں سرمایہ کاری، صنعتکاری، توانائی

اور شاہراہوں کے منصوبے نیز اولوالعزم اصلاحات شامل تھیں ۔میری دانست میں یہ پاکستان کی تاریخ کی سب سے زیادہ کاروبار دوست پالیسی تھی ۔لہٰذا میں اپنے اور اپنے ملک کے لیے بہت خوشی محسوس کر رہا تھا۔

پھر میں اسلام آباد کے سماجی ماحول میں رچ بس گیا۔میریٹ ہوٹل نے مجھے مقامی معاشرے میں ایک بلند مرتبہ اوراعلیٰ منصب عطا کیا۔میں ایک اعلیٰ اوراہم شخصیت بن چکا تھا۔وزراء،سرکاری ملازمین،کاروباری شخصیات،اعلیٰ افسران اور سفارتکاروں سمیت تمام اہم شخصیات سے میری شناسائی ہوگئی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام شادیوں سے لے کر کانفرنسوں تک تمام سماجی تقریبات میریٹ میں منعقد ہوتیں جواس وقت اسلام آباد کا بہترین ہوٹل بن چکا تھا۔اس عرصے کے دوران بینظیر جواس وقت حزب مخالف کی رہنما تھیں، میرے گھر چائے پینے آئیں ۔ان کے ساتھ فاروق لغاری تھے جو بعدازاں صدر مملکت بنے اور پارٹی کے دیگر سینئر ارکان بھی تھے تاہم زرداری کی غیر حاضری محسوس کی جاسکتی تھی ۔میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ کیا بینظیر کوعلم تھا کہ اس کے خاوند نے کراچی میں میرے ساتھ کیا کیا اور وہ میرے خلاف سازش میں کس حد تک ملوث تھا۔شاید بینظیر کا یہ دورہ اس لیے تھا کہ میں ماضی کوفراموش کردوں ۔

1993ء کے سال کا آغاز کچھ اچھا نہیں ہوا کیوں کہ جنرل آصف نواز کی موت واقع ہوگئی ۔اس خبر سے مجھے کتنا دکھ پہنچا یہ بتانے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں ۔ 3 جنوری کو میں جنرل آصف نواز کے قریبی اہل خانہ اوران دوستوں میں شامل تھا جو جنرل آصف نواز کی 56ویں سالگرہ منانے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ہم نے لہک لہک کر''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو'' گایا اور میں نے دعا کی اللہ انہیں عمر دراز عطا کرے۔انہوں نے مسکراہٹ کے ساتھ میری اس دعا کونظرانداز کردیا اور کہا،''اس قسم کی دعا مت مانگو۔'' ان کی بات نے مجھے پریشان کردیا لیکن جلد ہی میں یہ معاملہ بھول گیا۔وہ ایک مثالی جنرل ثابت ہوئے۔ انہوں نے جمہوریت کی حمایت کی اورفوجی بغاوت یا سیاست میں مداخلت کے کسی بھی نظریے کو شرف قبولیت نہیں بخشا تھا۔انہوں نے یہ واضح کردیا کہ ان کے نزدیک فوج ایک ایسا

دیانت دار اور ملک سے وفادار ادارہ ہے جس کے دل میں پاکستان کے بہترین مفادات موجود ہیں، نیز وہ سیاستدانوں کے ساتھ بے باک اور دوٹوک انداز میں بات کرتے تھے جس کے باعث انہوں نے بہت سے افراد کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ 8 جنوری کو جاگنگ کرتے ہوئے انہیں دل کا دورہ پڑا اور وہ فوت ہو گئے۔ ہم میں سے کئی لوگ اس عجیب وغریب صورتِ حال سے بہت پریشان ہوئے کیوں کہ وہ جسمانی طور پر نہایت ہی تندرست اور چاق وچوبند تھے اور انہیں کوئی مہلک بیماری بھی نہ تھی۔ ہر طرف یہ شبہ کیا جا رہا تھا کہ انہیں زہر دیا گیا تھا اور ابھی تک ان کی موت کا راز افشا نہیں ہو سکا۔ جب ان کے بال فرانزک معائنے کے لیے بھجوائے گئے تو ان میں انتہائی مہلک زہر پایا گیا۔ وہ مجھے، اپنے خاندان اور پاکستان کو بہت جلد چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ ہم سب کے لیے بہت بڑا نقصان تھا۔

ایک اور نفیس اور اچھے فوجی جرنیل عبدالوحید کاکڑ، جنرل آصف نواز کے جانشین مقرر ہوئے۔ اس وقت اسلام آباد کی فضا میں سازشی نظریات کی بو رچی بسی تھی۔ اپریل 1993ء میں صدر غلام اسحٰق خان نے نواز شریف کو معزول کر دیا جس کے باعث آئینی بحران پیدا ہو گیا۔ اس موقع پر جنرل کاکڑ نے مداخلت کی اور پس منظر میں رہتے ہوئے ایک نہایت ہی دانشمندانہ مشورہ دیا۔ انہوں نے غلام اسحٰق خان اور نواز شریف دونوں کو استعفیٰ دینے پر رضامند کر لیا۔ اس کا حل صرف نئے انتخابات ہی تھے۔ اکتوبر 1993ء میں ووٹ ڈالے گئے اور نہایت ہی کانٹے دار مقابلہ ہوا۔ پی پی پی نے 207 میں سے 89 اور مسلم لیگ نے 73 نشستیں جیتیں حالانکہ نواز شریف کو پاپولر ووٹوں کے لحاظ سے برتری حاصل تھی۔ سیاسی جوڑ توڑ کے ذریعے بینظیر ایک سیاسی اتحاد بنانے میں کامیاب ہو گئیں اور وہ دوسری مرتبہ وزیراعظم بن گئیں۔ ہمیں توقع تھی کہ بینظیر نے اپنی پہلی مدت اقتدار کی غلطیوں سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہوگا اور وہ اب ایک بالغ نظر سیاستدان بن گئی ہوں گی۔ یقینی طور پر بینظیر نے اپنی دوسری مدت اقتدار کے ابتدائی مہینوں میں محتاط رویہ اختیار کیا اور فوج کے بارے میں اپنے بیانات میں بھی محتاط رویہ اپنائے رکھا۔ چوں کہ غلام اسحٰق خان صدارت سے مستعفی ہو چکے تھے اس لیے بینظیر نے پی پی پی کے غیر متنازع اور پڑھے لکھے بلوچ رہنما فاروق لغاری کا بطور صدر انتخاب

کیا۔انہوں نے معاشی پیداواراورترقی کے علاوہ روزگار کے مواقع کی تخلیق کے لیے بجا طور پر انتہائی کوشش کی اورنواز شریف کی معاشی اصلاحات اورنجکاری کے پروگرام کو برقرار رکھنے کا وعدہ کیا۔تاہم عملی طور پراس نے اس جذبے کے ساتھ کام شروع نہیں کیا جس کی بجا طور پر ضرورت تھی۔پی پی پی کی بائیں بازو کی بنیاداورنجی کاروبار سے متعلق اس کے قدیم شبہات کو دورکرنا بہت ہی مشکل تھا۔جب پاکستان ریلوے اور پاکستان سٹیل مل کو نجی ملکیت میں دینے کا معاملہ درپیش ہوتو وہ پیچھے ہٹ گئیں۔معاشی حالت دگرگوں ہونے لگی اورسرمایہ کاروں کا اعتماد منتشر ہوگیا۔اس کے علاوہ اندرونی سلامتی اورتحفظ کے مسائل بڑھتے جارہے تھے اوربینظیر کراچی کے علاوہ لاہور میں تشدد کی روک تھام کرنے میں ناکام رہیں۔کراچی میں ایک مسئلہ زرداری بھی تھا جوخود کو سندھ کا بے تاج بادشاہ سمجھتا تھا۔ایک فرانسیسی کمپنی سے آبدوزوں کی خرید میں رشوت کی وصولی سمیت بدعنوانی کے بڑے بڑے معاملات منکشف ہوئے تو زرداری کو بین الاقوامی طور پر ''مسٹرٹین پرسنٹ'' کا خطاب دے دیا گیا۔آبدوز سکینڈل کے باعث بعدازاں اس کی گرفتاری عمل میں آئی اوراس پرمقدمہ بھی چلا۔ہر وقت تمام حلقوں کوخوش رکھنے کی کوشش میں بینظیر نے خود کوافغانستان کی سیاست میں ملوث کرلیا اورطالبان عسکریت پسندوں کومسلح کرنا شروع کردیا۔اس کا خیال تھا کہ اس طرح پاکستان کی پوزیشن بہتر ہوگی۔یہ اب تاریخ ہی اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ کیا اس کا یہ فیصلہ درست تھا یا پھر بہتر یہی تھا کہ افغانستان کے مختلف سیاسی دھڑوں سے دور رہتے ہوئے انہیں اپنے متعلق خود فیصلہ کرنے کا موقع دیا جاتا؟ 1990ء کی دہائی کا وسط پاکستان کے لیے انتہائی خوفناک اور دہشت ناک ثابت ہوا جس نے بینظیر کی شہرت کو انتہائی داغدار کردیا۔وہ اپنے بھائی مرتضیٰ بھٹو کے خلاف خاندان میں لڑائیاں بھی لڑرہی تھی جوخود کو بھٹو خاندان کی سیاسی وراثت کا حقدار سمجھتا تھا۔مرتضیٰ ایک آتشیں مزاج شخص تھا اورزرداری کے مانند اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر بندوقوں کا بے دریغ استعمال اسے ناپسند نہیں تھا۔یہ دونوں اشخاص اس وقت دشمن کی حیثیت سے سامنے آئے، جب 20 ستمبر 1996ء کوکراچی میں پولیس نے مرتضیٰ کوگولی مارکر ہلاک کردیا تو شبہ ظاہر کیا گیا کہ اس واقعہ میں ان کے بہنوئی کا بالواسطہ کردار ہوسکتا

ہے۔ مرتضیٰ بھٹو کا قتل بینظیر کے اقتدار کے تابوت میں آخری کیل تھا۔ بینظیر حکومت کے خلاف بدعنوانی کے الزامات، معاشی انحطاط اور عمومی نفرت عروج پر تھی۔ دو ماہ کے اندر ہی فاروق لغاری جسے بینظیر نے خود ملک کا صدر منتخب کیا تھا اس نے آٹھویں ترمیم کا استعمال کر کے بینظیر حکومت کو برطرف کر دیا۔ بینظیر، فاروق لغاری کی ''بے وفائی'' پر سکتے میں رہ گئیں لیکن اکثر غیر جانبدار مبصرین خوش ہوئے۔ اس کی حکومت انتہائی مایوس کن ثابت ہوئی اور اس نے ایک دفعہ پھر زرداری کو کھل کھیلنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

میں بینظیر کو اس افسوسناک ناکامی سے تین برس پہلے بخوبی جان چکا تھا۔ عمومی زندگی میں اسے قابل احترام اور شائستہ مزاج خاتون سمجھا جاتا۔ ایک موقع پر انہوں نے مجھے سینیٹر کے عہدے کی پیش کش کی اور بطور معاشی مشیر اپنی حکومت کا حصہ بننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے اس کے جواب میں ان سے کہا، ''میں اس کی پیشکش سے متاثر ہوا ہوں۔'' لیکن مجھے انکار ہی کرنا پڑا۔ میرا اپنا کاروبار تھا جس کی میں دیکھ بھال کرتا تھا اور سیاست سے مجھے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے علاوہ میں ایک نئے شعبے، گیس اور تیل میں قدم رکھنے کے ذریعے ایک نیا کاروبار شروع کر رہا تھا اور اس میں ہی میرا وقت صرف ہو رہا تھا۔ میں بینظیر سے کبھی بھی اپنے لیے کسی بھی قسم کی معاونت اور مدد کا طلب گار نہیں ہوا اور قطع نظر اس سے کہ اقتدار کس کے پاس ہے، میں نے انہیں پاکستان کے لیے اپنی محبت اور جنون کا یقین دلایا تھا۔ مگر زرداری مجھے اپنے راستے کا کانٹا ہی سمجھتا رہا۔ میں نے پی پی پی حکومت سے 250 میگا واٹ کا پاور پلانٹ تعمیر کرنے کی درخواست کی لیکن حکومت نے منظوری دینے سے انکار کر دیا۔ حکومت نے کراچی میں سمندر کے ساتھ ایک نیا پانچ ستارہ ہوٹل تعمیر کرنے کے لیے پیشکشیں طلب کیں۔ میں نے اپنی طرف سے ایک مضبوط و معقول بولی دی۔ چند دنوں بعد مجھے زرداری کی طرف سے فون موصول ہوا۔ وہ ہوٹل کا یہ منصوبہ اپنے دوست ''طفیل ٹونی شیخ''، کو دینا چاہتا تھا جو کہ کراچی کا ایک بزنس مین تھا۔ میں اس کا پیغام سمجھ گیا اور اپنی پیشکش واپس لے لی۔ اس کے علاوہ میں کر ہی کیا سکتا تھا؟ زرداری بھی یہیں ہے، طفیل شیخ بھی اور وہ قطعہ زمین بھی ابھی تک یہیں ہے۔ آج تک وہ ہوٹل تعمیر نہیں ہو سکا۔ بلاشبہ میں کسی بھی

صورت بینظیر کے پاس شکایت کے لیے نہیں جا سکتا تھا۔ انہیں لازماً علم ہونا چاہیے تھا کہ ان کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے لیکن یا تو وہ اپنے خاوند کو روکنا نہیں چاہتی تھیں یا اسے روکنے کے قابل نہیں تھیں۔ میرے نزدیک وہ واضح طور پر ایک کم ظرف شخص تھا۔ ایک مرتبہ زرداری سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب بینظیر کئی ممالک کے دورے کے بعد واپس لوٹی تھیں اور وہ وزیراعظم کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ جب اس کی ملاقات بہت سے سربراہان مملکت سے ہوئی تو اس نے کیا محسوس کیا؟ اسے کس نے متاثر کیا اور کیوں؟ زرداری کے جواب نے مجھے ششدر کر دیا: ''وہ تمام احمق اور اوسط درجہ سے بھی نیچے ہیں، جنہیں زمینی حقائق کا علم ہی نہیں۔'' میں حیران رہ گیا کہ وہ اس قدر نامعقول انسان تھا۔

جب نومبر 1996ء میں بطور وزیراعظم بینظیر کو برخاست کر دیا گیا اور صدر لغاری نے ایک سینئر اور سادہ مزاج سیاستدان ملک معراج خالد کو نگران وزیراعظم مقرر کیا تو یہ ایک ایسا دور تھا جب پاکستان میں ہر طرف افراتفری اور انتشار کا عالم برپا تھا۔ معیشت، داخلی امن وامان، خارجہ تعلقات سب کچھ تباہی کے دہانے پر تھا۔ بینظیر کے خلاف عوامی غیظ وغضب انتہائی شدید تھا۔ عوام انتہائی بے کسی اور بے بسی کے عالم میں تھے۔ فروری 1997ء میں انتخابات ہوئے اور نتائج سب کے سامنے تھے۔ پی ایم ایل (این) نے 207 میں سے بھاری اکثریت کے ساتھ 137 نشستیں جیت لیں۔ پی پی پی کو محض 18 نشستیں حاصل ہوئیں۔ عوام نے بینظیر کو سبق سکھا دیا تھا، اور شاید اس سے کہیں زیادہ یہ زرداری کے لیے سبق تھا۔ چوں کہ زرداری پر بدعنوانی اور غلط کاریوں کے الزامات عائد کیے جا رہے تھے اور اس کے خلاف قانونی مقدمات تیار کیے جا رہے تھے، بینظیر اپنے بچوں کے ساتھ 1998ء میں پاکستان سے چلی گئیں اور دبئی قیام پذیر ہو گئیں۔ بینظیر ایک دہائی تک وطن واپس نہ لوٹیں اور جب وہ اکتوبر 2007ء میں واپس آئیں، انہیں نہایت ہی افسوسناک انداز میں قتل کر دیا گیا۔

☆☆

جہاں تک نواز شریف کی دوسری مدت اقتدار کا تعلق ہے، میرے لیے اس کا آغاز کچھ اچھا نہ تھا۔ کچھ لوگوں نے ان کے کان بھرے اور انہیں قائل کر دیا کہ میں نے پی پی پی

سے مراعات حاصل کیں جو حقائق کے بالکل برعکس تھا۔ میں اس وقت ہوسٹن میں تھا جب میرے دفتر کی طرف سے مجھے بتایا گیا کہ میرا نام ایک دفعہ پھر ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ میں فوری طور پر واپس اسلام آباد آ گیا اور اس طرح میں پاکستان کی تاریخ کا وہ پہلا شخص بن گیا جو بیرون ملک سے اس کے باوجود واپس آ گیا کہ اس کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل کیا گیا تھا۔ میں 14 مارچ کو وطن پہنچا اور اگلی شام میں نے نکولس پلاٹ (Nicholas Platt) کو رات کے کھانے پر مدعو کیا جس نے 1990ء کی دہائی کے اوائل میں پاکستان میں امریکی سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دی تھیں اور وہ اس وقت ایشیا سوسائٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے پاکستان کے دورے پر تھا۔ وہ ایک پرانا دوست تھا اور میری خواہش اس کے ساتھ اس شام کو ہلکی پھلکی گفتگو کرنے کی تھی۔ نکولس پلاٹ کے ذہن میں کہیں زیادہ سنجیدہ سوالات موجود تھے۔ اس نے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی پوچھا، ''نواز شریف تمہارے خلاف کیوں ہے؟ میرا گمان تھا کہ تم دونوں کے تعلقات بہت اچھے ہوں گے۔'' میں نے اپنے کندھے اچکائے اور یہ سن کر میں قدرے حیران رہ گیا۔ پلاٹ نے کہا، ''میں کل صبح مری میں نواز شریف کے ساتھ ناشتا کر رہا ہوں، کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری طرف سے بات کروں؟'' میں نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ ''براہ کرم نہیں، ایسا مت کرنا، میرا اس کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں، مجھے یقین ہے کہ یہ کوئی معمولی سی غلط فہمی ہے جو از خود دور ہو جائے گی۔'' لیکن کوئی نہ کوئی معاملہ ایسا تھا جو واقعی غلط نوعیت کا حامل تھا۔ بیوروکریسی کے میرے کچھ دوستوں نے مجھے بتایا کہ نواز شریف کو یہ تاثر دیا گیا ہے کہ میں خود کو کسی سیاسی کردار کے لیے تیار کر رہا ہوں۔ مجھے انکم ٹیکس نوٹس موصول ہوا۔ پاکستان ایئر لائنز کے ساتھ دورانِ پرواز کھانا بہم پہنچانے کے لیے ہمارے ہوٹلوں کا معاہدہ یکدم ختم کر دیا گیا۔ ہمارے ہوٹلوں میں قیام پذیر فضائی عملے کو کہیں اور منتقل کر دیا گیا۔ میرے کاروباری حریف ایک دفعہ پھر فعال ہو چکے تھے۔ نواز شریف کے ذہن میں پائے جانے والے شکوک کی وضاحت کے لیے میں وزیر اعظم سے ملاقات کا خواہاں تھا لیکن مجھے ملاقات کا وقت نہیں دیا گیا۔ بدعنوانی کے خلاف کڑی نظر رکھنے کے لیے قائم کردہ ایک ادارے، نیشنل اکاؤنٹیبلٹی بیورو (احتساب

بیورو) کے سربراہ کے طور پر سیف الرحمٰن کا تقرر کیا گیا اور اسے بینظیر/ زرداری دور کے متنازع معاہدات کے متعلق تحقیقات کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی، نیز اسے میرے کاروباری سودوں کے متعلق بھی تفتیش کرنے کے لیے کہا گیا۔ معائنہ کاروں اور تفتیش کاروں کی ایک ٹیم نے میرے دفاتر اور ہوٹلوں کے چکر لگانا شروع کر دیے اور بعض اوقات یہ ٹیم برسوں پرانے بلوں اور رسیدوں کی فوٹو کاپیاں طلب کرتی۔

میری پاکستان واپسی کے چند دنوں کے اندر ہی یہ سب شروع ہو گیا تھا۔ ایک صبح مجھے وزارت خارجہ کے ایڈیشنل سیکریٹری رفعت مہدی کا فون موصول ہوا۔ رفعت مہدی جنہوں نے بعد ازاں یورپی یونین کے لیے پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، وہ ایک اچھے انسان ہونے کے علاوہ ایک باوقار سفارتکار بھی تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اسلامی سربراہی کانفرنس 23 اور 24 مارچ کو اسلام آباد میں منعقد ہو رہی ہے اور اس ضمن میں بہت کم انتظامات کیے جا سکے ہیں۔ انہیں ہدایت دی گئی تھی کہ ''ہاشوانی کے ہوٹلوں سے رابطہ کیے بغیر انتظامات کیے جائیں کیوں کہ یہ ہوٹل زیر تفتیش ہیں۔'' اب بے چارے مہدی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انتظامات کیسے کیے جائیں۔ ایک ہفتے کے اندر تقریباً 1800 مہمان پاکستان آ رہے تھے لیکن ان کے لیے رہائش اور نقل و حرکت کے لیے ابھی تک کچھ انتظام نہ ہوا تھا۔ مہدی نے دوٹوک انداز میں نواز شریف کو بتا دیا کہ میریٹ ہوٹل اور ہاشوانی گروپ کی معاونت کے بغیر ان تمام مقاصد کا حصول ناممکن ہے۔ قدرے شش و پنج کے بعد نواز شریف رضامند ہو گیا۔ مجھے فون کرنے کے بعد چند گھنٹوں کے اندر ہی اس سہ پہر مہدی نے میریٹ میں مجھ سے ملاقات کی۔ وہ بجا طور پر فکر مند تھے۔ انہوں نے کہا، ''میری درخواست ہے اس کانفرنس کے کامیاب انعقاد کے لیے میری مدد کریں، اگر آپ کی مدد حاصل نہ ہوئی تو خدشہ ہے کہ کانفرنس کو کسی اور ملک منتقل نہ کر دیا جائے، اگر ایسا ہوا تو پاکستان بدنام ہو جائے گا۔'' میں نے کہا، ''اس صورت حال میں مدد نہ کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میرے تمام ہوٹل، اسلام آباد کا میریٹ، راولپنڈی کا پرل کانٹی نینٹل، بھوربن کا پرل کانٹی نینٹل تمام تمہارے حوالے ہیں، یہ سب ملا کر 700 کمرے ہیں۔'' مہدی نے سر ہلایا لیکن اس کے

ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار نہ ہوئی۔ اس نے کہا، ''مجھے مزید کمروں کی ضرورت ہے، مجھے 1800 کمرے درکار ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ایم این اے ہوسٹل، جس کے 300 کمرے ہیں، پنجاب ہاؤس، سندھ ہاؤس، منسٹرز کالونی ہاؤس، کنونشن سینٹر، تمام اپنی تحویل میں لے لو، اور رہائش وخوراک کے علاوہ نقل وحرکت کے تمام انتظامات کرو۔'' ایم این اے ہوسٹل اور کنونشن سینٹر حال ہی میں تعمیر کیے گئے تھے اور وہ بالکل نئے تھے لیکن پانی اور بجلی کی سہولیات، پانی رسنے کے مسائل کے متعلق کسی کو بھی کچھ نہیں علم تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ کھڑے کر لیے۔ میں نے کہا، ''رفعت! میرے پاس الٰہ دین کا چراغ نہیں، اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم انتظامات کیسے کرتے ہو!'' رفعت نے طنزیہ انداز میں کہا، ''کیا تم چاہتے ہو کہ پاکستان کا تاثر سلامت رہے یا تباہ ہو جائے، کوئی اور طریقہ اس وقت دستیاب نہیں۔'' میں نے کہا، ''تم نے میرے سر پر بہت بڑا بوجھ لاد دیا ہے لیکن پاکستان میری سب سے پہلی ترجیح ہے جیسے بھی ہو، ہم انتظام کر لیں گے۔'' یہ ایک بہت بڑا کام تھا۔ دو ہی دنوں کے اندر ہم نے کراچی اور پشاور جیسے دیگر شہروں سے اپنے ہوٹلوں کے 400 افراد کو اسلام آباد منتقل کر دیا۔ ہوٹلوں کے کمروں اور دیگر سرکاری عمارتوں کی اچھی طرح صفائی ستھرائی کی گئی، خوراک کا انتظام کیا گیا، خواب گاہوں کو پانچ ستارہ ہوٹلوں کے معیار کے مطابق جدید بنایا گیا، صوفوں، کرسیوں، بستر کی چادروں اور کمروں کی عمومی اندرونی آرائش وسجاوٹ میں بھی انتہائی توجہ کے ساتھ جدت پیدا کی گئی۔ اس دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہر پہلو کے لحاظ سے یہ کانفرنس نہایت ہی کامیاب رہی، لیکن مجھے دعوت نامے کا بھی مستحق نہ سمجھا گیا۔

کانفرنس کے بعد بھی مجھے مسلسل ہراساں کیا جاتا رہا۔ بائیس فون جو میرے نام تھے، ان کی نگرانی کی جا رہی تھی اور میرے بینک کھاتے بند کر دیے گئے تھے۔ بتایا گیا کہ مجھے کیپیٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے چیئرمین شفیع سیوانی کے ساتھ ملی بھگت کے ذریعے چند قطعات زمین کے نیلام میں مبینہ بدعنوانی کے الزام میں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ یہ انتہائی احمقانہ بات تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں زمین کی نیلامی میں کبھی حصہ نہیں لیا تھا۔ ہفتہ کے دن میری چھوٹی بیٹی سارہ نے مجھے دفتر فون کیا کہ سیاہ رنگ کی بہت سی کاریں ہمارے گھر کے اردگرد

منڈلا رہی ہیں۔ اگلے سوموار کو جنرل جہانگیر کرامت نے جو 1996ء میں فوج کے سربراہ اور میرے قابل اعتماد دوست بھی تھے انہوں نے مجھے راولپنڈی کے آرمی ہاؤس میں بلایا۔ جنرل جہانگیر کرامت نے مجھ سے کہا، ''صدرو! کچھ لوگ تمہیں گرفتار کرنا چاہتے ہیں، اگر تم چاہو تو میں وزیراعظم سے بات کروں؟'' میں نے ان کا شکریہ ادا کیا لیکن ان کے مشورے کو قبول نہیں کیا۔ میں نے کہا، ''میرے ہاتھ صاف ہیں اور یہ معاملہ جلد یا بدیر ختم ہو جائے گا۔'' جنرل کرامت نے کہا، ''بہت خوب تمہاری مرضی لیکن اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت محسوس ہو تو مجھے فون کر سکتے ہو۔'' پانچ دن بعد مجھے بتایا گیا کہ سیوائی کے خلاف فوجداری مقدمات قائم کر دیے گئے ہیں اور میرا نام شریک ملزم کے طور پر شامل کیا گیا ہے اور اسی شام مجھے بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔ میں گھر گیا، کچھ کپڑے اور ضروری ادویات باندھیں اور سورج غروب ہونے سے قبل ہی اسلام آباد سے رخصت ہو گیا۔ پولیس مجھے غروب آفتاب کے بعد گرفتار کرنا چاہتی تھی تاکہ مجھے عدالت میں پیش نہ کیا جا سکے۔ میں رات بھر گاڑی چلانے کے بعد پنجاب کی حدود سے نکل گیا۔ ایک ماہ کے لیے میں چارسدہ اور قبائلی علاقوں میں بھی رہا۔ ہر چار یا پانچ دن بعد میں جائے قیام تبدیل کر لیتا۔ یہ میرے لیے جسمانی اور ذہنی اذیت کے مترادف تھا۔ میرے بیٹے حکومت کو جُل دینے کے لیے مجھ سے سیٹلائٹ فون کے ذریعے رابطہ کرتے۔ یہ بہت ہی وحشت ناک دن اور راتیں تھیں۔ میں ایک نامانوس اندھیرے اور خاموش کمرے میں خود سے سوال کرتا کہ کیا پاکستان اس قابل ہے کہ یہاں رہا جائے یا پھر پاکستان کو چھوڑ کر کسی اور جگہ آباد ہو جاؤں۔ کوئی بھی مجھے پاکستان چھوڑنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے خود کو بتایا اور یقین دلایا، ''میں نے لڑنا سیکھا ہے بھاگنا نہیں!''

بالآخر، میری قبل از گرفتاری ضمانت ہو گئی اور اب میں 40 دن کی مفرور زندگی گزارنے کے بعد منظر عام پر آ سکتا تھا۔ مجھے ضمانت کی توثیق کے لیے لاہور ہائی کورٹ میں طلبی کا پروانہ ملا۔ میں نے اسلام آباد سے لاہور صبح ساڑھے آٹھ بجے قدم رکھا اور اس وقت میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ایئرپورٹ کی انتظار گاہ انٹیلی جینس اور پولیس کے افسروں سے بھری پڑی ہے۔ پرل کانٹی نینٹل ہوٹل تک وہ میرے پیچھے پیچھے آئے اور میرے کمرے کے

باہر پولیس کا ایک سپاہی تعینات کر دیا گیا۔ اگلے دن صبح جب میں آٹھ بجے عدالت جانے کے لیے روانہ ہوا تو انٹیلی جینس اور پولیس کی کاروں کا ایک جلوس میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ہائی کورٹ کی عمارت میں بھی اسی قسم کا ہجوم تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ جج پر میری ضمانت کی عدم توثیق کے لیے دباؤ ہے۔ میرا وکیل اکرم شیخ مایوس تھا۔ اس نے مجھے بتایا، ''باشوانی، میرا نہیں خیال کہ آج کے روز میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔ وہ تمہاری ضمانت کی توثیق نہیں کرے گا اور تمہیں عدالت سے گرفتار کر لیا جائے گا۔'' ضمانت کی توثیق ایک معمولی معاملہ تھا لیکن ایڈووکیٹ جنرل پاکستان اس وقت بذاتِ خود استغاثہ کی معاونت کے لیے عدالت میں موجود تھا اور پیش ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اکرم شیخ نے دلائل دینا شروع کیے تو میں اس دوران کچھ تازہ ہوا لینے اور سکون کے ایک لمحے سے مستفید ہونے کے لیے باہر چلا گیا۔ میں نے اپنی نگاہیں اوپر اُٹھائیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مدد اور رحم کے لیے درخواست کی۔ چند منٹ بعد مجھے طلب کر لیا گیا۔ ایڈووکیٹ جنرل یکدم عدالت کے کمرے سے باہر چلا گیا اور اس کے علاوہ ضمانت کی منسوخی پر زور دینے کے لیے استغاثہ کا کوئی اور نمائندہ موجود نہ تھا، لہٰذا میری ضمانت کی توثیق ہوگئی، یہ ایک معجزہ تھا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں، اب کایا پلٹ چکی تھی۔ میرے خلاف مقدمات ایک ایک کر کے تحلیل ہونے لگے۔ چند ہی ماہ میں مجھے تمام الزامات سے بری قرار دے دیا گیا، یوں میری بے گناہی روزِ روشن کے مانند واضح ہو چکی تھی۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا، وہ کیا تھا۔ البتہ ایک سوال میرے ذہن میں کھٹکتا ہے۔ ضیاالحق کی وفات کے بعد جمہوری اور سیاسی حکمرانی کی ایک دہائی گزر چکی تھی اور یہ دہائی کیوں اس قدر مایوس کن ثابت ہوئی؟ کیا وجہ تھی کہ سیاسی حکمران اس صحیح پالیسی کو اختیار کرنے میں اس قدر تاخیر کیوں کرتے تھے جو واضح طور پر درست اور صحیح تھی؟ کیا وجہ تھی کہ سیاسی حکمران ان عوام کے مفادات کے لیے کام کرنے میں پس و پیش کرتے تھے جنہوں نے انہیں منتخب کیا تھا؟ 1998ء کے برس میں داخل ہوتے وقت یہ معاملات مسلسل میرے ذہن میں کھٹکتے رہتے۔ اسی برس کے موسم گرما میں ہمارے ملک کو قطعی مختلف

معنوں میں ایک پُرعزم اور مستحکم قیادت درکار تھی ۔ کیوں کہ ملکی سلامتی کو خطرہ درپیش تھا۔

اس سے بھی بڑھ کر پاکستان کو جوہری تجربوں کی طرف پیش قدمی کے حوالے سے جو میرا کردار تھا، اس کا ذکر آئندہ ابواب میں آئے گا۔

اس بات کا اگرچہ اس باب اور ان واقعات سے تعلق نہیں، لیکن یہ اسی دور سے ہم وقت ہے اس لیے یہاں برسبیل تذکرہ بتاتا چلوں کہ میں نے چار مرتبہ عمرہ کی سعادت حاصل کی اور متعدد بار اولیاءکرام کے مزارات پر حاضری دی۔ انشاءاللہ حج کا بھی مصمم ارادہ ہے۔ عمرہ کی سعادت کے دوران میری فیملی ممبر کی حیثیت رکھنے والے اسلم صدیقی اور ہمایوں محبوب بھی ہمراہ تھے۔ ہمایوں محبوب سے میری ملاقات 1995ء میں ہوئی۔ مجھے Astrology سے دلچسپی تھی اور اچھے Astrologist سے ملنا پسند کرتا تھا۔ اسلم صدیقی دسمبر 1995ء میں ایک نوجوان لڑکے ہمایوں محبوب کو میرے پاس لے کر آیا۔ یہ نوجوان حبیب بینک میں ملازم تھا اور Astrology پر دسترس حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسی وقت پرل کانٹی نینٹل کراچی میں اسے آفس کی جگہ مہیا کی جہاں سے ہمایوں محبوب نے اپنے پروفیشنل سفر کا آغاز کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمایوں سے میرا تعلق مضبوط ہوتا گیا اور وہ میری فیملی ممبر کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ہمایوں محبوب اب ایک معروف Astrologist ہے۔

باب 10

جنگی جنون

مئی 1998ء میں بھارت نے پانچ تجرباتی جوہری دھماکے کیے اور یوں اپنے تئیں ایک جوہری طاقت ہونے کا اعلان کر دیا۔ یہ پاکستان کے لیے سچائی کا ایک روشن لمحہ تھا۔ تمام محب وطن پاکستانیوں کا روز روشن کے مانند واضح مؤقف تھا کہ ہمارے ملک کو بھی اسی طرح جوہری دھماکے کر دینے چاہئیں۔ حکومت کی جانب سے تاخیر پر عوامی نمائندوں نے اسمبلی کے اندر بحث کا مطالبہ کر دیا۔ اخبارات کے رائے عامہ کے جائزے منعقد ہو رہے تھے۔ اقتصادی ماہرین اور حتیٰ کہ میرے کچھ کاروباری ساتھیوں نے مغربی پابندیوں اور معیشت کو پہنچنے والے متوقع قلیل المدتی نقصان کے علاوہ انفرادی کاروبار کی تباہی اور خاص طور پر جن کا انحصار بین الاقوامی خریداروں یا گاہکوں پر تھا ان سے متعلق مجھے خبردار کیا۔ اس امر سے اختلاف کیے بغیر کہ جوہری تجرباتی دھماکوں کے کچھ نہ کچھ اثرات اور نتائج برآمد ہوں گے، میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں گم صم رہ گیا۔ میں خود کو عقاب یا جنگ پسند نہیں سمجھتا اور میں نہایت ہی سنجیدگی سے یہ بھی امید کرتا ہوں کہ میں وہ دن دیکھوں گا جب کسی ملک کے پاس جوہری ہتھیار نہیں ہوں گے، عالمی طور پر دنیا اسلحہ سے خالی ہو جائے گی۔ اس وقت انتہائی واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ بھارت جس نے پاکستان کو سنگین سٹریٹجک خطرے سے دوچار کر دیا تھا اور جس کے ساتھ ہم تین جنگیں لڑ چکے تھے، جوہری ہتھیاروں کے ذریعے ہم پر انتہائی بھرپور انداز میں برتری حاصل کر چکا تھا۔ سادہ اور صاف سی بات تھی کہ اس برتری کو

ختم ہونا چاہیے کیوں کہ یہ فیصلہ ہم پر تھوپ دیا گیا تھا۔قومی سلامتی کی بقا اور عوامی بے چینی دور کرنے کی خاطر جوہری دھماکے ضروری تھے۔اس کے علاوہ کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔

بہت سے سیاستدان تذبذب کا شکار تھے اور ان کا اعتماد و یقین متزلزل ہو رہا تھا۔ امریکہ سے ملاقاتیوں کا ایک سیلاب امڈ پڑا تھا۔ واشنگٹن ڈی سی سے وہ لوگ پاکستان پہنچے تھے جن کا پاکستان میں اثر و رسوخ موجود تھا۔انہوں نے پاکستان کو جوہری دھماکے نہ کرنے کے عوض امداد کے وعدوں کے حسین خواب دکھائے۔اس صورت حال پر میں بہت پریشان تھا۔ایک دن شام کو اپنے دوستوں کے ساتھ گفتگو کے دوران میں نے حکومت پر کسی فوری فیصلے تک نہ پہنچنے کے ضمن میں تنقید کی۔ میں نے ان سے استفسار کیا، ''کیا ہم جوہری دھماکے نہیں کریں گے اور صرف چند ملین ڈالر کی امداد کے عوض اپنی قومی سلامتی رہن رکھ دیں گے؟'' حالانکہ یہ رقم غریبوں تک کبھی نہیں پہنچتی۔سیاست دان اور بیوروکریٹ یہ رقم ہڑپ کر جاتے ہیں۔بدقسمتی سے سرکردہ کاروباریوں نے اس معاملے کے حوالے سے شترمرغ کی مانند آنکھیں بند کر لینے کا رویہ اختیار کیا اور کوئی بھی مضبوط موقف اختیار کرنے سے انکار کر دیا۔اس دوران بھارت میں خوشیوں کے شادیانے بج رہے تھے اور ان پر جنگی جنون سوار تھا۔۱۸ مئی کو بھارتی وزیر داخلہ ایل۔کے۔ایڈوانی نے مقبوضہ کشمیر کا دورہ کیا اور پاکستان کے خلاف دھمکی آمیز تقاریر کیں۔اس کے ہونٹوں پر مکروہ ہنسی تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ بھارت نے پاکستان کی جارحانہ سرگرمیوں سے نمٹنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور وہ ہماری طاقت سے خوفزدہ نہیں ہوگا۔اس نے اپنے موقف کے حق میں دلیل دیتے ہوئے کہا کہ جوہری ہتھیاروں سے مسلح ریاست بن جانے کے فیصلہ کن قدم کے باعث پاک بھارت تعلقات خاص طور پر کشمیر کے ایک پائیدار حل کی تلاش کے حوالے سے ایک نئی سطح پر آ گئے ہیں۔اس نے پاکستان کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ اسے خطے میں جغرافیائی سٹریٹجک صورت حال میں تبدیلی کو قبول کر لینا چاہیے اور مزید کہا کہ ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ کوئی اور راستہ پاکستان کے لیے بے سود اور مہنگا ہوگا۔اس وقت بھارت اور بھارت سے باہر مقیم بھارتیوں کی طرف سے اس قسم کے سخت اور جوش بھرے بیانات کا ایک سیلاب امڈ رہا تھا۔مجھے اندازہ

تھا کہ یہ صورت حال پاکستان میں عام شہریوں کے علاوہ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں پر کس طرح اثر انداز ہو رہی ہو گی۔ میں نے فوج میں اپنے دوستوں سے بھی بات کی۔ جو کچھ انہوں نے کہا، اس کے باعث میں مزید متفکر ہو گیا۔ فوج کا مورال گر رہا تھا۔ اگر پاکستان جوہری دھماکے نہ کرتا عام فوجی جنہوں نے پاکستان کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی محسوس کرتے کہ انہیں نیچا دکھا دیا گیا ہے اور بھارت کو پاکستان پر برتری حاصل ہو گئی ہے۔

اس مرحلے پر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اپنے طور پر کچھ کرنا چاہیے۔ آخر کار میں نے میڈیا سے خطاب کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ پاکستان کو ایٹمی دھماکے کرنے چاہئیں، چاہے اس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ درست ہے کہ اس کے باعث مستقبل قریب میں ملک بلکہ باشو گروپ کو نقصان پہنچ سکتا ہے لیکن وسیع منظر نامے اور موجودہ قومی مفادات کے مقابلے میں یہ سب کچھ غیر متعلق اور ثانوی ہے۔ میرے اس مطالبہ کو بڑے بڑے اخبارات نے شہ سرخیوں سے شائع کیا۔ کیوں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ دنیائے سیاست سے باہر کا ایک نہایت ہی بارسوخ اور اعلیٰ مرتبہ شخص 1998ء کے موسم گرما میں جوہری دھماکوں کی انتہائی شد و مد کے ساتھ حمایت کر رہا تھا۔ دو دن بعد جب ایک امریکی وفد اسلام آباد پہنچا اور میرے خیالات پر مشتمل اخباری تراشے انہیں پیش کیے گئے۔ انہیں بتایا گیا کہ جو کچھ میں نے کہا وہ پاکستان میں عوامی نمائندگی کے دباؤ کا عکاس تھا۔ امریکی ششدر رہ گئے۔ انہیں امید تھی کہ پاکستان کا ایک کاروباری شخص حکومت سے ایک محفوظ اور محتاط انداز کا مطالبہ کرے گا لیکن اس نے حکومت کو جوہری دھماکے کرنے پر اکسایا۔ امریکی سفارت خانے کے ایک اہلکار نے جو میرا شناسا تھا، میرے ساتھ رابطہ کیا اور حیرانی کا اظہار کیا۔ ''مسٹر ہاشوانی! ہم تو تمہیں اعتدال پسند سمجھتے تھے، تم حکومت سے جوہری دھماکے کرنے کے لیے کیوں اصرار کر رہے ہو؟'' میں نے جواب دیا، ''میرے دوست، مجھے جوہری ہتھیار پسند نہیں لیکن اگر ہمارے مفادات، سلامتی، تحفظ اور بقا کا تقاضا یہی ہے تو ہمیں یہ جوہری دھماکے ضرور کرنے چاہئیں۔ مجھے پاکستان پر فخر ہے، اگر پاکستان سلامت نہیں رہتا تو اس سے بڑا کوئی نقصان نہیں۔'' میں نے اسے واضح طور پر بتا دیا کہ میں بھارت کے ساتھ جنگ کی وکالت

نہیں کررہا...... قطعی نہیں ......لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنے ہمسائے خاص طور پر ایک جارح ہمسائے کو اپنے قریب تک نہ پھٹکنے دیا جائے۔ اگر بھارت کے مقابلے میں پاکستان کے پاس بھی جوہری ہتھیار ہوں تو طاقت کا توازن بحال ہو جائے گا اور اور ہم ممکنہ بھارتی مہم جوئی سے محفوظ ہو جائیں گے۔ وقت نے ثابت کیا کہ جوہری ہتھیاروں کے باعث طاقت کا توازن قائم ہو چکا ہے، جیسا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ دنیا کے دیگر حصوں، یورپ اور روس کے درمیان ''دہشت کا توازن'' قائم ہو چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہی سب کچھ پاکستان اور بھارت کے درمیان بھی ہوسکتا ہے۔ بلاشبہ ایسا ہی ہوا۔ مئی 1998ء کے آخری ہفتے میں پاکستان نے جوہری دھماکے کیے۔ اس کے بعد سے جنوبی ایشیا میں وسیع پیمانے پر جنگ کا خطرہ ٹل چکا ہے اور طرفین کو تباہی کے خطرے کا ادراک ہے۔

پاکستان کی طرف سے جوہری دھماکوں کے بعد عوام میں طمانیت اور بشاشت کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے پتہ تھا کہ امریکہ اور اس کے اتحادی معاشی پابندیاں عائد کردیں گے لیکن مجھے یہ بھی امید تھی کہ نواز شریف معاشی محاذ پر آگے بڑھنے اور ملک کی از سرنو تعمیر کے لیے قومی اتحاد کے جذبے سے کام لیں گے۔

بدقسمتی سے حکومت کا پہلا ہی ردعمل افراتفری اور پریشانی کا مظہر تھا۔ وزیر خزانہ سرتاج عزیز کے غلط مشورے پر حکومت نے تمام بینکوں میں پاکستانیوں کے ڈالر اکاؤنٹس منجمد کردیے اور زرمبادلہ کی بیرون ملک منتقلی پر پابندیاں عائد کردیں۔ جوہری دھماکوں سے کہیں زیادہ ان تدابیر کے باعث عوام پریشانی میں مبتلا ہوئے۔ ایک احساس تفاخر جو ہمارے جوہری سائنسدانوں نے ہمارے لیے حاصل کیا تھا اس کے بجائے عوام پر مایوسی کا عالم طاری ہوگیا۔ بہر حال اب ہم ایک جوہری طاقت تھے اور بھارت میں اٹھنے والی خطرناک آوازیں یک دم تھم گئیں۔ جب حالات معمول پر آگئے تو بہت سے لوگ میرے اس کردار کو سراہنے میرے پاس آئے جو میں نے پاکستان کی طرف سے کیے گئے جوہری دھماکوں سے پہلے میڈیا کے ذریعے ادا کیا تھا۔ سب لوگ یہی کہہ رہے تھے کہ میں نے اپنے کاروبار پر اپنے ملک کو ترجیح دی۔ آہستہ آہستہ نواز شریف نے کھلے عام میری تعریف شروع

کردی۔ اگرچہ نواز شریف کی حکومت کے خاتمے تک میرا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل رہا لیکن نواز شریف سے میرے ذاتی روابط بحال ہو چکے تھے۔

ایٹمی دھماکوں سے چند ہفتے بعد سیاسی اور فوجی قیادت کے درمیان اختلافات پیدا ہونے لگے۔ ایک دفعہ پھر یہ معاملہ محض غلط فہمی اور شک پر مبنی تھا جسے خاص طور پر سیاسی اسٹیبلشمنٹ میں موجود کاسہ لیسوں نے خوب ہوا دی تھی۔ جنرل جہانگیر کرامت، ایک اہل اور پیشہ ور فوجی تھا اور منتخب حکومت کی سرگرمیوں کو روکنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن اسے احساس تھا کہ ملک کے اندر ایک اہم ترین حساس ادارے کی حیثیت سے فوج کا پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ سے ہی ایک منفرد کردار رہا۔ انہوں نے وزیراعظم سے سٹریٹجک فیصلوں کے بارے میں فوج کے آئینی کردار کے حوالے سے بات کی اور سیاسی حکومت کی خودمختاری پر کوئی آنچ آنے دیے بغیر اپنی تجویز کو نہایت ہی منظم انداز میں پیش کیا۔ ان کی تجویز کی بنیاد جدید مسلم جمہوریہ ترکی کی مثال تھی۔ ترکی کا اندازِ حکمرانی کافی عرصہ سے پاکستان میں موضوع بحث ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنرل جہانگیر کرامت کی تجویز کا غلط مطلب لیا گیا۔ اکتوبر 1998ء میں نواز شریف نے اپنے مشیروں کے کہنے پر جنرل سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا۔ جنرل کرامت ایک باوقار شخص تھا اور اس نے کوئی گڑبڑ کیے بغیر اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیا۔ اگر اس کا کوئی پوشیدہ مقصد ہوتا تو وہ مزاحمت کرتا۔ اس کے بجائے اس نے اپنا عہدہ چھوڑنے اور علمی پیشہ ورانہ زندگی پر توجہ دینے کو ترجیح دی۔ برسوں بعد 2004ء میں اس نے سفیر بننے کی پیشکش قبول کر لی اور اپنی بہترین صلاحیت کے ذریعے یہ ذمہ داری نبھائی۔ جب میں ماضی کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی معزولی بطور وزیراعظم نواز شریف کی دوسری مدت اقتدار کا ایک فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ انہوں نے دو دیگر سینئر جرنیلوں پر ترجیح دیتے ہوئے جنرل پرویز مشرف کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کرنے کی غلطی کی۔ ٹھیک ایک برس بعد اکتوبر 1999ء میں نواز شریف اور مشرف کے درمیان اختلافات شدید ہو گئے۔ اس دفعہ فوج کا سربراہ باوقار انداز میں مستعفی نہیں ہوا اور ملک میں فوجی انقلاب برپا کر دیا یوں پاکستان میں ایک دہائی پر مشتمل جمہوریت دم توڑ گئی۔ ہم دوبارہ

ایک قسم کے مارشل لاء کے تحت آ گئے۔

سماجی لحاظ سے مشرف کے ساتھ میری ملاقات تھی لیکن میں اس سے اچھی طرح واقف نہ تھا۔ اس کی وجہ شہرت کینہ پرور شخص کی تھی، لیکن وہ واضح سوچ کا حامل بھی تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید وہ کوئی تعمیری قدم اٹھائے گا لیکن میری یہ امیدیں جلد ہی دم توڑ گئیں جب اس نے ایک اذیت پسند اور کج فہم جنرل امجد کو چیئرمین نیب مقرر کر دیا۔ جنرل امجد کا ایک ہدف اور شکار صدرالدین ہاشوانی تھا۔ دراصل وہ نواز شریف عہد کے میرے خلاف مقدموں اور تفتیش کی بنیاد پر مجھے مثال بنا دینا چاہتا تھا۔ یہ وہ مقدمے تھے جو پہلے ہی بے بنیاد ثابت ہو چکے تھے۔ مشرف انتظامیہ نے نیویارک میں ایک سراغرساں ایجنسی کی خدمات حاصل کی تھیں اور اسے بیرون ملک میرے کاروباری امور اور سرمایہ کاریوں کے متعلق تفتیش کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس ایجنسی نے فیس کی مد میں اچھی خاصی رقم اینٹھ لی۔ لیکن اسے میرے خلاف کچھ نہ ملا۔ جن افراد کے خلاف تحقیقات جاری ہوتیں انہیں اذیت دے کر جنرل امجد بہت خوش ہوتا۔ وہ اکثر اپنے ساتھیوں کے سامنے شیخی بگھارتا کہ وہ لکھ پتیوں کو فرش پر سُلا دیتا ہے۔ یہ کوئی ایماندارانہ تفتیش نہیں، بلکہ نظریاتی انتقام تھا۔ جب مجھے نیب نے طلب کیا تو جنرل امجد نے مجھے بھی بے توقیر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

جنرل امجد کے رویے سے مجھے کئی مرتبہ ضیا دور میں بریگیڈیئر تجمل حسین کی طرف سے کی گئی انکوائری کی یاد آتی۔ (باب ۷ میں اس کا ذکر موجود ہے)۔ بریگیڈیئر تجمل حسین اور امجد ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے معلوم ہوتے تھے۔ جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ میں امریکہ میں ایک ایسے کنسورشیم کا حصہ تھا جو ہوٹلوں اور دیگر جائیدادوں میں سرمایہ کاری کرتا تھا۔ جو بھی رقم میں کماتا میں باقاعدگی کے ساتھ پاکستان بھجوا دیتا۔ قواعد وضوابط کے مطابق اس میں سے کچھ رقم بیرون ملک میرے بچوں اور ان کی تعلیم کے لیے استعمال ہو جاتی۔ ایک دن مجھے نیب نے طلب کیا اور جنرل امجد نے تقریباً مجھے دق ہی کر دیا۔ بیسیوں لوگوں کے ایک ہجوم کے سامنے اس نے چلانا شروع کیا: ''تم ایک کاروباری کی حیثیت سے اس قدر ناکام ثابت ہوئے ہو۔'' اس نے بلند آواز اور درشتگی کے ساتھ بولتے ہوئے کہا،

''بیرون ملک تمہارے ساتھ کون شامل ہوتا؟ یہ کنسورشیم کیا ہے؟'' یہ سب کچھ نہایت ہی مضحکہ خیز تھا۔ میں ایک ایسا کاروباری تھا جس کی پہچان تمام دنیا میں تھی اور اس وقت پاکستان میں سب سے زیادہ ٹیکس ادا کرنے والا ایک فرد تھا۔ ایک پاگل جرنیل میری کاروباری ساکھ اور معاملہ فہمی وفراست کے متعلق فیصلہ صادر کر رہا تھا اور مجھے ناکام قرار دے رہا تھا۔ میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا، ''تمہیں میرے خلاف اپنی یہ غلیظ انگلی اٹھانے کی کس نے اجازت دی؟ میں ایک باوقار، کامیاب اور قابل احترام کاروباری ہوں۔'' جنرل امجد عادی نہیں تھا کہ یوں لوگ اس کے سامنے کھڑے ہو جائیں۔ اس نے بدمزاجی کے عالم میں کہا، ''میں تمہیں دیکھ لوں گا۔'' میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، میں نے جوابی وار کرتے ہوئے کہا، ''جو جی میں آئے کرو، جس قدر آنسو گیس میں نے اپنی جوانی میں لی ہے، تم نے اس قدر آکسیجن بھی نہیں لی ہوگی۔''

آنے والے دنوں میں جنرل امجد مجھے پھنسانے کی پوری کوشش کرتا رہا۔ وہ مجھے جلد سے جلد جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتا تھا۔ ستم ظریفی یہ بھی تھی کہ اس نے بطور چیئرمین نیب اپنے عہدے کا ناجائز استعمال شروع کر دیا تھا۔ بدعنوانی کو جڑ سے اکھاڑ دینے پر مقرر کردہ نگران، بذات خود بدعنوانی میں لت پت ہو رہا تھا۔ دلالوں کے ذریعے سودے طے ہوتے اور رشوت وصول کرنے کے بعد مقدمات ختم کر دیے جاتے۔ کچھ دلالوں نے میرے ساتھ بھی رابطہ کیا۔ انہوں نے میرے اور جنرل امجد کے درمیان معاملات ٹھیک کرانے کی پیش کش کی۔ میں نے انہیں دھتکار دیا۔ مجھے یاد ہے کہ جنرل امجد کے ایک ''دلال'' کو یہ کہتے سنا، ''آج یہ لوگ خود کو اللہ کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتے لیکن ایک دن انہیں زمین سے چھ فٹ نیچے دفن کر دیا جائے گا اور ان کی روحیں اللہ تعالیٰ کو جواب دیں گی۔'' بالآخر مجھے تمام الزامات سے بری کر دیا گیا اور میں جنرل امجد کے حملے سے بچ گیا۔ اس واقعہ نے مجھے سرکاری اداروں میں موجود لوگوں کی اہلیت وصلاحیت سے مایوس کر دیا۔ بہترین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ پاکستانی سیاست میں داخل نہیں ہوتے اور نہ ہی پارلیمانی عہدے قبول کرتے تھے۔ فوج میں جنرل امجد جیسے لوگ تین ستارہ جرنیل کے عہدے تک جا پہنچے

تھے۔ یہ کس طرح ممکن تھا؟ کیسے نااہل، غیر مستحق لوگ، ہمارے معاشرے میں کس طرح قدم جمالیتے ہیں؟ اسلام اپنے پیروکاروں کو نشے اور شراب نوشی کی عادت سے اجتناب برتنے کا حکم دیتا ہے۔ عام طور پر اسے الکوحل اور منشیات کے خلاف تنبیہ تصور کیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے ذریعے ہمیں یہ بھی سبق دیا جاتا ہے کہ ہم طاقت کے نشے میں گرفتار ہونے سے محتاط رہیں۔ عین یہی کچھ جنرل امجد اور اس کے بہت سے ساتھیوں کے ساتھ پیش آیا جو مشرف کے ماتحت کام کر رہے تھے۔ ایک شخص جسے کاروبار کی سرے سے سمجھ نہیں اور وہ خود سرتاپا بدعنوانی میں لت پت ہے، اسے کن بنیادوں پر پاکستان کی تجارت کی بنیادیں تباہ کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔

☆☆

اقتدار پر قبضہ کرنے کے تین برس بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مشرف کی زندگی بدل دی۔ اس واقعہ نے اسے بین الاقوامی سطح پر مشہور اور اہم شخصیت کے علاوہ مغرب کا مضبوط اور صف اول کا حلیف بنا دیا۔ اس واقعہ کے باعث مجموعی طور پر پاکستان مفلوج ہوگیا۔ میرا اشارہ بلاشبہ 11 ستمبر 2001 میں نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے ٹِون ٹاورز پر حملے کی طرف ہے۔ اس وقت پاکستان میں منگل کی شام کا وقت تھا اور میں میریٹ اسلام آباد کی کافی شاپ میں بیٹھا تھا۔ ایک صحافی نے مجھے فون کیا اور میرے سامنے واقعات کا ایک انتہائی تباہ کن پہلو پیش کیا اور کہا کہ میں ٹی وی دیکھوں۔ میں جی ایم کے کمرے میں چلا گیا اور سی این این لگایا۔ ہوائی جہاز کے ٹکرانے کے باعث ایک عمارت کو آگ لگی ہوئی تھی۔ پہلے تو میں نے یہ سمجھا کہ یہ ایک حادثہ ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک دوسرا طیارہ دوسرے ٹاور کی طرف آیا، 90 ڈگری کے زاویے سے مڑا اور سیدھا اس سے جاٹکرایا۔ یہ ہرگز کوئی حادثہ نہیں تھا۔ جس طریقے سے پائلٹ نے نہایت ہی تیزی سے اور اچانک جہاز کا رخ موڑا، اس نے مجھے اپنی جوانی کے ایام یاد دلا دیے جب مجھے سپورٹس کاریں مسحور کرتی تھیں۔ تیز رفتاری سے چلتی ہوئی سپورٹس کار سے اچانک موڑ مڑنے کے لیے انتہائی مہارت درکار ہے اور طیارے کے ذریعے اس عمل کی انجام دہی کہیں زیادہ مہارت کی متقاضی ہے۔ میں نے محسوس

کیا یہ ایک فوجی پائلٹ تھا۔ جلد ہی ذرائع ابلاغ کے ذریعے یہ اطلاعات موصول ہوئیں کہ 9/11 کو طیاروں کو اڑانے والے پائلٹ نے فلائنگ سکولوں میں محض چند ہفتوں کے لیے تربیت حاصل کی تھی۔ میں یہ سن کر بہت حیران ہوا۔ کوئی بھی شخص محض چند ہفتے کی تربیت کے بعد اس قسم کا تیز رفتار اور اچانک موڑ نہیں مڑ سکتا۔ اس صورت حال نے میرے علاوہ دیگر بہت سے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ شاید ہم ابھی تک 9/11 کی سازش کے پیچھے موجود مکمل کہانی سے لاعلم ہیں۔

چند ہی ثانیوں میں ٹاورز پر حملہ ہو گیا اور یہ خبریں بھی ملیں کہ پینٹاگان کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ اس وقت تک جی ایم کا کمرا لوگوں سے بھر چکا تھا۔ میں اٹھا، اپنا سر ہلایا اور کمرے سے چلا گیا۔ یہ المیہ میری آنکھوں کے سامنے ہی رونما ہوا تھا۔ اس پیارے اور جیتے جاگتے شہر نیویارک میں ہزاروں زندگیاں ضائع ہو رہی تھیں جہاں میں نے اس قدر خوشگوار زندگی بسر کی تھی۔ یہ کوئی ایسا منظر نہیں تھا جسے آسانی سے دیکھا جا سکے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی پریشانی تھی کہ اس میں پاکستان کو ملوث کیا جائے گا۔ فوری طور پر اسلام پسند گروہوں پر شک کیا جائے گا اور پھر فلسطین یا کشمیر میں نوجوان مسلمانوں پر ظلم ڈھانے کے لیے بطور جواز پیش کیا جائے گا۔ ایک دفعہ پھر عین اسی طرح امریکی جنگی مشینری متحرک ہو گئی جس طرح اس نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر 1945ء میں بمباری کی تھی، اور جب امریکی مشینری نے 1980ء کی دہائی میں افغانستان میں جنگ کے لیے پاکستان کو اپنا اڈہ بنا لیا تھا۔ میں نے مرنے والوں کی روحوں اور امن کے لیے دعا کی۔ لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ اب اس دنیا میں امن وسکون کے دن گنے جا چکے ہیں۔ میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس وقت میں بہت پریشان ہوا جب چند ہی گھنٹوں کے اندر مشرف نے جارج بش کے اس احمقانہ مطالبے کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے کہ ''تم ہمارے ساتھ ہو یا ہمارے مخالف ہو۔'' اس کے ساتھ ہی مشرف نے امریکہ کی طرف سے افغانستان پر حملہ کرنے کے ضمن میں بطور سہولت کار، اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس سلسلے میں ملک کے اندر کسی بھی قسم کی مشاورت نہیں کی گئی اور نہ ہی مقامی رائے عامہ کو مدنظر رکھا گیا اور نہ ہی یہ حقیقت پیش نظر رکھی گئی کہ اس سے پاکستان پر کیا اثرات مرتب

ہوں گے۔ یہ تو ایسے ہی تھا کہ جیسے ایک سپر سٹار جرنیل نے اپنے ملک کو ایک سپر پاور کی جنگ میں دھکیل دیا۔ میں انتہائی پریشان تھا کہ یہ کس طرح ہماری جنگ تھی؟ کیا وجہ تھی کہ پاکستان نے ایک بار پھر خود کو ایک سپر پاور کے ایجنڈے کے سامنے جھکا دیا؟ اس سے پہلے 1980ء کی دہائی میں ایک اور جرنیل نے اس عمل کے ذریعے ہمیں مصیبت میں مبتلا کیا تھا اور تاریخ اب خود کو دہرا رہی تھی۔ 1980ء کی دہائی میں جنرل ضیا نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ افغانستان کے عوام کی آزادی کے لیے امریکہ کے ساتھ تعاون کر رہا ہے۔ اس عمل کے دوران پاکستان نہ صرف غیر محفوظ ہو گیا بلکہ اس کی آزادی بھی داؤ پر لگ گئی۔ 2001ء میں جب مشرف نے امریکہ کو اس کی نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کی خدمات فراہم کرنے کی پیش کش کی تو مجھے قطعی شک نہیں تھا کہ اس جنگ کی ہم ''عام پاکستانی'' ایک دفعہ پھر قیمت ادا کریں گے۔

2001ء سے لے کر اب تک ہونے والی افغان جنگ پاکستان میں انتہائی غیر مقبول رہی ہے۔ جب میں یہ کہتا ہوں تو لوگ اکثر میرے الفاظ سے غلط مفہوم اخذ کرتے ہیں۔ مجھے دہشت گردی سے کوئی ہمدردی نہیں اور میں نے ذاتی طور پر دہشت گردانہ حملوں سے نقصان اٹھایا ہے۔ مجھے تو بس ان امن پسند اور ایماندار امریکیوں اور دیگر ممالک کے شہریوں سے ہمدردی تھی جو 9/11 کو ہلاک ہوئے تھے، لیکن پھر اس کی بھارتی قیمت پاکستانیوں نے ادا کی۔ 9/11 کو امریکہ کا بہت کم نقصان ہوا اور اس کے چند ہزار شہری ہلاک ہوئے لیکن اس کے نتیجے میں پاکستان میں ہم نے لاکھوں جانوں کی قربانی دی ہے۔

9/11 کے بعد کے برسوں اور افغانستان پر امریکی حملے کے دوران پاکستان کے معاشرہ میں تشدد کا عنصر کہیں زیادہ بڑھ گیا۔ میں محض امریکی فوجی ایجنسیوں کی طرف سے ڈرون حملوں کی بات نہیں کر رہا جن کا مقصد مبینہ طور پر مخصوص دہشت گردانہ اہداف تھے بلکہ میں تو دور افتادہ مقامات پر بچوں سمیت ان درجنوں معصوم اور بے گناہ پاکستانیوں کی اموات اور امریکیوں کے خلاف پائی جانے والی نفرت کی بات کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ اس جنگ نے ہمارا اندرونی ڈھانچا بھی تباہ کر دیا ہے۔ پاکستان میں اب بندوقیں اور بم کہیں آسانی

سے دستیاب ہیں۔کئی لحاظ سے دہشت گردی اور دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ اب ایک صنعت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ طالبان یا القاعدہ کے ساتھ جنگ کے بہانے سیاسی فوائد حاصل کیے جا رہے ہیں اور اپنی قسمتیں چمکائی جا رہی ہیں۔منظم جرائم اور انتقامی کارروائیاں کی جا رہی ہیں اور اس ضمن میں بے روک ٹوک اس صورت حال کا الزام دہشت گرد گروہوں پر عائد کیا جا رہا ہے، جو ذمہ دار ہو بھی سکتے ہیں اور ذمہ دار نہیں بھی ہو سکتے۔ یہ سب کچھ اس حقیقت کے باعث میرے علم میں ہے کیوں کہ خاص طور پر میں بذات خود اس صورت حال کا اس وقت شکار ہوا تھا جب 2008ء میں میریٹ اسلام آباد پر حملہ ہوا تھا۔ 9/11 کے بعد جن لوگوں کو فائدہ پہنچا، وہ جرنیل اور سیاست دان ہیں جنہوں نے امریکہ کے ساتھ سودے بازیاں کیں۔انتہائی ڈھٹائی اور بے حیائی کے باعث وہ دولت مند ہو چکے ہیں۔ایک دفعہ مجھ سے میرے ایک دوست نے استفسار کیا کہ میں کیوں پریشان رہتا ہوں: ''یہ تو یقینی بات ہے کہ 9/11 کے بعد تمہارے ہوٹلوں میں سرکاری افسروں اور میڈیا کی شخصیتوں کی بھر مار ہوتی ہو گی۔'' صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔'' ہمارے ہوٹل تو پاکستانی مہمان داری کی روایت کے امین ہیں، اور یہاں ان سیاحوں کو بھی خوش آمدید کہا جاتا ہے جو مقامی معیشت میں اپنا حصہ ڈالیں گے اور عام پاکستانیوں کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔ میں نے اپنے یہ ہوٹل اس لیے تعمیر نہیں کیے کہ غیر ملکی یہاں بیٹھ کر میرے ملک میں ہونے والی جنگ اور اس کے نتیجے میں بپا ہونے والی سماجی افراتفری کا مذاق اڑائیں۔'' کاش! مشرف ستمبر 2001ء میں اس قدر آسانی کے ساتھ اپنے ہاتھ نہ کھڑے کر لیتا اور امریکہ کی اطاعت کا دم نہ بھر لیتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ میں اس احمقانہ فیصلے کے لیے مشرف کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔

دیگر شعبوں میں بھی مشرف نے پاکستان کو انحطاط میں مبتلا کر دیا۔ یہ درست ہے کہ وہ ایک اولوالعزم شخص تھا اور اپنے مافی الضمیر کا بخوبی اظہار کر سکتا تھا اور وہ ایک علمی اور جدید ذہن کا مالک تھا۔ وہ مذہبی جوش و جذبے سے کوسوں دور تھا لیکن وہ پاکستانی معاشرے میں اصلاحات کو آگے بڑھانے میں ناکام رہا۔ وہ نہ تو ضیا دور میں بنائے گئے مذہبی قوانین پر

نظر ثانی کر سکا اور نہ ہی اس سے نظامِ تعلیم کی اصلاح ہو پائی۔ اس نے مواقع ضائع کیے اور عوام کو وعدوں پر ہی ٹرخاتا رہا۔ اس کی تمام تر توجہ اپنی ظاہری شخصیت کو سنوارنے اور اپنی شخصیت کا ایک اچھا تاثر اجاگر کرنے پر مرکوز تھی۔ وہ ٹھوس کے بجائے علامتی اقدامات کی طرف متوجہ رہا اور وہ مغربی حلیفوں، سیاستدانوں، سفارتکاروں، جرنیلوں یا صحافیوں کو متاثر کرنے کی کوشش ہی میں مصروف رہا۔ اس نے ڈیموں یا توانائی کے منصوبوں یا پھر اس لحاظ سے یونیورسٹیوں یا فنی تعلیم کے اداروں کی صورت میں ملک کے انفراسٹرکچر میں بہتری لانے کے لیے کسی بھی قسم کی سرمایہ کاری نہیں کی۔ اگر پاکستان میں توانائی کا بحران ہے یا اگر ملک کا تعلیمی نظام زوال پذیر ہے اور بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات سے ہم آہنگ نہیں تو پھر اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرف کے عشرۂ اقتدار میں بصیرت افروز اور روشن خیال فیصلے نہیں کیے گئے۔ اس نے ملک کے آئندہ سالوں کے تقاضوں کو سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کی یا پھر اس نے پاکستان کی اس 40 فیصد آبادی کے متعلق کسی بھی قسم کی فکرمندی کا اظہار کیا جس کی عمر بیس برس سے کم ہے اور جسے گولیوں اور شور شرابے کے بجائے تعلیم اور ملازمتیں درکار تھیں۔ اس لحاظ سے مشرف خوش قسمت تھا کہ پاکستان کا کسان محنت کش اور جفاکش تھا اور اس نے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں کثیر مقدار میں فصلیں اگائیں۔ کپاس، چاول، گندم اور چینی کی پیداوار میں قابلِ تحسین طور پر اضافہ ہوا۔ انہیں حکومت سے کوئی غرض نہ تھی لیکن یہ حکومتی اطمینان اس معمولی کاشتکار کی محنت کا نتیجہ تھا جو دور افتادہ خشک کھلیانوں میں گرم سورج کے نیچے انتھک کام کرتا تھا۔

9/11 کے بعد جب پاکستان ایک دفعہ پھر امریکہ اور یورپ کا حلیف بن گیا تو 1998ء کے جوہری دھماکوں کے بعد عائد کی گئی پابندیاں اٹھالی گئیں اور پاکستان کو اہم زرعی اور (کپاس) ٹیکسٹائل مصنوعات کو امریکی اور یورپی منڈیوں تک رسائی دے دی گئی۔ اس سہولت کے فوائد نیچے کسان تک نہ پہنچے بلکہ یہ فوائد بارسوخ ایجنٹوں نے سمیٹ لیے، جن میں سے کچھ ان جرنیلوں کے قریب تھے جو اسلام آباد میں حکمران تھے۔ پاکستان کے زرمبادلہ کے ذخائر، ان برآمدات کے باعث عین اسی طرح کہیں زیادہ ہوگئے جس طرح حکومتی

آمدنیوں میں اضافہ ہوا۔ان ذخائر اور حکومتی آمدنیوں کی حقیقی معیشت میں دوبارہ سرمایہ کاری کرنے کے بجائے مشرف نے انہیں اللوں تللوں میں اڑادیا۔اس نے شوکت عزیز کو پہلے اپنا وزیرخزانہ اور بعدازاں وزیراعظم بنانے کی فاش غلطی کی۔شوکت عزیز نے سٹی بینک میں کئی برس ملازمت کی اور اس دوران اس نے خلیجی ممالک میں اپنے روابط استعمال کرتے ہوئے دولت مند عربوں کو سٹی بینک کی منافع بخش سکیموں میں سرمایہ کاری کرنے کی طرف راغب کیا۔شوکت عزیز اینٹ گارے کے کاروبار کا نہیں بلکہ سرمائے کی منڈی کے علاوہ معاشی ترقی کا پجاری تھا۔ نچلی سطح پر دولت کی پیداوار اور معاشی ترقی اس کے بس کی بات نہیں تھی۔اس نے سرکاری کارپوریشنوں کو ترغیب دی کہ وہ اپنے فاضل سرمائے کی حصص کی منڈی میں سرمایہ کاری کریں۔جب 08-2007ء میں منڈیاں زوال پذیر ہوئیں تو لاکھوں ڈالر ڈوب گئے۔یہ کوئی نجی سرمایہ نہیں تھا بلکہ پاکستانی عوام کا سرمایہ تھا۔ بالآخر 2007ء میں مشرف نے ''نیشنل ری کانسیلیشن آرڈیننس'' (NRO) نافذ کیا جو ایک ایسا متنازع قانون تھا جس کے ذریعے 1986ء تا 1999ء ان تمام لوگوں (بشمول سیاستدانوں، سرکاری ملازموں اور کاروباری افراد) کو معافی دے دی گئی جن پر بدعنوانی، رشوت ستانی اور منی لانڈرنگ کے الزامات تھے۔میں اس پیش رفت پر خوف زدہ ہوگیا۔لاکھوں ڈالر کے نادہندگان کے قرضے معاف کردیے گئے۔ایک کاروباری فرد کی حیثیت سے جس نے ہمیشہ بینکوں کے قرضے بروقت ادا کیے اور کبھی نادہندہ نہیں ہوا، میں نے محسوس کیا کہ یہ دن دہاڑے ڈاکہ تھا۔اس کے باعث عوامی اعتماد کو ٹھیس پہنچی اور عوامی خزانے کی چوری کو جائز حیثیت دے دی گئی۔بظاہر بے ایمان مگر بارسوخ افراد کو قلم کی ایک جنبش کے ذریعے معاف کردیا گیا۔

''نیشنل ری کانسیلیشن آرڈیننس''، مشرف اور بینظیر کے درمیان ایک معاہدے کا حصہ تھا جو اپنی پاکستان واپسی کے لیے مشرف کے ساتھ اپنی شرائط طے کررہی تھی۔ستم ظریفی تو یہ ہے کہ مشرف کے اس آرڈیننس کا سب سے زیادہ فائدہ زرداری اور پی پی پی کے دیگر سرکردہ رہنماؤں کو پہنچا تھا۔ایک دفعہ پھر ایک مفاد پرست اشرافیہ نے پاکستان کو ناکام کردیا تھا۔

2002ء میں مشرف نے ایک ریفرنڈم کا انعقاد کیا جس نے بطور پاکستان اس کی مدت اقتدار میں پانچ برس تک اضافہ کر دیا۔ اس عرصے کے دوران اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ ایک مقبول اور کرشماتی رہنما ہے اور ایک طویل عرصے تک حکومت کر سکتا ہے۔ اس کے مسائل میں 2007ء میں اس وقت کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا جب اس نے سپریم کورٹ کو نیچا دکھانے کی کوشش میں چیف جسٹس افتخار چوہدری کے علاوہ 14 دیگر ججوں کو معزول کر دیا۔ ایک ایسے شخص کے لیے جس نے پاکستان کے اداروں کی عظمت قائم رکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ مشرف نے سپریم کورٹ کی آزادی وخودمختاری کو تباہ کرنے کا منصوبہ تیار کیا کیوں کہ چوہدری نے مشکل سوالات پوچھنے شروع کر دیے تھے۔ 35 ججوں اور بہت سے وکلاء کو ان کے گھروں میں نظر بند کر دیا گیا۔ وسیع پیمانے پر مظاہروں کا آغاز ہو گیا۔ عدلیہ کی غیر متزلزل مزاحمت نے عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا اور مشرف نے زمین اپنے پاؤں کے نیچے سے سرکتی ہوئی محسوس کی۔

میں 2007ء میں جسٹس چوہدری کی حمایت میں باہر نکل آیا۔ میں ذاتی طور پر ان سے واقف نہیں تھا، لیکن جس طرح ایک پُرعزم جج کو فوجی جنتا کی طرف سے غنڈہ گردی کا نشانہ بنایا جا رہا تھا، اس نے میرے دل کو بہت ٹھیس پہنچائی۔ وکلاء برادری نے میری کوششوں کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن آف پاکستان، ڈائریکٹری کے نام اپنے صدارتی پیغام میں مشہور پاکستانی وکیل اور دانشور اعتزاز احسن نے وکلاء برادری کی جدوجہد کے ساتھ تعاون کے ضمن میں میرے ''بھرپور تعاون'' کا خاص طور پر ذکر کیا۔

عدلیہ کو اپنے قابو میں لانے کی کوشش کے باعث مشرف کافی حد تک اپنی ساکھ کھو بیٹھا۔ 1999ء کا سیدھا سادہ جنرل 2007ء میں ایک شاطر سیاستدان بن چکا تھا۔ یہ نہایت ہی بدقسمتی کی بات تھی۔ کچھ برسوں تک مشرف دبئی میں رہا۔ کبھی کبھار ہماری ملاقات ہوتی لیکن سیاست پر شاذ ہی گفتگو ہوتی۔ ایک جرنیل اور ایک سیاستدان کی حیثیت سے اس نے بہت کچھ سیکھا تھا اور میرے نزدیک اس کی یہ بات نہایت قابلِ احترام تھی۔ اس کا مزاج شگفتہ اور ملنسار تھا۔ اس کے باوجود اس کے مشیر اسے ایک سیاسی جماعت تشکیل دینے کا مشورہ دیتے

رہے۔ میں تو اسے صرف یہ کہہ سکتا تھا،''ایسا سوچنا بھی مت، ان آٹھ برسوں میں تم نے جو کچھ حاصل کیا، اس پر اکتفا کرو۔'' مجھے خدشہ ہے وہ اپنے اردگرد ان لوگوں کو دوبارہ اکٹھا کرلے گا جو اسے وہی کہتے جو وہ سننا پسند کرتا اور اس پر یہ ''خودفریبانہ سحر'' طاری ہوگیا کہ پاکستان میں بہت سے لوگ اسے واپسی پر خوش آمدید کہیں گے۔ جب اس نے پاکستان واپس جانے کا فیصلہ کرلیا، میں نے اسے ایسا نہ کرنے کا مشورہ دیا لیکن وہ بضد تھا۔ اس نے مجھے بتایا،''دیکھو، ٹویٹر اور فیس بک پر میرے کس قدر پرستار ہیں۔'' میں نے اپنے کاندھے اچکائے اور صرف یہی کہہ سکا،''اللہ کا شکر ہے کہ میرا فیس بک کا کوئی اکاؤنٹ نہیں!''

2007ء کے اواخر میں دوسرا واقعہ بینظیر بھٹو کی واپسی کا تھا۔ جیسے ہی 2008ء کے اوائل میں عام انتخابات سر پر آن پہنچے۔ بینظیر، دبئی اور لندن میں نو سال کی جلاوطنی ختم کرکے وطن واپس آگئی۔ جب اس نے 18 اکتوبر 2007ء کو کراچی میں قدم رکھا، اس کا استقبال نہ صرف ایک بہت بڑے ہجوم بلکہ اسی وقت ایک بم کے حملے نے بھی کیا جب وہ ایئرپورٹ سے باہر آرہی تھی۔ بینظیر کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن ایک سو افراد ہلاک ہوگئے۔ یہ صورت حال اس امر کا ثبوت تھی کہ افغانستان میں چپقلش پیدا ہونے کے بعد پاکستان میں سیاست اور زندگی کس قدر تبدیل ہوگئی تھی۔ میں بینظیر سے ملاقات نہیں کرسکا لیکن میں اس کی واپسی اور اس کے حمایتیوں کی طرف سے استقبال کے متعلق مسلسل باخبر تھا۔ مجھے مختلف ذرائع سے معلوم ہوا کہ ایک قاتل اس کے قتل کے درپے ہے اور اس کے بارے میں اس نے اسے تنبیہ کا ایک پیغام بھیجا۔ مجھے اس وقت اس سینئر رہنما کے بارے میں علم نہ تھا کہ جس کے ذریعے میں نے پیغام بھیجا اسی پر بعد ازاں قتل کی سازش میں شریک ہونے کا شبہ کیا جائے گا۔ 27 دسمبر کو اس وقت بینظیر کو قتل کردیا گیا جب وہ راولپنڈی کے لیاقت باغ میں منعقدہ ایک جلسے سے واپس لوٹ رہی تھی۔ جب وہ اپنی گاڑی میں کھڑی ہوئیں اور اس کی چھت سے گردن باہر نکالی تو انہیں گولی مار کر قتل کردیا گیا۔ چند ثانیوں کے اندر ہی اس کی گاڑی کے قریب ہی دھماکے ہوئے۔ مختلف گروہ مثلاً القاعدہ، طالبان، لشکرِ جھنگوی، وغیرہ وغیرہ کو بینظیر کے قتل کا قصوروار ٹھہرایا گیا لیکن مجھے ہمیشہ سے ہی یہ یقین تھا کہ یہ ایک سیاسی

سازش تھی۔اس کے قتل کے دو گھنٹوں کے اندر ہی سندھ میں افراتفری مچ گئی اور ہر طرف آگ اور خون کا طوفان برپا ہوگیا، بینک لوٹے جانے لگے، اے ٹی ایم مشینیں توڑ دی گئیں، بینکوں میں تجوریوں کو نہایت ہی حساس آلات سے زبردستی کھولا گیا جن کا حصول آسانی سے ممکن نہیں تھا۔ یہ سب کچھ اس قدر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہو رہا تھا کہ جس طرح کسی نے ایک سوئچ دبا دیا ہو۔ بینظیر میں کئی ایک کمزوریاں ہوں گی لیکن حقیقت یہ تھی کہ انہیں پاکستان بہت عزیز تھا۔کراچی جانے کے لیے پرواز حاصل کرنے سے قبل وہ امریکہ اور عالمی بینک کے ساتھ اپنے روابط مضبوط کر چکی تھیں۔ اگر وہ 2008ء میں انتخابات جیت جاتیں جس کی بڑی حد تک توقع تھی، تو ان کے پاس ایک سیاسی سرمایہ اور ذرائع موجود تھے جن کے ذریعے وہ معاشی بحالی کے سفر پر گامزن ہو جاتیں۔ جن مشترکہ دوستوں نے 2007ء میں ان سے ملاقات کی وہ کہتے ہیں بینظیر بھٹو نے 1990ء کی دہائی میں کی گئی اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیا تھا۔ ہوسکتا ہے یہ بات درست ہو یا غلط لیکن اب ہم یہ کبھی نہیں جان پائیں گے۔ بطور وزیراعظم، بینظیر اپنے اقتدار کی تیسری مدت میں کیا کارنامہ سرانجام دیتیں یہ بات پاکستان کی تاریخ کے اگر مگر کا ایک معمہ ہی رہے گا۔ہمیں تو صرف یہ علم ہے کہ حکومت، سیاسی اسٹیبلشمنٹ اور پی پی پی میں شامل بہت سے لوگ بینظیر کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔ جن لوگوں نے بینظیر کی موت سے فائدہ اٹھایا، ہوسکتا ہے کہ بینظیر کو عوامی زندگی کے منظرنامے سے اچانک ہٹانے کے لیے وہ متحد ہو گئے ہوں۔

بلاشبہ، کسی کو تو بینظیر کے خون سے فائدہ پہنچا تھا۔

باب 11

آگ کے حلقے میں!

میری نسل کے بہت سے پاکستانیوں کے لیے بینظیر کا قتل ایک ہیجان خیز لمحہ تھا۔ اس سے قطع نظر کہ آپ پیپلز پارٹی کے ایک حمایتی اور بھٹو کے قدیم وفادار تھے یا آپ نے ان تمام برسوں میں ان کی مخالفت کی ہو، یہ صدمہ ان تمام امتیازات سے ماورا تھا۔ بینظیر کی موت سے نہایت تلخ انداز میں ظاہر ہوا کہ پرانے دن ہمیشہ کے لیے گزر چکے ہیں۔ وہ بھٹو خاندان جس نے پاکستان کی عوامی زندگی کو 1970ء کی دہائی سے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا اور جسے ذوالفقار علی بھٹو کی مسحور کن خطابت کی مدد بھی حاصل تھی، اب کبھی اُس طرح ملک گیر سطح پر بھرپور انداز میں پاکستانی سیاست میں داخل ہوسکتا یا کردار نہیں ادا کرسکتا۔ خواہ بینظیر کا نوجوان بیٹا سیاست کو اوڑھنا بچھونا بھی بنا لے تو اس دور کو واپس نہیں لا سکتا۔ اس وقت نہایت بھرپور انداز میں یہ احساس و ادراک پیدا ہو چکا تھا کہ بطور معاشرہ پاکستان میں مستقبل کے تمام آنے والے وقتوں کے لیے تبدیلی واقع ہو چکی ہے یا کم از کم اس تبدیلی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے ایک تنبیہ تھی جو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ نائن الیون اور افغانستان میں نئی جنگ کے بعد تشدد اور خون ریزی جیسے مسائل عارضی نوعیت کے ہیں۔ اب انہیں یہ ادراک ہوگیا کہ یہ محض ایک ڈراؤنا خواب نہیں تھا جو جلد ہی ختم ہو جاتا۔ اس صورت حال کے باعث بنیادی تبدیلی واقع ہوگئی اور ایک نئی اور خوفناک قسم کی سیاسی فعالیت نے پاکستان میں جڑ پکڑ لی۔ اس کا اظہار الفاظ سے نہیں بلکہ گولیوں اور بموں سے ہو رہا تھا۔

اس سے پہلے بھی پاکستان میں وقفے وقفے سے متشدد صورت حال پیش آتی رہی۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے (باب 10)۔ کراچی کی سیاست عام طور پر جرم اور رقم اینٹھنے کی صورت میں متشکل ہوئی لیکن یہ صورتحال آج کی صورت حال کے مقابلے میں معمولی نوعیت کی تھی۔ بے شمار دہشت گرد گروہوں اور مذہبی انتہا پسندوں کی نجی ملیشیاز جن کا ڈھکے چھپے یا علانیہ تعلق ان جرائم پیشہ گروہوں سے تھا جن کی معاونت سینئر سیاستدان کرتے، خودکش بمبار، غیر ملکیوں پر حملے ...... خواہ یہ حملے کسی منصوبے اور ایجنڈے کے تحت چینی انجینئروں پر ہوں یا لاہور میں مارچ 2009ء میں سری لنکا کی کرکٹ ٹیم پر...... جلاوطنی سے واپسی کے 9 یا 10 ہفتوں میں ایک مرکزی سیاستدان اور سابق وزیراعظم کا بہیمانہ قتل اشارہ کر رہا تھا کہ ہمارے ملک میں ساختیاتی تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔

بینظیر کی موت نے پرویز مشرف کا سیاسی سفر بھی انجام کو پہنچا دیا تھا۔ تیزی سے تبدیل ہوتی اس صورت حال کے باعث مشرف کی اعتباریت کو ٹھیس پہنچی اور پاکستان میں عدم تحفظ اور لاقانونیت معمول بن چکی تھی۔ اکتوبر 2007ء میں مشرف نے خود کو اس اسمبلی سے دوبارہ صدر منتخب کروالیا جس کی مدت ختم ہونے جا رہی تھی۔ اس نے رسمی طور پر فوج سے استعفٰی دے دیا اور خود کو ایک غیر فوجی صدر قرار دے دیا اور یہ شیخی بگھاری کہ وہ آئندہ پانچ سال بھی ریاست کا سربراہ ہوگا۔ اس کا یہ بیان اس معاہدے کا ایک حصہ تھا جو اس کے مغربی آقاؤں اور بینظیر کے مابین طے پایا تھا۔ اس معاہدہ کے تحت وہ اسلام آباد کے طاقت کے ایوانوں کا ایک فریق ہوتا جبکہ بینظیر ملک کی وزیراعظم ہوتیں۔ عام انتخابات کے لیے 8 جنوری 2008ء کی تاریخ مقرر ہوئی اور یہ پیشگوئی کی گئی کہ بینظیر کی جماعت کو اکثریت حاصل ہوگی۔ اقتدار کا ایک ایسا گٹھ جوڑ وجود میں آنے کو تھا جس میں مشرف کو بطور صدر اور بینظیر کو بطور وزیراعظم کردار سونپے گئے تھے اور اس پلان کے لیے مغربی قوتیں کام کر رہی تھیں۔ پاکستانی سیاست میں بے روک ٹوک اور آزادانہ مداخلت کے ذریعے یہ قوتیں نواز شریف کو تنہا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں حالانکہ وہ پنجاب کا ایک مقبول سیاستدان تھا۔ بینظیر کے قتل کے بعد یہ سیدھا سادا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ قومی اسمبلی کے انتخابات

24 فروری تک ملتوی کر دیے گئے اور ایک غیر فیصلہ کن نتیجے پر منتج ہوئے۔ بینظیر کے قتل کی ہمدردیاں سمیٹتے ہوئے پی پی پی واحد اکثریتی جماعت کی حیثیت سے ابھری لیکن وہ 30 فیصد سے کچھ زائد نشستیں ہی جیت سکی۔ پی ایم ایل (ن) نے دوسری پوزیشن حاصل کی اور اسے تقریباً ایک چوتھائی نشستیں حاصل ہوئیں۔ یہ ایک معلق پارلیمان تھی۔ بالآخر دو بڑی جماعتوں اور ان کے قائدین، زرداری اور نواز شریف کو باہمی اتحاد پر مشتمل ایک قومی حکومت تشکیل دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ بھی واضح ہو چکا تھا کہ انہیں اب نیا صدر منتخب کرنا ہوگا کیوں کہ مشرف کے خلاف مواخذے کی کارروائی جلد ہی شروع ہونے کو تھی۔ نواز شریف کی جماعت 1999ء کی فوجی بغاوت کے باعث مشرف کو معاف کرنے سے قاصر تھی اور اس کی خواہش تھی کہ اسے سزا دی جائے۔ مشرف نے عدلیہ کے خلاف جو مکروہ اور ظالمانہ مہم چلائی تھی اس کے باعث بھی اسے سخت نقصان پہنچا اور اسلام آباد میں اس کے چند دوستوں کے سوا سب نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ بالآخر بینظیر بھٹو کے قتل کے بعد جس متشدد طرز عمل کا آغاز ہوا اس کے باعث مشرف کے اس دعوے کی قلعی کھل گئی کہ اس نے ملک کو تباہی اور بحران سے بچا لیا تھا۔ اب یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ مشرف کی طرف سے دور افتادہ قوتوں کے ساتھ دیتے ہوئے پر خطر مہم جوئی اور افغانستان میں نہ ختم ہونے والی جنگ کا حصہ بننا حماقت تھی۔ اس کھیل اور مہم جوئی کے باعث پاکستانی معاشرہ غیر محفوظ ہو گیا تھا اور پاکستان کہیں زیادہ خطرناک مقام بن چکا تھا۔ اس کے برعکس اب 1990ء کی دہائی انتہائی خوشگوار نظر آتی تھی (اگرچہ ایسا بھی نہیں تھا)۔ پرویز مشرف کی حیثیت ٹوٹ پھوٹ چکی تھی اور اسے 2008ء میں استعفیٰ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ تین ماہ بعد انہوں نے ملک چھوڑ دیا اور پہلے لندن اور پھر دبئی چلے گئے۔

عام انتخابات کے بعد پی پی پی کے ایک دیرینہ رہنما یوسف رضا گیلانی وزیراعظم بن گئے۔ تاہم اصلی وحقیقی اختیارات زرداری کے پاس ہی تھے۔ جب 2007ء میں بینظیر وطن واپس لوٹیں، انہیں ان کے بہی خواہوں نے بتایا کہ ان کے خاوند کی شہرت نے انہیں پہلے ہی بطور وزیراعظم نقصان پہنچایا تھا۔ بے نظیر کی طرف سے یہ عندیہ دیا گیا کہ وہ یہ

معاملہ سمجھ چکی ہیں اورانہوں نے زرداری آگاہ کر دیا ہے کہ اگر پی پی پی کوحکومت تشکیل دینی پڑی تو زرداری کو ملک سے باہر رہنا ہوگا اور خود کوحکومت سے دُور رکھنا ہوگا۔اس نے یہ غیر رسمی شرط عائد کی تھی۔اب بینظیر اس دنیا میں نہیں تھیں اور ان کا بھائی اور بھٹو خاندان کی سیاسی وراثت کا دعویدار مرتضیٰ بھٹو چند برس پہلے ہی پولیس کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔بینظیر کا بیٹا بلاول اس وقت بہت چھوٹا تھا اس لیے کسی عوامی عہدے پر فائز نہیں ہو سکتا تھا۔اس صورت حال میں ،زرداری جو سیاسی طور پر بڑا موقع پرست تھا، پی پی پی کے سرپرست کی حیثیت سے باقی رہ گیا۔ان دنوں مشرف کے ستارے گردش میں تھے اور مغرب نواز شریف پر مکمل اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھا۔زرداری کی جانب سے واشنگٹن اور لندن میں اپنے حمایتیوں اور حواریوں کے ذریعے اپنے لیے حمایت حاصل کرنے کی بنا پر طاقت کے محور اور محرکات بدل گئے۔زرداری نے ان بڑی طاقتوں کی نظر میں بلند مقام حاصل کرلیا جو ستمبر 2001ء کے بعد پاکستان پر کم ہی اعتماد کرتی تھیں۔یوں زرداری ملک میں انتہائی طاقتور سیاست دان بن کر سیاسی منظر نامے پر ابھرا۔جو لوگ اس کی زندگی کے ابتدائی برسوں سے اس کے شناسا تھے، ان کے لیے یہ سب کچھ حیران کن حد تک ناقابل یقین تھا۔ستمبر 2008ء میں زرداری صدارت کے بالواسطہ انتخابات کے لیے بطور امیدوار سامنے آیا۔امیدواروں کے لیے کالج گریجویٹ ہونے کی شرط لازمی تھی اور زرداری نے کبھی کالج کا منہ نہ دیکھا تھا۔اپنے کاغذات نامزدگی میں اس نے لکھا کہ اس نے لندن کے ایک ادارے سے بزنس ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کی کوئی ڈگری یا سرٹیفکیٹ پیش نہیں کیا گیا۔ہم میں سے جو لوگ اس کے ماضی سے واقف تھے، انہیں علم تھا کہ اس قسم کی ڈگری یا سرٹیفکیٹ کا کہیں وجود نہیں۔

زرداری کے صدر پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد میں نے زرداری سے ملاقات کی۔اس کی باڈی لینگویج اور آنکھوں میں موجود چمک خطرناک تھی۔اس شام کو بعد ازاں پاکستان کے دورے پر آیا ہوا میرا ایک پرانا واقف کار برطانوی صحافی میرے پاس آیا۔اس نے مجھ سے استفسار کیا، ''اپنے نئے صدر کے بارے میں تمہارے کیا خیالات ہیں؟'' میں

چپ رہا اور اپنے ماضی کے خیالات مجتمع کرتا رہا۔ اس صحافی نے اپنا سوال دہرایا: ''اپنے نئے صدر کے بارے میں تمہارے کیا خیالات ہیں؟'' اب میرے پاس جواب دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے نرمی سے کہا، '' کچھ نہیں!'' میرے ملاقاتی نے کہا، ''بہت خوب! ایک ایسا شخص جس کا ملک بحران میں ہے اور جس کی بیوی چند ماہ پہلے ایک خوفناک حادثے میں اس سے جدا ہو چکی ہے، مقام حیرت ہے کہ ہر وقت اس کے ہونٹوں پر ایک کشادہ مسکراہٹ پھیلی رہتی ہے۔'' میں نے کچھ نہیں کہا لیکن اس نے جو کہنا تھا، کہہ دیا تھا۔ اس دور میں جن بہت سے لوگوں سے زرداری کی ملاقات ہوئی، ان کی طرف سے بھی یہی تاثر سامنے آیا۔ بطور صدر، زرداری انتہائی خوش قسمت ثابت ہوا۔ فوج سیاست میں براہ راست مداخلت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مشرف کے تجربے کے بعد فوج نے محسوس کیا کہ اسے جمہوری سیاست کو ایک بھرپور موقع ضرور دینا چاہیے اور یہ موقع دینے کا عمل نظر بھی آنا چاہیے۔ اور سب سے آخری بات یہ بھی کہ زرداری نے اہم جرنیلوں کی مدت ملازمت میں توسیع کے ذریعے ان کے دل جیت لیے تھے۔ مغرب میں بارسوخ حلقوں کی زرداری کے ساتھ مفاہمت ہو چکی تھی اور وہ پاکستان کو ایک سیاسی جمہوری ریاست کے طور پر دیکھنے کے شدید خواہشمند تھے۔ مغرب یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ انھوں نے فوجی راج ختم کرانے کے لیے اپنا رسوخ استعمال کیا اور وہ پاکستان میں جمہوریت کو فروغ دے رہے ہیں۔

امریکی سینیٹرز، جان کیری اور رچرڈ لوگر کے پیش کردہ (The Enhanced Partnership With Pakistan Act ,2009) جسے کیری لوگر بل کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے، کا مقصد زرداری حکومت کو مالی مدد فراہم کرنا اور فوج کے اختیارات کم کرتے ہوئے اسے کمزور کرنا تھا۔ اس موقع پر فوج نے مدافعانہ رویہ اختیار کر لیا۔ یوسف رضا گیلانی اور دیگر وزراء بے اختیار تھے کیونکہ وہ بہت کمزور اور یکسوئی سے عاری حکومت کا حصہ تھے۔ زرداری نے اس صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ پی پی پی کے ایک لیڈر کی حیثیت سے اس نے یہ امر یقینی بنا لیا کہ پارٹی کے اندر اس کے مخالفین نہ ہوں۔ آہستہ آہستہ اس نے پارٹی کو ایک جاگیر میں تبدیل کر دیا۔ اپنے سسر کے زمانے کے قدیم انداز فکر کے حامل سیاستدان

جو 1990ء کی دہائی میں بینظیر کی رہنمائی کے لیے اس کے اردگرد جمع تھے، انہیں زرداری نے دیوار سے لگا دیا۔ ان سیاستدانوں کو پارٹی معاملات سے بے دخل کر کے زرداری نے پارٹی پر اپنی مکمل گرفت قائم کر لی۔ ایک شخص جو عوامی انتخاب نہیں جیت سکا تھا اور شاید جیت بھی نہیں سکتا تھا، 200 ملین لوگوں کی قسمت کا مالک بن بیٹھا تھا۔ جیسی اس سے توقع کی جا سکتی تھی، اس نے اپنے پرانے ہتھکنڈے جلد ہی دوبارہ اختیار کر لیے۔ اس دفعہ اسے ایک بہانہ حاصل ہو گیا تھا کہ ہر قسم کی افراتفری اور مسائل کا الزام ''دہشت گردی'' کے سر منڈھا جا سکتا تھا۔ دراصل وہ منصب صدارت کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ اپنے مقاصد اور ہتھکنڈوں کے لحاظ سے زرداری 1990ء کے زرداری اور 2008ء کے زرداری سے قطعی مختلف نہ تھا۔ اگر دونوں 'زرداریوں' میں کچھ فرق رونما ہوا تھا تو وہ بدترین قسم کا تھا...... مسٹر ٹین پرسنٹ...... مسٹر ہنڈرڈ پرسنٹ بن چکا تھا۔

یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ میں خود کو مشکلات میں گھرا ہوا اور شکار کیے ہوئے شخص کے مانند محسوس کر رہا تھا۔ مجھے حال میں ماضی کا عکس دکھائی دینا شروع ہو چکا تھا۔ ایک ایسا احساس جو مجھ پر پہلے کبھی گزر چکا تھا، دوبارہ مجھ پر طاری ہو گیا۔ حالانکہ وہ دور 1990ء کا تھا، اب خطرات کہیں زیادہ ہو چکے تھے۔ 2008ء اور 2009ء میں میری جان لینے کی پانچ کوششیں کی گئیں۔ اسلام آباد میں میرے گھر کو آگ لگا دی گئی۔ اسلام آباد کے یونائٹڈ بینک ٹاور میں واقع ہاشو گروپ کے صدر دفتر کے ان کمروں میں آتش زنی کی ایک واردات کے باعث آگ بھڑک اٹھی جہاں میں ہر روز کام کرتا تھا۔ جون 2009ء میں پرل کانٹی نینٹل پشاور میں بم کا ایک مذموم دھماکہ ہوا۔ اقوام متحدہ کے ایک انتہائی سینئر افسر سمیت 17 افراد ہلاک ہو گئے۔ بلاشبہ ہاشو گروپ پر سب سے خطرناک حملہ 20 ستمبر 2008ء کو ہوا۔ یہ ایک انتہائی دردناک دن تھا...... ایک ایسا دن جسے میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکوں گا، اس شام میں اسلام آباد میں تھا اور اس وقت عبادت میں مصروف تھا کہ اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے عبادت جاری رکھی۔ اس وقت شام آٹھ بج کر تین منٹ ہوئے تھے۔ جب میں نے فون کال وصول کی تو دوسری جانب میریٹ ہوٹل کا ایک ایگزیکٹو بات

کرر ہا تھا۔ اس نے جونہی بات شروع کی، میرے پاؤں کے نیچے سے زمین ہل گئی۔ جو کچھ مجھے بتایا گیا اس کے مطابق 9 منٹ قبل 7:54 پر ایک خودکش بمبار بھاری مقدار میں دھما کہ خیز مواد سے بھرا ہوا ٹرک ہوٹل کے اندر لے گیا اور خود کو اڑا لیا۔ مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا...... اگر میں معمول کی دفتری ذمہ داریاں ادا کر رہا ہوتا، تو میں اپنے بیٹے مرتضٰی کی بیوی کی سالگرہ کی تقریب کے موقع پر رات کا کھانا کھا رہا ہوتا۔ میں ایک اور خاندانی تقریب میں اپنی بیٹی نادیہ کے بیٹے اور اپنے نواسے علی کی سالگرہ تقریب میں شرکت کے لیے ہوٹل جا رہا تھا۔ (علی ستمبر میں پیدا ہوا تھا لیکن اس برس یہ تقریب چار دن بعد منعقد ہوئی تھی)۔ ہوٹل پہنچنے سے پہلے ہی میں نے نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد میں رکنے کا فیصلہ کیا اور اسی فیصلے نے مجھے موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا۔ جیسے ہی میں مسجد سے باہر نکلا...... خوف کا احساس مجھ پر طاری ہو گیا۔ سینکڑوں خیالات اور وسوسے میرے ذہن میں طوفان بپا کیے ہوئے تھے...... لیکن میں نے جلدی سے کار میں بیٹھنے اور ہوٹل کی طرف بھاگنے کے دوران اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کو ترجیح دی۔ وہاں کوئی خوبصورت ہوٹل نہیں تھا جو ہم نے انتہائی لگن سے تعمیر کیا بلکہ میں تو کسی میدانِ جنگ کا سا منظر دیکھ رہا تھا۔ جب ہوٹل میں بم پھٹے تو اس وقت وہاں 2000 افراد موجود تھے۔ ساٹھ لوگ جاں بحق اور 300 افراد زخمی ہو گئے تھے۔ ہم نے اپنے پیارے مہمانوں، ساتھیوں اور دوستوں کے لاشیں سمیٹیں۔ وہ چہرے جن کو میں پہچانتا تھا، وہ چہرے جن کے ساتھ میں کام کرتا تھا، جن کے ساتھ میں ہنستا مسکراتا تھا۔ وہ منظر جس نے مجھے ششدر کر دیا...... وہ 60 فٹ چوڑا اور 20 فٹ گہرا گڑھا تھا...... اور...... یہ گڑھا RDX کے 1000 سے زائد کلوگرام مواد سے بنا تھا۔ ہوٹل پر صرف حملہ نہیں ہوا تھا بلکہ اسے ظلم کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ مرنے والے افراد کی لاشیں اور ادھڑے ہوئے انسانی اعضاء، خون کے تالاب...... یہ ایک قتل عام کا سماں تھا۔ میں نے ہمیشہ خود کو ایک سرد مہر شخص کے مانند محسوس کیا جس نے تشدد اور خوفناک و مہیب مناظر دیکھے تھے لیکن جو کچھ اس روز میں نے دیکھا، اس نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔

میرے وہاں پہنچنے پر مقامی اور بین الاقوامی صحافیوں نے مجھ سے بات کرنا چاہی۔

میں اس وقت اس قدر جذباتی ہو چکا تھا کہ میں ان سے تفصیلی بات ہی نہ کر سکتا تھا لیکن مجھے یاد ہے کہ میں نے پہلا فقرہ یہ کہا تھا، ''مجھے اس ہوٹل کی فکر نہیں، ہم اسے تعمیر کر سکتے ہیں لیکن ان لوگوں کو کون واپس لائے گا جو جاں بحق ہو چکے ہیں؟''

اسلام آباد میریٹ ہوٹل آغا خان روڈ پر واقع ہے۔ یہ انتہائی محفوظ علاقہ ہے اور اسلام آباد کو واشنگٹن ڈی سی کے مترادف قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے قرب و جوار میں پارلیمنٹ، سپریم کورٹ، ایوان صدر، وزیراعظم سیکریٹریٹ اور وزیراعظم ہاؤس جیسی اہم عمارتیں واقع ہیں۔ یہ کوئی ایسا علاقہ نہیں جہاں ایک عام شخص محض تفریح کی خاطر بڑے آرام سے یونہی کار چلاتے ہوئے داخل ہو جائے اور کوئی اسے چیک نہ کرے۔ وہ کاریں جو اس علاقے سے تعلق نہیں رکھتیں، جو حکومت کی ملکیت نہیں یا انہیں سکیورٹی حکام نے اجازت نہیں دی، انہیں عام طور پر میریٹ کے قریب سڑکوں پر نہیں دیکھا جاتا۔ مجھے یہ چیز عجب سی محسوس ہوئی کہ ایک پورا ٹرک جو دھماکہ خیز مواد سے بھرا ہوا تھا اور جس کا سراغ سکیورٹی حکام اور پولیس کے سپاہی نہیں لگا سکے تھے جو وہاں باقاعدگی سے ہر وقت گشت کرتے رہتے تھے، نہ صرف اس محفوظ علاقے میں داخل ہو گیا تھا بلکہ اس نے اپنا کام کسی کے روکے بغیر بخوبی انجام دے دیا تھا۔ 7:54 pm پر آٹھ پہیوں والا ڈمپر ٹرک واضح طور جس کی حفاظت کے لیے اس کے آگے کار بھی تھی، میریٹ کے سامنے کے داخلی راستے کی طرف اچانک مڑا۔ آگے جانے والی کار کسی اور سمت مڑ گئی کیوں کہ اس کا کام ختم ہو چکا تھا۔ ہوٹل کے داخلی راستے پر ٹرک ڈرائیور کو بھاری بھرکم سٹیل کی رکاوٹیں نظر آئیں جن کے باعث داخلی راستہ بند ہو چکا تھا۔ یہ رکاوٹ خودکار نظام کے تحت کام کرتی تھی اور صرف اس وقت ہی نیچے ہوتی جب آنے والی گاڑی کا معائنہ ہماری سکیورٹی ٹیم کر لیتی۔ ٹرک رکاوٹ کے ساتھ ٹکرایا لیکن اسے توڑ نہ سکا اور یہ عمل انتہائی تیز رفتاری سے واقع ہوا اور ٹرک کا بہت بڑا جنگلہ سٹیل کی رکاوٹ میں پھنس گیا۔ عین اسی وقت، ٹرک کا ایک ٹائر پھٹ گیا۔ ہوٹل کا حفاظتی عملہ ٹرک کی طرف دوڑ کر آیا تاکہ ڈرائیور کو مزید نقصان کرنے سے روک سکے۔ ان قیمتی ثانیوں میں ڈرائیور نے کچھ دھماکہ خیز مواد اڑا دیا اور ٹرک شعلوں سے بھڑک اٹھا۔

بغیر کسی تاخیر کے ہمارے حفاظتی عملے نے آگ بجھانے والے آلات استعمال کرنا شروع کر دیے لیکن شعلے اس قدر بلند تھے کہ آگ پر قابو نہ پایا جا سکا۔ یہ حملہ تو محض ایک دھوکہ اور توجہ ہٹانے کے لئے تھا۔ چار منٹ بعد ڈرائیور نے ٹرک میں موجود بھاری مقدار میں دھماکہ خیز مادہ اڑا دیا۔ دھماکہ انتہائی شدید تھا جس نے زمین کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہوٹل کی عمارت بھی دھماکے کے باعث لرز گئی۔ یہ ایک خودکش حملہ تھا۔ قاتل ڈرائیور فوری طور پر موت کا شکار ہوگیا لیکن 1000 کلوگرام نے میریٹ اور اس کے احاطے میں موجود انسانوں کا جتنا نقصان کرنا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ تاہم دو منٹ بعد کچھ عجب واقعہ رونما ہوا۔ ہوٹل کی عمارت کی چوتھی اور پانچویں منزل پر آگ بھڑک اٹھی۔ جنہوں نے یہ آگ دیکھی، انہوں نے سمجھا کہ دھماکے کے باعث یہ آگ لگی اور یہ شعلے نہایت تیزی کے ساتھ اوپر کی طرف پھیل رہے تھے۔ چوتھی اور پانچویں منزل کے کمروں سے پھیلنے والے شعلے نیلے رنگ کے تھے۔ دھماکہ خیز مواد اور فرانزک ماہرین نے کہا کہ نیلے رنگ کے شعلوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیمیائی اجزا سے یہ آگ لگائی گئی۔ یہ شعلے عام آگ کے باعث پیدا نہیں ہو سکتے تھے جو عمارت میں پھیل رہے تھے اور پردوں، بستر کی چادروں، میزوں اور کرسیوں کو نگل رہے تھے۔ تحقیقات کے ذریعے توثیق ہوگئی کہ جو لوگ ان کمروں میں گئے، انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کمروں کے اندر درجہ حرارت 300 ڈگری سنٹی گریڈ تک پہنچ گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کیمیائی اجزا کے استعمال کے ذریعے ان کمروں میں علیحدہ سے آگ لگائی گئی جو ٹرک میں موجود R D X سے مختلف تھے۔

صاف بات تو یہ ہے اُس وقت مجھے یہ سب کچھ محسوس نہیں ہوا کیوں کہ میں پریشان تھا اور امدادی سرگرمیوں اور کوششوں میں مصروف تھا۔ میں ان عام مرد و خواتین کی جانوں کے ضیاع پر صدمہ سے نڈھال تھا جنہوں نے ہمارے ہوٹل پر اعتماد کیا تھا اور جو یہاں قیام کی خاطر یا کھانے کے لیے آئے تھے۔ جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے والوں میں ہمارے وہ غریب پاکستانی بھی تھے جو اپنے ملک کے دارالحکومت کے بہترین اور مشہور ہوٹل میں کام کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے۔ اسی لمحے دانت پیستے ہوئے میں نے خود کلامی کی: ''او کم بختو! تم جو کرنا چاہتے تھے، وہ تم نے کر دیا، اب میں وہ کروں گا جو میں چاہوں گا۔ ہم یہ ہوٹل دوبارہ

تعمیر کریں گے اور تین ماہ کے اندر اندر اسے چلا کر دکھائیں گے۔'' مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہوٹل کی تعمیر نو کی یہ ڈیڈ لائن میرے ذہن میں کیسے آئی کیوں کہ اس وقت تک مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کس حد تک نقصان ہوا ہے۔ یہ ایک اضطرابی اور بے ساختہ وعدہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا یہ وعدہ ان تمام لوگوں کی امانت ہے جنہوں نے اس سیاہ دن اپنی جانیں قربان کیں اور مصائب ومشکلات برداشت کیں۔ اسی دوران، میری بیٹی سارہ اور اپنے ساتھیوں سے محروم ہونے والا حفاظتی عملہ نہایت ہی تندہی سے امدادی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ بلاشبہ ہسپتالوں سے طبی امداد اور پولیس بھی پہنچ چکی تھی۔ اب میں مسلسل خود سے پوچھ رہا تھا،'' مجھے کیوں نشانہ بنایا گیا؟'' کیا ان تمام حملوں کا انداز ایک ہی ہے؟ میریٹ کے جائے مقام اور بین الاقوامی مہمانوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، یہ قوی امکان تھا کہ یہ کسی پاگل اور جنونی انتہا پسند گروہ کی طرف سے شدید دہشت گردانہ حملہ تھا۔

اس وقت میرے خیالات کی رو دوسری طرف چل پڑی جب دو پاکستانی صحافی میرے پاس آئے۔ ان میں سے پہلے شخص نے استفسار کیا،'' ہاشوانی صاحب، مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ صدر زرداری اس حملے کا ہدف تھے، آپ اس ضمن میں کیا کہیں گے؟'' میں نے جواب دیا،'' لیکن ان کے یہاں آنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا اور ایسی کوئی تقریب بھی منعقد نہیں ہو رہی تھی، مجھے نہیں معلوم کہ صدر زرداری کی یہاں آمد متوقع تھی، میرا خیال ہے کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' صحافی کے چہرے سے پریشانی واضح تھی۔ اب اس کے دوست نے سلسلہ گفتگو کا آغاز کیا،'' کیا آپ کو یقین ہے؟'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا،'' بلاشبہ، میرے دوست، اب کیا میں آپ سے معذرت طلب کر سکتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں اپنے ایک ساتھی کے پاس جا پہنچا جو ایک زخمی شخص کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس بات کو صحافیوں کی بے بنیاد افواہ قرار دے کر بھلا دیتا اگر اس کے فوراً بعد مجھے ایک سینئر سرکاری افسر کی فون کال موصول نہ ہوتی۔ کوئی تمہید باندھے، صورت حال کی بابت دریافت کرنے یا ہونے والے جانی اور مالی نقصان پر اظہار افسوس کرنے کے بجائے اس نے دوٹوک انداز میں اپنا پیغام مجھ تک پہنچا دیا۔'' آپ کو میڈیا کو یہ بتانا ہوگا کہ صدر

زرداری اس دھماکہ کا متوقع نشانہ تھے''۔ میں نے جواب دیا ''لیکن یہ کس طرح ہوسکتا ہے۔ان کا یہاں آنے کا پروگرام نہ تھا، میں جھوٹ کیوں بولوں۔ میں ان یا کسی اور کے لیے جھوٹ نہیں بول سکتا۔''

اُدھر زرداری اور اس کی عملے نے بین الاقوامی میڈیا کو یہی بتانا شروع کیا کہ اس نے کچھ ارکان پارلیمان کے ساتھ میریٹ میں کھانا کھانے جانا تھا اور دھماکہ کا ہدف اس کی ہلاکت تھی۔اس کے دعوے کے مطابق کھانا منسوخ کر دیا گیا تھا۔ جب صحافیوں نے میری طرف رخ کیا تو میں نے دوبارہ تردید کی۔ کسی بھی قسم کے کھانے کا کوئی پروگرام طے نہیں تھا اور نہ ہی کھانے کے کسی پروگرام کو منسوخ کیا گیا تھا۔ میں نے ریکارڈ چیک کیا ہوا تھا اور جی ایم کے ساتھ مل کر دوبارہ جانچ پڑتال کی۔ زرداری کیا کر رہا تھا؟ ہمیشہ کی طرح وہ اس طرح تشہیر کے ذریعے خود کو نڈر اور دہشت گردی کے نشانے کے طور پیش کر رہا تھا۔ زرداری خود کو ایک ایسے شخص کے مانند پیش کر رہا تھا جو اپنی بیوی سے محروم ہوگیا اور خود اس وقت خطرے میں ہے۔ یہ وہ بھرپور کہانی تھی جو اس نے اپنے امریکہ کے دورے سے فوراً پہلے پھیلا دی تھی۔ جب وہ چند دن بعد واشنگٹن ڈی سی پہنچا تو اس نے سی این این کو اپنے انٹرویو میں بتایا کہ اسے بمباری کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ زرداری نے غلط بیانی کرتے ہوئے اپنے آپ کو دہشت گرد گروہ کی طرف سے انتہائی اعلیٰ سطحی ہدف اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں صف اوّل کا سپاہی قرار دینے کی کوشش کی۔ انٹرویو کے فوراً بعد، سی این این نے میری گفتگو کا ایک تصویری تراشہ پیش کیا جس میں یہ تصدیق کی جارہی تھی کہ اس حملے کا ہدف صدر نہیں تھے اور اس شام کسی بھی قسم کے کھانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا جس میں صدر نے شرکت کرنی ہو۔ میرے جرأتمندانہ موقف کے باعث زرداری کی اس من گھڑت کہانی کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ لیکن حقائق زرداری کو روکنے میں کب کامیاب ہوئے ہیں؟

اس دن کے بعد سے میں ہر روز میریٹ چلا جاتا، تباہ شدہ سامان کو ہٹاتے اور تعمیر نو کی نگرانی کرتا۔ مجھے یہ ہوٹل 90 دن میں دوبارہ تعمیر کرنا تھا۔ ان لوگوں کی یادیں میری امانت تھیں جو 20 ستمبر 2008ء کو شہید ہوگئے تھے۔ میں نے بے شمار افراد کی تکفین میں شرکت

کی اور جہاں تک ممکن ہو سکا شہداء کے لواحقین کے گھر گیا اور ان سے ملاقات کی۔ جن لوگوں نے ہمارے ساتھ خوشگوار وقت گزارا تھا، ان کے خاندانوں اور دوستوں سے ملاقات کا عمل انتہائی تکلیف دہ تھا لیکن اب تو وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکے تھے۔ ان چھوٹے چھوٹے بچوں سے ملاقات انتہائی تکلیف کا باعث تھی جو یتیم ہو چکے تھے۔ آپ ایک چھوٹے بچے کو کیا تسلی دے سکتے ہیں جس نے صبح اپنے پیارے باپ کو اس قوی امید پر الوداع کہا تھا کہ شام کو دوبارہ ملاقات ہو گی؟ آپ اس بچے کو کس طرح تشفی دے سکتے ہیں؟ آپ اس بچی سے کیا کہہ سکتے ہیں جس کا باپ اب اس دنیا میں نہ رہا ہو؟ کون سی وضاحت انہیں مطمئن کرنے کے لیے کافی ہو گی؟ میں نے خود کو کام میں مصروف کر لیا اور اپنے جذبات کو میریٹ ہوٹل کی دوبارہ تعمیر کے مشن میں ڈھال دیا۔ یہ میرا مستقل ساتھی بن گیا۔ وہ بھی دن تھے جب میں جائے تعمیر پر اٹھارہ سے بیس گھنٹے صرف کیا کرتا اور جب گھر آتا تو اس قدر تھکا ہوتا کہ سونے کے علاوہ کچھ نہ کر سکتا۔ میں نے اپنے ایک دوست کو بتایا، ''صرف یہی ایک ایسا طریقہ ہے جو مجھے پاگل ہونے سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔''

اسی دوران میں جاری تفتیش کا محتاط انداز میں جائزہ لیتا رہا۔ میں ان کے لیے انصاف کا خواہاں تھا جو ہوٹل میں انتقال کر گئے۔ میری خواہش تھی کہ مجرموں اور سرغنوں کو سزا دی جائے تاہم کئی کڑیاں ابھی تک ملتی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ پہلے تو یہ کہ ٹرک کے دھماکوں اور چوتھی اور پانچویں منزلوں پر کیمیائی آگ کے درمیان کوئی مطابقت نہ تھی۔ پھر یہ بھی ایک راز تھا کہ ٹرک کو ہائی سکیورٹی زون سے گزرنے کی اجازت کس نے دی اور اس ٹرک کو کیوں نہیں روکا گیا۔ یہ ایک ایسی جگہ کے قریب پہنچا جہاں وزیر اعظم 400 افراد کے اعزاز میں افطار ڈنر دے رہے تھے۔ صدر، کابینہ کے کئی ایک ارکان، بیوروکریسی اور فوج کے سینئر افسران اور سرکردہ سفارت کار اس افطار میں موجود تھے۔ یہ افطار پارٹی وزیر اعظم ہاؤس میں منعقد ہو رہی تھی جو میریٹ سے بمشکل ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ناقابل یقین طور پر دھماکہ خیز مواد سے بھرا ہوا یہ ٹرک وزیر اعظم ہاؤس کے پاس سے گزر گیا؟ اور اس کار کا کیا قصہ تھا جس نے ٹرک کی میریٹ کی طرف رہنمائی کی تھی؟ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ کار ڈرائیور کو راستہ دکھا

رہی تھی جو واضح قیاسی طور پر مقامی باشندہ نہیں تھا اور اندرون اسلام آباد کے جغرافیے سے ناواقف تھا۔ جب کار، دھماکہ خیز مواد سے بھرے ٹرک کو میریٹ ہوٹل کے داخلی راستے کی نشاندہی کے بعد دوسری سمت مڑ گئی تو کلوز سرکٹ کیمروں نے کار کے رجسٹریشن نمبر کو محفوظ کرلیا تھا۔ ان تصاویر کے باوجود کار کا کبھی سراغ نہیں ملا۔ بہرحال حملے کے بعد حکومت کی طرف سے صرف یہی پراپیگنڈا کیا جارہا تھا کہ اس حملہ کا ہدف صدرِ مملکت تھے۔

اب مجھ پر اور سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ کے زیادہ تر حکام پر واضح ہو چکا تھا کہ میریٹ ہوٹل پر بمباری کے واقعہ کا زرداری کو ہدف بنانے سے دور کا تعلق نہ تھا۔ یہ وہ کہانی تھی جو اس نے مغربی میڈیا کے لیے گھڑی۔ اس لیے اب سوال یہ تھا کہ اس حملے کا ہدف کون تھا؟ کیا یہ حملہ اسلام آباد کی اس جائے وقوع پر تھا جہاں کسی بھی مخصوص وقت، سیاستدان، سرکاری افسران، سرکردہ کاروباری افراد اور غیرملکی معززین قیام کرتے یا کھانا کھانے آتے تھے؟ یا پھر محض یہ اتفاق تھا کہ یہ ہوٹل ہاشو گروپ کی ملکیت تھا؟ اس سب کے برعکس کیا میری ذات ہدف تھی؟ اس آگ کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے جو یونائٹڈ بینک ٹاور میں میرے دفتر اور اسلام آباد میں میرے گھر پر لگی......اور......اُن دھمکیوں کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے جو مجھے ملتی رہیں؟ اب جبکہ میریٹ ازسرنو تعمیر کے مرحلے میں تھا، اس دوران مجھے کم ازکم تین دفعہ قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ دو مواقع تو ایسے تھے جب اسلحے سے لیس اجنبی افراد کا ایک گروہ وہاں داخل ہو گیا جہاں تعمیرنو کا کام جاری تھا۔ دونوں مواقع پر مجھے پولیس کے افسران نے پیشگی مطلع کر دیا اور یوں میں الحمدللہ بچ گیا۔ ان واقعات نے میری نیند اڑا دی اور میں اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہتا۔ کیا کوئی مجھے پیغام بھیج رہا تھا؟ میں نے انٹیلی جینس میں اپنے ایک دوست سے بات کی۔ اس نے میری بات سنی اور کچھ دیر بعد مجھے جواب دینے کا وعدہ کیا۔ چند دن بعد وہ مجھ سے ملاقات کرنے کے آیا اور کہا، ''ہاشوانی صاحب! آپ کے علاوہ کوئی اور ہدف نہیں، یہ طالبان یا کوئی دیگر افراد نہیں بلکہ میرے خیال کے مطابق یہ سیاسی سازش ہے، میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا محتاط رہیں! بس میں نے یہی کہنا تھا۔''

اس کے رخصت ہونے کے بعد میں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ تفصیلاً غور کرنا

شروع کیا کہ اُس افسر نے کیا کہا تھا۔ اس کی باتوں سے میرے اس خدشے کی تصدیق ہوگئی کہ بات محض میریٹ پر حملے یا میری ذات یا مجھ سے منسلک اداروں پر حملوں تک محدود نہیں تھی بلکہ ''دہشت گردی کے خلاف'' نام نہاد جنگ ہو یا طالبان اور دیگر اسلام پسند گروہوں کی کارروائیاں، یہ سب جرائم کے منظم ارتکاب اور سیاسی انتقام کی چھتری میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اس چھتری کی آڑ میں مخالفین کو یا تو مٹایا جا رہا یا انہیں دھمکایا جا رہا تھا بلکہ شاید انہیں بھاگنے اور سستے نرخوں پر اپنے اثاثے فروخت کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ کیا میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا؟ اپنے اوپر بڑھتے ہوئے حملوں کی میں کیا توجیہ پیش کروں؟ بہت برسوں بعد طالبان، القاعدہ اور ان سے منسلک گروہ صدر الدین ہاشوانی سے نجات پانے کے لیے کیوں اچانک متحرک ہو گئے تھے؟ اس کے پیچھے کون سے عوامل اور اہداف پوشیدہ تھے؟ یا پھر یہ محض ایک من گھڑت کہانی تھی جو پھیلائی جا رہی تھی؟ جس دن میریٹ پر حملہ کیا گیا، مجھے اس وقت کے وزیر داخلہ اور زرداری کے حواری رحمان ملک کا فون موصول ہوا۔ اس نے مجھ سے ہمدردی ظاہر کی اور اپنے گھر آنے کو کہا۔ جب میں اس کے گھر پہنچا تو اس نے کمال مہربانی سے مجھے رات کا کھانا کھانے کی پیشکش کی۔ اس وقت رات کے ایک بجے تھے۔ دہشت گردانہ حملے کو پانچ گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں بہت ناتوانی محسوس کر رہا تھا اور ناقابل یقین حد تک تھکا ہوا تھا۔ میں نے کہا، ''مجھے کھانے کی طلب نہیں لیکن چائے کی ایک پیالی کافی ہوگی۔'' چائے آنے پر میں نے رحمان ملک کو مخاطب کرتے ہوئے بلند آواز سے پوچھا، ''یہ کس کا کیا دھرا ہے؟'' اس نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''ظاہر ہے کہ بیت اللہ محسود کے سوا کون ہو سکتا ہے۔'' میں بہت حیران ہوا۔ بیت اللہ محسود کا تعلق وزیرستان سے تھا اور وہ ایک انتہا پسند لیڈر تھا جو ''پاکستانی طالبان'' کے کمانڈر کی حیثیت سے سامنے آیا تھا۔ اس وزیر کو کس طرح اتنی جلدی محض پانچ گھنٹوں میں معلوم ہو گیا کہ بیت اللہ محسود میرے ہوٹل کی تباہی کا ذمہ دار ہے؟ میں حیران تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ میری نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ میرا ذہن چلنے لگا اور میں نے سوچا، کیا میں یہ اشارے نظر انداز کر سکتا ہوں؟ کیا میں یہ نظر انداز کر سکتا تھا کہ زرداری کے صدر بننے کے بعد مجھے ملنے والی دھمکیوں

میں اضافہ ہوگیا تھا؟ کیا میں اغوا کی اُن دھمکیوں کونظرانداز کرسکتا تھا جو میرے بیٹے مرتضیٰ کو
میریٹ پر حملے سے پہلے موصول ہوئی تھیں۔ کیا یہ سب کچھ بشیر قریشی اور 1990ء کی دہائی کے
واقعات کا تسلسل تھا (باب 10 ملاحظہ فرمایئے) اور اب ان واقعات کو بڑے پیمانے پر
دہرایا جارہا تھا؟ کیا پاکستان...... میرا پیارا پاکستان..... میرے لیے اس قدر خطرناک بن چکا
تھا؟ 1990ء میں مجھے تین ماہ کے لیے دوبارہ لندن جانا پڑا۔ کیا اب پھر بیرون ملک چلے جانا
چاہیے؟ مجھے یہ ادراک ہو چکا تھا کہ محض میں نہیں بلکہ میرا تمام گھرانہ بال بال بچا تھا۔
20 ستمبر 2008ء کو جب ٹرک ہوٹل کے سامنے رکاوٹ سے ٹکرایا، میرا بیٹا مرتضیٰ ہوٹل کی
طرف آرہا تھا۔ دھماکے کی آواز سن کروہ پریشان ہوگیا کیوں کہ اس نے یہی سمجھا تھا کہ
میں پہلے ہی سے ہوٹل میں موجود ہوں۔ جب اس نے تیزی سے آگے بڑھنا شروع کیا،
پولیس کے ایک افسر نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا اور بتایا کہ آگے ایک ٹرک کا حادثہ
ہوا ہے۔ مرتضیٰ نے دوبارہ کوشش کی لیکن پولیس نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے اپنی کار
میریٹ کے ساتھ والے موڑ سے موڑنی پڑی۔ مرتضیٰ ابھی تک میرے متعلق لاعلم تھا کہ میں
کہاں ہوں کیوں کہ میں اس کے موبائل فون کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ پھر اسی وقت، خودکش
بمبار نے RDX دھماکہ کردیا۔ اپنی کار میں سے مرتضیٰ نے یہ خوفناک منظر دیکھا۔ پولیس کے
جس سپاہی نے اسے یہاں آنے سے منع کیا، دھماکے کی زد میں آکر مرگیا۔ اس کے اس فعل
نے مرتضیٰ کی جان بچالی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مرتضیٰ اور ہمیں بچالیا لیکن دشمن نے ہمیں خبردار
کردیا تھا۔

اسی دوران میریٹ کی تعمیر نہایت تیزی سے جاری تھی۔ میں 90 دن کے مقررہ
وقت میں کام مکمل کرنے اور 20 دسمبر 2008ء کو ہوٹل کی سرگرمیاں دوبارہ شروع کرنے کے لیے
پُرعزم تھا۔ میرے ذہن میں بہت سے سوالات کلبلا رہے تھے۔ کیا مجھے چند دنوں کے لیے
بیرون ملک چلے جانا چاہیے؟ کیا اس قسم کے حملے کے بعد بیرون ملک چلے جانا فرار ہونے کے
مترادف ہوگا؟ اگر میں نے ایسے کیا تو پاکستان میں میرے کاروباری ساتھیوں اور حلیفوں
کو کیا پیغام جائے گا؟ مغرب کی طرف فرار اس صورت حال کے تدارک کا کوئی طریقہ

نہیں تھا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ انہی ممالک میں پناہ لی جائے جنہوں نے پاکستان اور اس کی سرزمین کو تباہی سے ہمکنار کیا۔ میں نے معاملات کے ٹھنڈا ہو جانے اور اپنی زندگی کو لاحق خطرات معدوم ہو جانے تک دبئی جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ اسلام آباد کی نسبت کراچی سے بہت قریب تھا کہ میں واپس پاکستان آتا جاتا رہوں۔ مجھے امید تھی کہ میں وہاں محض چند ماہ ہی قیام کروں گا کیوں کہ دبئی ایک خوش آمدید کہنے والا اور زندگی سے بھرپور شہر تھا۔ دبئی میں اپنی موجودگی کے باعث میں نہ صرف محض تھوڑے فاصلے سے پاکستان میں اپنے تمام امور کا انتظام اور نگرانی کر سکتا تھا بلکہ نہایت آسانی کے ساتھ ایشیا اور افریقہ کے دیگر حصوں میں کاروبار بھی کر سکتا تھا جو دبئی سے باسہولت انداز میں فضائی طور پر منسلک تھے۔ میں نے اپنے گھرانے اور کچھ قابل اعتماد ساتھیوں کو اپنے منصوبوں سے آگاہ کر دیا۔ ہمارا پروگرام 20 دسمبر کو ہوٹل دوبارہ کھلنے کے بعد دبئی جانے کا تھا۔

بدقسمتی سے ہم 90 دن کے مقررہ وقت تک کام پورا نہ کر سکے جس کا میں نے خود اور دنیا سے وعدہ کیا تھا۔ ہمیں آٹھ دنوں کی تاخیر ہوگئی تھی۔ حملے کے 98 دنوں بعد 28 دسمبر 2008ء کو میریٹ نے اپنے دروازے مہمانوں کے لیے کھول دیے۔ افتتاحی تقریب میں امریکہ اور سعودی عرب کے سفیروں سمیت اسلام آباد کے سرکردہ رہائشیوں نے شرکت کی۔ سکیورٹی اداروں کے مشورے کے باوجود میں اسی شام پرل کانٹی نینٹل کے جی ایم کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے بذریعہ کار لاہور روانہ ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد میں دبئی پرواز کر گیا۔ بینظیر کے قتل کو ایک سال اور ایک دن گزر چکا تھا۔ یہ اُس سال کا کیسا ڈراؤنا خواب تھا! جب جہاز میں سے میری نظر لاہور کی جھلملاتی روشنیوں پر پڑی، میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے جلد آنے کا ارادہ کر لیا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ پانچ برس تک میں اپنے پیارے وطن کو نہیں دیکھ سکوں گا؟

میں نے اپنے کاروبار کا انتظام و انصرام دبئی سے شروع کر دیا، بصورت دیگر اپنے ملک کو لڑکھڑاتے ہوئے دیکھنے کا تصور ہی نہایت دل شکن تھا۔ زرداری کے عہد حکومت میں جرم اور بدعنوانی کو باقاعدہ منظم صنعت کا درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ ابتدائی دنوں میں فوج نے

مداخلت کردی ہوتی تو معاملات قدرے درست ہوگئے ہوتے۔ 2008ء کے بعد کے دنوں میں فوج کو ''زیرِسایۂ دیوار بیٹھنا پڑا'' کیوں کہ امریکہ کو دہشت گردی کے خلاف لڑنے کے لیے پاکستان میں ایک ''جمہوری لیڈر'' کی ضرورت تھی۔ زرداری اور اس کے حواریوں نے وہ سب کچھ کیا جس کے لیے مشرف کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا رہا۔ پاکستان خاص طور پر بلوچستان اور سندھ کے علاقوں میں وسیع پیمانے پر لاقانونیت کا دور دورہ تھا۔ تاوان کے لیے غارت گری اور اغوا ایسے جرائم عروج پر تھے۔ سپریم کورٹ کے فیصلوں کی خلاف ورزی اور سرکاری خزانے پر شب خون جاری رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے سرکاری خزانہ ہتھیانے کی لوٹ سیل لگی ہوئی ہے۔ بہت سوں نے اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے اور سرمایہ بیرون ملک منتقل کرلیا۔ پیپلز پارٹی کے عہدیداروں اور وزراء نے بھی اپنا سرمایہ بیرون منتقل کر کے کوئی کسر نہ چھوڑی۔

میں نے دبئی میں قیام کے دوران 2010ء میں ایک سابق امریکی سفارت کار سے ملاقات کی جو اس وقت واشنگٹن ڈی سی میں ایک تھنک ٹینک کے لیے کام کر رہا تھا۔ وہ پاکستان سے واپس اپنے وطن جا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا، ''مسٹر ہاشوانی، کیا وجہ ہے کہ پاکستان کے اکثر لوگ جنھیں میں جانتا ہوں، بیرون ملک، دبئی یا لندن یا سنگاپور میں سرمایہ کاری کر رہے یا بینک کھاتے کھول رہے ہیں؟ وہ اپنے بچوں کو بیرون ملک کیوں بھیج رہے ہیں؟'' میں نے بغیر آنکھ جھپکے کہا، ''براہ کرم ہمارے صدر سے پوچھو، تم نے ہمارے ملک کو بچانے کے لیے اسے مامور کیا ہے، تم اس سے نہیں پوچھتے کہ کیا وہ اس مقصد میں کامیاب رہا ہے؟'' میرے ملاقاتی کے ہونٹوں پر زہر آلود مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ہر ہفتے، ہر دن، پاکستان سے پریشان کن خبریں آتیں۔ میں نے جنوری 2011ء میں سلمان تاثیر کے قتل کی دلخراش خبر سنی جو میرا ایک پرانا دوست اور پنجاب کا گورنر تھا۔ اسے اس کے محافظ نے گولی مارکر ہلاک کر دیا تھا۔ اسے ایک ایسے شخص نے گولی مار کر ہلاک کر دیا جسے اس کی حفاظت کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ میں انتہائی پریشان اور افسردہ ہوگیا کیوں کہ سلمان تاثیر دہائیوں سے میرا واقف تھا۔ وہ زندہ دل اور زندگی سے بھرپور شخص تھا اور اس کا تعلق اُس گھرانے سے تھا

جسے ہم بخوبی جانتے تھے۔ 1960ء کی دہائی کے اواخر اور 1970ء کی دہائی کے اوائل میں، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی تعلیم حاصل کرنے اور وطن واپس آنے کے بعد سلمان تاثیر نے ہماری بعض کمپنیوں کے لیے بھی خدمات انجام دیں۔ وہ ایک حاضر دماغ اور دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی یہ جاذب نظر شخصیت اس کی زندگی سے کہیں ماورا تھی۔ اسلام آباد میں میری اکثر اس سے ملاقات ہوتی۔ اور مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ ہم دونوں کے مزاج میں بہت فرق تھا۔ وہ شراب اور زندگی کی دیگر رنگینیوں کا رسیا تھا اور یہ میری دلچسپیوں میں شامل نہیں تھا لیکن کسی کی ذاتی زندگی سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ جب آپ کے پاس کوئی سیاسی عہدہ ہو جیسا کہ سلمان تاثیر کے پاس تھا، تو یہ مشکل ہوتی ہے کہ بدقسمتی سے پاکستان میں ذاتی اور عوامی زندگی کو آسانی سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ قتل سے چند دن پہلے سلمان تاثیر دبئی میں تھا اور وہ میرے دفتر امارت ٹاورز میں دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے آیا۔ میں نے Peking Duck لانے کے لیے کہا کیوں کہ مجھے علم تھا کہ اسے یہ کھانا پسند ہے۔ ہم بیٹھ گئے اور پرانے دوستوں کی مانند گپ شپ لگانے لگے۔ وہ میرے ساتھ ہلکی پھلکی گفتگو کر رہا تھا، پھر اس نے اپنے موبائل فون میں سے اپنی خاتون دوستوں کی طرف سے آئے ہوئے پیغامات بھی دکھائے۔ واضح طور پر وہ فکر و فاقہ سے آزاد ایک فرد کی نجی زندگی بسر کر رہا تھا حالانکہ وہ پنجاب کا گورنر تھا۔ اس صورت حال نے مجھے قدرے متفکر کر دیا۔

میں نے پوچھا، ''سلمان، مجھے بتاؤ، جب تم اپنی خاتون دوستوں سے ملنے جاتے ہو تو کیا تم اپنے محافظ اپنے ساتھ لے کر جاتے ہو۔'' اس نے کہا، ''ہاں! بالکل''...... ''اور وہ تمہیں آتے جاتے دیکھتے ہیں؟'' اس نے سر ہلاتے ہوئے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی، ''تم ان پر بھروسا کیسے کرتے ہو، وہ مکمل طور پر غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں، ان کی پرورش ایک مختلف پاکستان...... ضیاالحق کے پاکستان میں ہوئی...... وہ مذہبی انتہا پسند ہو سکتے ہیں۔'' اس نے اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا، ''اوہ، چھوڑو صدرو! مجھے قطعاً پروا نہیں۔'' ایک ہفتہ بعد ہی سلمان تاثیر اس دنیا میں نہیں تھا۔ وہ اس وقت اسلام آباد کے ایک ریسٹورنٹ سے باہر آ رہا تھا جب اس کے ایک محافظ نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اشتعال

انگیز صورت حال یہ تھی کہ اس نے ایک مسیحی خاتون کے حق میں بیان دیا تھا جسے توہین رسالت کے قوانین کے تحت سزائے موت دی گئی تھی۔ سلمان تاثیر بے دھڑک اور بیا نگ دہل بات کرنے والا شخص تھا۔ یہ بے دھڑک مزاج ان کے دوستوں اور اسی قسم کے پس منظر کے حامل لوگوں کے لیے تو درست تھا لیکن اُس کا محافظ دوستوں کی فہرست میں شامل نہیں تھا۔ اسلام آباد کے ایک جدید اور دلکش مرکز خریداری میں محافظ نے 26 گولیاں سلمان تاثیر کے بدن میں اتار دیں......اس رات میں اچھی طرح نہ سو سکا۔ کیا پاکستان اس حد تک جا سکتا ہے؟ میں اپنے کتنے دوست کھو دوں گا؟ جب میں پاکستان جاؤں گا تو کس قدر دوست میرے اردگرد ہوں گے؟ کیا میں کبھی پاکستان واپس جا سکوں گا؟ میں خود کو یقین دلاتا: ''ہاں! ایک دن میں واپس پاکستان جاؤں گا.....''

باب 12

نئے افق، پرانے خواب!

جب میں کم سن تھا تو میرے پسندیدہ چچا نے کہا، ''صدرو، تمہارے اندر ایک جنگجو چھپا بیٹھا ہے۔'' یہ میری ضد بلکہ مستقل مزاجی کے حوالے سے ایک طنز آمیز اور شوخ فقرہ تھا۔ جب میں پیچھے مڑ کر اپنے بچپن پر نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے اپنے قابل احترام والدین کے لیے قابل تحسین جذبات کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں ایک ایسا انوکھا بچہ تھا جس کی پرورش کرنا بہت مشکل تھا کیوں کہ میں ہر کام اپنے انداز میں کرنے پر اصرار کرتا اور وہ انتہائی صبر وتحمل کا مظاہرہ کرتے۔ میری ذات میں موجود خودمختاری اور آزادی کا وہ احساس جس سے برسوں پہلے میرے چچا محظوظ ہوئے تھے، تمام زندگی میری ذات کا حصہ رہا۔ اس روش نے مجھے فائدہ پہنچایا یا نقصان؟ ایہ فیصلہ میں اُن پر چھوڑتا ہوں جو میرے ساتھ رہے اور جنہوں نے اس کتاب کے سابقہ ابواب کا مطالعہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مستقل مزاجی اور ضدی پن کے بغیر میں وہ نہ ہوتا جو میں ہوں۔ میں نے اپنی ذاتی اور پیشہ ورانہ زندگی ایک جنگجو کی حیثیت سے بسر کی۔ جس اقدام اور عمل کو میں نے ناانصافی سمجھا، اس کے خلاف دلیری سے جنگ کی۔ میں نے گھٹیا بیوروکریٹس اور خبطی صدور کا بمقابلہ کیا۔ فرینک سناترا کے گانے سے الفاظ مستعار لوں تو ''میں نے ہمیشہ اپنی مرضی کے مطابق کام کیا۔'' میرا ایک پرانا دوست جو مجھے ایک عرصے سے جانتا تھا...... مجھے اس وقت ملا، جب میں حکومت پاکستان کے خلاف بے شمار

لڑائیوں میں مصروف تھا۔ ہم ایک گروپ کی صورت ان لوگوں کے ساتھ بیٹھے تھے جو انتہائی فہم وفراست کے مالک تھے اور میرے لیے نیک خواہشات رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے اشارتاً اور کنایتاً سمجھایا کہ میں حکام کے ساتھ سمجھوتا کرلوں۔ ان میں سے ایک نے کہا، ''تم جانتے ہو کہ وقت کا تقاضا یہی ہے، جاؤ اور وزیراعظم سے ملاقات کرو، معاملات درست ہو جائیں گے۔'' میں نے انکار کرتے ہوئے کہا، ''ہرگز نہیں!'' میرے دوست ہماری اس گفتگو کا خاموشی سے مشاہدہ کررہے تھے۔ بالآخر میرے پرانے دوست نے مسکراتے ہوئے کہا: ''جب صدرو کو کوئی فیصلہ کرنا پڑے تو وہ ہمیشہ مشکل فیصلے کا انتخاب کرتا ہے۔'' یہ سنتے ہی سب دوستوں نے قہقہے لگائے اور میرے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ سچ یہی ہے کہ میرے دوست نے جو کچھ کہا، حرف بہ حرف درست تھا۔ محض ہلکی پھلکی مزاحمت میری سرشت میں نہیں بلکہ مزاحمت کا ایک طویل اور لمبا راستہ ہی میری جبلت میں شامل ہے۔

بتانے کا مقصد یہ نہیں کہ میری زندگی محض میدان جنگ کی مانند گزری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس زندگی نے مجھے بہت کچھ دیا۔ میں اس ذات باری کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں جس نے مجھے میری خواہشات سے کہیں زیادہ اپنے فضل وکرم سے عطا کیا۔ یہاں میں محض مادی کامیابیوں کا ذکر نہیں کررہا کیوں کہ یہ تو عارضی نوعیت کی ہوتی ہیں اور جب آپ اس دنیا کو الوداع کہتے ہیں تو سب کچھ اس دنیا ہی رہ جاتا ہے اور آپ کے ہاتھ خالی ہوتے ہیں۔ میں تو ان بھرپور تجربات اور اپنے ساتھ کام کرنے والے لوگوں، ساتھیوں، دوستوں، پیارے بچوں اور اب پوتوں کی محبت کا ذکر کررہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر ممکن طریقے سے اپنے خوابوں، خواہشوں اور آرزوؤں کی تکمیل کی توفیق بخشی۔ میں ایک چھوٹا بچہ تھا جب میرے والد مجھے کراچی کی بندرگاہ کی طرف لے جاتے۔ وہاں ہم تمام شام گزارتے، میرے والد مجھے کچھ فاصلے پر موجود بڑے بڑے بحری جہازوں اور روشنیوں کی طرف متوجہ کرتے۔ جیسا کہ میں پہلے تحریر کرچکا ہوں کہ میرے والد کو بحری جہازوں سے عشق تھا۔ انہوں نے اس عشق کو غیر محسوس انداز میں میرے اندر بھی منتقل کیا۔ ہم باپ بیٹا وہاں کھڑے ہوتے، پھٹی پھٹی آنکھوں سے بحری جہازوں کی طرف ٹکٹکی باندھ لیتے اور حیران ہوتے کہ یہ کہاں سے

آئے اور کہاں جارہے ہیں، ہم ان خیالوں میں گم دنیا کو بھی فراموش کردیتے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اندازہ کیجئے! جب میں بڑا ہوا، وہی بندرگاہ اور وہی بحری جہاز میری زندگی کا مرکز بن گئے۔ میں نے وسیع وعریض سمندروں میں تیرتے جہازوں میں اپنی زندگی کے بے شمار بامقصد ایام، ہفتے اور مہینے صرف کیے۔ میرا خواب پورا ہو چکا تھا۔

میں ہمیشہ سے ہی پاکستان پر نازاں ایک محبِّ وطن پاکستانی رہا ہوں۔ میں آزادی کے ابتدائی دنوں یعنی 50ء کی دہائی میں بڑا ہوا۔ جب ہمارے بانیوں کی مثالیں ہمارے سامنے تھیں۔ اس وقت ہم کہیں زیادہ معصوم تھے۔ ہمارے معاشرے میں اجتماعیت تھی۔ ہم پاکستانی ایک دوسرے کے لیے گلاب کی خوشبو کی مانند تھے۔ بعد کی دہائیوں میں نمودار ہونے والی نفرتوں، فرقہ واریت اور علاقائی عصبیت کا اُن دنوں نام ونشاں نہ تھا۔ اگر ایسا کچھ تھا بھی تو خال خال۔ ایک بچے کی حیثیت سے میں پاکستان کے مختلف پہلوؤں اور علاقوں کے متعلق جس قدر پڑھ سکتا تھا، وہ میں نے پڑھا اور اسے اپنایا۔ اگرچہ میں کراچی میں رہا اور مجھے دیہی سندھ کو دیکھنے کا کم موقع ملا۔ یہ وہ صوبہ تھا جس کا دارالحکومت کراچی ہے۔ میری شدید خواہش تھی کہ میں باقی پاکستان بھی دیکھوں۔ میرا شوق تھا کہ جغرافیہ کی میری کتاب یا میرے ملک کے نقشے پر جن علاقوں کے نام تھے، میں انہیں جیتی جاگتی حالت میں دیکھوں۔ اس خواہش کی تکمیل کے حوالے سے بھی قسمت نے میرا ساتھ دیا۔ میں نے پاکستان کا بھرپور دورہ کیا اور اس ہر اہم علاقے کو اس طرح قریب سے دیکھا کہ شاید چند ہی لوگوں نے دیکھا ہو۔ میں خوش قسمت تھا کہ میں نے پاکستان کے کونے کونے اور گوشے گوشے کو دیکھا۔ میں بلوچستان کے دورافتادہ علاقوں میں واقع مچھلی کے شکار کے لیے مخصوص پسماندہ گاؤں میں بھی پہنچا اور میں نے اسلام آباد جیسے حساس اور طاقت ور شہر کے اجتماعات میں بھی شرکت کی ہے۔ میں 80ء کی دہائی میں ضیا دور میں دو دفعہ اور 90ء کے وسط میں نواز شریف کی دوسری مدتِ اقتدار میں جھوٹے الزمات سے بچنے کے لیے روپوش ہوگیا۔ اس دوران میں نے پنجاب کے دیہی علاقوں، قبائلی علاقوں اور خیبر پختون خوا کے سرحدی علاقوں کی خاک چھانی۔ میں نے چھوٹے چھوٹے دیہاتوں کے عام لیکن حیرت انگیز طور پر مہمان نواز پاکستانیوں کے درمیان

راتیں بسر کیں۔ اس سفر نے مجھے ایک ایسے معاشرے سے روشناس کرایا جو میں بصورت دیگر نہ دیکھ سکتا۔ ظالمانہ حکومتوں کی طرف سے درپیش خطرات اور مصائب کے باوجود پاکستان کے وسیع اور دور دراز علاقوں کے میرے سفر نے نہ صرف میرے تجسس اور حسِ تحقیق کو تسکین بخشی بلکہ میرے دل میں پاکستان کے لیے مزید محبت اور پیار کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

ہاشو گروپ، اپنے ہوٹلوں کی وجہ سے مشہور ہے لیکن میرے نزدیک یہ ہوٹل میرے لیے ذریعہ معاش نہیں بلکہ میرا شوق تھے جس کی کوئی حد نہیں۔ مجھے ہمیشہ ہوٹلوں سے پیار رہا، ان کا سحر ہمیشہ مجھ پر چھایا رہا۔ ان کی پُرتعیش حیثیت اور شان وشوکت نے بھی ہمیشہ مجھے متاثر کیا۔ اس سے کہیں بڑھ کر وہ جامعیت اور جاذبیت مجھے لبھاتی ہے جو ان ہوٹلوں میں مہمان کی فوری اور موثر خدمت کی سادگی میں پنہاں ہے۔ یہ وہ امور تھے جو میرے پہلے ہوٹل کے قیام اور کام کا آغاز کرنے سے بھی پہلے میرے ذہن میں نقش تھے۔ ایک نوعمر لڑکے کی حیثیت سے، میں ہوٹلوں کی تصاویر دیکھنے کے علاوہ ان کے اندرونی حصوں، ان کے کشادہ باورچی خانوں، مختلف قسم کے کمروں، دیگر سہولتوں وغیرہ کے متعلق مطالعہ کرتا رہتا۔ آج بھی ہوٹل چلانا ہو یا بنانا ہو تو وہ جگہ جہاں کچھ نہیں ہوتا اسے پرل کانٹیننٹل بھوربن کی طرح فن تعمیر کے شاہکار میں بدلتا دیکھ کر میں بچپن کے ایام میں لوٹ جاتا ہوں اور ایک بار پھر خوابوں کی دنیا میں جا پہنچتا ہوں۔

پریشانی اور مصیبت کو موقع میں بدلنے کے لیے قسمت اور ہمت درکار ہوتی ہے۔ پاکستان میں اپنی جان کو درپیش خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے میں 2008ء میں دبئی منتقل ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ میرا یہ قیام چند ماہ کے لیے ہو گا لیکن یہ قیام تقریباً پانچ برس تک طویل ہو گیا۔ میں آج دبئی اور پاکستان کے درمیان اپنا وقت صرف کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں پاکستان میں پوری طرح منتقل نہیں ہوا۔ ایک بین الاقوامی کاروباری مرکز کی حیثیت سے میں دبئی کا معترف ہوں۔ مستقبل قریب میں دبئی میرے اور ہاشو گروپ کے لیے مددگار ثابت ہو سکتا ہے اور میں نئے جغرافیائی اور کاروباری افق دریافت کر سکتا ہوں۔ مستقبل قریب میں پاکستان میں ہوٹلوں کا سلسلہ دراز کرنے کا منصوبہ ہے۔ اس کے علاوہ میں توانائی کے شعبے،

تیل اور گیس کی دریافت اور پیداوار کی طرف توجہ دے رہا ہوں ۔ یہ شعبہ ان تمام کاروباروں سے کہیں زیادہ بین الاقوامی نوعیت کا حامل ہے جن میں ہم پہلے مصروف تھے۔ جب سے ہم نے پاکستان میں اپنے تیل اور گیس کے کاروبار کا آغاز کیا، اس وقت سے آج تک ہم دنیا بھر کے ساتھ کاروبار کر رہے ہیں۔ تیل جسے سیاہ سونا کہتے ہیں..... انڈونیشیا سے عراق، ویت نام سے سوڈان قازقستان سے فلپائن اور شمالی افریقہ سے میکسیکو کی خلیج تک ہمارا یہ کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ بلاشبہ ہماری شدید خواہش ہے کہ ہم پاکستان میں تیل اور گیس کی دریافت کی صنعت قائم کریں۔ ہمارا ملک توانائی کے بہترین وسائل سے مالا مال ہے انہیں عام لوگوں کی بہبود کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ تیل کے کاروبار میں میری دلچسپی کس طرح پیدا ہوئی؟ اس موقع پر میں ایک دفعہ پھر اپنی زندگی کے ابتدائی سالوں کی ایک کہانی سناتا ہوں۔

لڑکپن میں مجھے فلمیں دیکھنے کا شوق تھا۔ میں نے 1956ء میں کراچی کے صدر کے علاقے میں واقع کیپٹل سینما میں فلم The Giant دیکھی جس کے اداکاروں میں راک ہڈسن، الزبتھ ٹیلر اور جیمز ڈین شامل تھے۔ یہ اس کی آخری فلم تھی کیونکہ فلم کی نمائش ہونے سے پہلے ہی وہ کار کے ایک حادثے میں مر گیا تھا۔ The Giant ہالی وڈ کی ایک شاندار فلم تھی اور اسے تمام ادوار کی ایک بہترین فلم تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں ٹیکساس کی ایک برادری کا ذکر جو زراعت اور مویشیوں کی افزائش سے تیل کی دریافت اور دولت کی ریل پیل تک کا سفر طے کرتی ہے۔ اس فلم میں معاشرے میں پیدا ہونے والی ایک سماجی تبدیلی کو بھی دکھایا گیا جس نے نسلی تعصبات کی کوکھ سے جنم لیا۔ اس فلم نے مجھ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ایک منظر جس نے مجھے مکمل طور پر مبہوت کر دیا، اس منظر میں تیل کو زمین سے ابلتے ہوئے دکھایا گیا تھا اور جیمز ڈین اسے ناقابل یقین خوشی سے دیکھ رہا تھا اور وہ مکمل طور پر سحر زدہ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے زمین سے تیل نکلتے ہوئے دیکھا اور یہ تیل جس قوت و توانائی سے زمین سے نکل رہا تھا، متاثر کن تھا۔ اس منظر نے میرے معصوم ذہن میں بیج بو دیے۔ میرا ننھا منا ذہن، حیرانی اور امکانات سے بھر گیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں یہ منظر حقیقی انداز میں دیکھوں۔

میں چاہتا تھا کہ ایک دن میں بھی اس دنیا کا حصہ بن جاؤں ۔

جب میں بڑا ہوا تو کئی ایسے کاروباروں سے منسلک ہو گیا جن کا تیل اور گیس کے کاروبار سے کوئی تعلق نہ تھا۔لیکن پٹرولیم کی صنعت کے ساتھ میری پسندیدگی مدھم نہ پڑی۔ جب بھی میں مغربی ایشیا اور خام تیل کی عرب سرزمینوں کے سفر پر جاتا، میں بطور خاص تیل کی دریافت اور پیداوار کا مشاہدہ کرنے جاتا۔آپ مجھے پٹرولیم کا ایک سیاح کہہ سکتے ہیں۔ جب میں امریکہ گیا تو میری نگاہیں نیویارک یا سان فرانسسکو پر نہیں بلکہ ہوسٹن پر تھیں جو تیل کی صنعت کا مرکز اور ٹیکساس کا ایک حصہ تھا۔ ٹیکساس وہ ریاست تھی جس کے مناظر The Giant میں دکھائے گئے تھے ۔ آہستہ آہستہ میرے خواب، عملی مراحل طے کرنے لگے۔ میں نے 1977ء میں بلوچستان میں بیرائٹ (Barite) کی کان کنی شروع کی ۔ بیرائٹ ایک ایسا معدنی جز ہے جو تیل اور گیس نکالنے کے لیے کھدائی کے عمل کے دوران مائع کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے بیرائٹ کا ہمارا کارخانہ اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہ کرسکا اور اسے بند کرنا پڑا۔ بیرائٹ کم مقدار میں دستیاب ہونے کے باعث کارخانے کی سرگرمیاں غیر مفید ثابت ہوئیں ۔ پھر جلد ہی میں نے پاکستان میں تیل نکالنے کی کمپنیوں کے لیے بیرائٹ اور مڈ کیمیکلز (یا ڈرلنگ فلیوڈ کیمیکلز) درآمد کرنا شروع کیے لیکن یہاں بھی داخلی طلب محدود تھی ۔ اسلام آباد منتقل ہونے کے تقریباً فوری بعد میں نے 1991ء میں زیور پٹرولیم کارپوریشن کی بنیاد رکھی جس کا نام میں نے اپنے پیاری والدہ کے نام پر رکھا تھا اور آئل اینڈ گیس ڈویلپمنٹ اتھارٹی آف پاکستان کے ساتھ ایک مشترکہ منصوبہ شروع کر دیا۔

اس مشترکہ منصوبے میں ہاشو گروپ کا 10 فیصد حصہ تھا اور ہم نے تیل کے کئی ایک کنویں دریافت کرنا شروع کر دیے۔ شمالی پاکستان میں کوہاٹ کے نزدیک چندا کے مقام پر ہم کامیاب ہو گئے اس علاقے سے اب بھی تیل نکالا جاتا ہے۔ 1995ء میں آکسیڈینٹل پٹرولیم کے پاکستانی ذیلی ادارے کو اس کے امریکی مالکان نے فروخت کے لیے پیش کیا۔ اس کے تیل کے کنویں خشک ہو رہے تھے اور اس کی انتظامیہ تیل کی مزید دریافت کے لیے مزید سرمایہ کاری نہیں کرنا چاہتی تھی ۔ میں نے آکسیڈینٹل پٹرولیم پاکستان کو زیور پٹرولیم کے

انتظام کے تحت خرید لیا۔اس کمپنی کے ذریعے ہم نے نئے علاقوں سے تیل دریافت کرنے کی درخواست دی۔ ہم نے تیل کی دریافت اور سندھ کے علاوہ شمالی پاکستان اور (اسلام آباد کے نزدیک پوٹھوہار) کے خشک تیل کے کنویں چالو کرنے کے موجودہ معاہدات کی تجدید بھی کروائی ۔اس کے باعث ہمیں بلوچستان میں تیل کے کنوؤں تک رسائی حاصل ہوگئی ۔ جب میں نے آکسیڈینٹل پٹرولیم پاکستان خریدی تو مجھے بہت زیادہ امید تھی اور میں اس کا دائرہ وسیع کرنا چاہتا تھا۔اس کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ میں کوئی نئی کمپنی خریدتا۔اسکاٹ لینڈ کی سب سے بڑی توانائی کمپنی ''برما آئل (Burmah OIL)'' پاکستان پیٹرولیم لمیٹڈ میں اپنے انتظامی حصص فروخت کرنے کو تیار تھی۔میں نے 1990ء کی دہائی کے وسط میں ان کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے اور حکومت سے درکار اجازت حاصل کر لی۔پھر 1996ء میں حکومت تبدیل ہوگئی اور صدر فاروق لغاری نے مزاحمت کی۔نواز شریف کی دوسری حکومت نے میری اس ڈیل کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔وہ اس بات پر تو خوش تھے کہ پاکستان پیٹرولیم اور اس کے اثاثہ جات اسکاٹ لینڈ کے پاس ہوں مگر انہیں یہ بات پسند نہ تھی کہ کوئی پاکستانی یہ حصص خرید لے۔

اس سے کچھ عرصہ پہلے آکسیڈینٹل پٹرولیم پاکستان، جس کا نام تبدیل کر کے اورینٹ پٹرولیم انکارپوریٹڈ (OPI) رکھ دیا گیا تھا اس نے پانچ اضافی کنوؤں کی کھدائی کے حقوق حاصل کر لیے۔ بولی کا عمل مکمل ہونے کے بعد حکومت نے گندا کھیل کھیلا۔ بینظیر کے اقتدار کے دوسرے دور کے وزیر برائے پٹرولیم انور سیف اللہ خان جو غلام اسحٰق خان کے داماد تھے انہوں اچانک 65 ملین ڈالر کی بینک گارنٹی طلب کر لی۔اس کے متعلق کبھی سنا ہی نہ گیا تھا۔محض تیل کی دریافت اور کوئی بھی اثاثہ تلاش نہ کرنے کے باوجود اس بھاری بینک گارنٹی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ میں نے حکومت کو لکھ دیا، ایک پاکستانی کی حیثیت سے مجھے انتقام کا کیوں نشانہ بنایا جا رہا ہے؟ اس کی وجہ یہ تھی ایک بین الاقوامی کمپنی کے حوالے سے آخری منٹ میں اس قسم کی تبدیلی کی کسی بھی قیمت پر اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ چند دنوں بعد مجھے زرداری کی طرف ملاقات کا بلاوا آیا۔اس وقت میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب

میں نے انور سیف اللہ کو پہلے ہی کمرے میں بیٹھے دیکھا۔ وزیر پیٹرولیم نے مجھے کہا کہ تیل کے جو پانچ کنویں مجھے الاٹ کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک سے میں دستبردار ہو جاؤں۔ وہ اسے ایک پولش کمپنی کو دینا چاہتے تھے حالانکہ پیشکشیں داخل کرنے کی تاریخ گزر چکی تھی۔ میں نے محسوس کرلیا کہ یہ سیف اللہ کا کچھ نہ کچھ ذاتی کاروبار ہے میں نے اپنے کندھے اچکاتے ہوئے کہا، ''اگر تم چاہتے ہو تو لے لو۔'' اس کے بعد بھی بینک گارنٹی کی شرط ہٹائی نہیں گئی۔ بالآخر میں نے گارنٹی پیش کردی لیکن اس وقت تک حکومت برخاست کردی گئی تھی۔ نواز شریف کے دوسرے دور (99-1997ء) کے وزیر برائے پٹرولیم چوہدری نثار علی خان نے باقی چار کنوؤں کی الاٹمنٹ بھی منسوخ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے عدالت سے رجوع کیا اور بالآخر نثار علی خان نے کسی سمجھوتے پر پہنچنے کے لیے ایک ملاقات طے کی۔ جس فارمولے کی اس نے پیش کش کی، اس کے نتیجے میں مزید دو کنویں حکومت یعنی سرکاری ادارے آئل اینڈ گیس ڈویلپمنٹ اتھارٹی حکومت کے حوالے ہو جاتے۔ میں رضامند ہو گیا کیوں کہ اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ اب خواہ دو کنویں ہی میرے پاس ہوتے، میں نے کام تو شروع کرنا ہی تھا۔ میں نے تیل دریافت کرنے اور تلاش کرنے کے لیے بین الاقوامی فنی ماہرین کی خدمات حاصل کیں اور ان کو تنخواہیں ادا کرتا رہا حالانکہ وہ کوئی کام نہیں کررہے تھے۔ اب حکومت نے ایک اور شرط رکھ دی کہ چھٹا بلاک جو پہلے ہی او پی آئی کی ملکیت تھا اس کے خطیر حصص ملائشین کمپنی پیٹروناس کو دے دیے جائیں۔ چوہدری نثار نے کہا کہ یہ اسلام آباد اور کوالالمپور کے درمیان باہمی معاہدے کا حصہ تھا۔ مجھے اپنے 75 فیصد حصص، پیٹروناس کو فروخت کرنے پڑے۔

پاکستان میں شفافیت کے فقدان اور گیس دریافت اور تلاش کرنے کی واضح اور غیر مبہم پالیسی کی عدم موجودگی نے مجھے انتہائی دل شکستہ کردیا۔ مقامی کمپنیوں کے ساتھ تعصب آمیز رویہ اختیار کیا جاتا اور بین الاقوامی کمپنیوں کو ترجیح دی جاتی۔ یہ صورت حال میرے لیے انتہائی مایوس کن اور حوصلہ شکن تھی اور میں نے پھر بیرون ملک اس شعبے میں سرمایہ کاری کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ہم نے نویڈا میں ایک نئی کمپنی اوسپرے رجسٹر کروائی کیوں کہ ہم نے

ٹیکساس کے بالکل سامنے میکسیکو کی خلیج میں واقع ، کنووں کے نقشے اور سہ رخی جائزہ دستاویزت پہلے ہی حاصل کر لی تھیں ۔ یہاں ہم نے تیل تلاش کیا، تیل کی پیداوار شروع کی اور اسے ریفائنریوں کو فروخت کرنے کا آغاز کر دیا۔ ہاشو گروپ نے قازقستان کے دشان (Dushan) آئل فیلڈ میں سے ایک کنواں خرید لیا۔ ہم نے اس کے آپریٹنگ رائٹس کینیڈا کی ایک کمپنی پیٹرو قازقستان کے حوالے کر دیے جسے بعد ازاں چائنا نیشنل پٹرولیم کارپوریشن نے اپنے تحویل میں لے لیا۔ اس کی جانشین کمپنی 'پیٹرو چائنا' اب ہماری شراکت دار ہے۔ ہاشو گروپ عراق میں تیل کی تلاش کے لیے سروے کر رہا ہے اور سوڈان میں اس نے تیل کے سات کنووں کی کھدائی کی ہے لیکن ابھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ انڈونیشیا اور فلپائن ہمارے وہ نئے محاذ ہیں جہاں ہم آئندہ برسوں میں جائیں گے۔ مجھے قوی امید ہے کہ ایک دن ہم پاکستان: سندھ، پنجاب اور بلوچستان میں تیل اور گیس کے ذخائر تلاش کر لیں گے اور پھر تیل اور گیس کی پیداوار شروع ہو جائے گی۔ پاکستان میں شاندار شیل گیس کی موجودگی کے امکانات اور اس میں جدید پیش رفت پر میں جوش ہو جاتا ہوں۔

☆☆

میری زندگی کے بقایا سال تیل اور گیس کے کاروبار میں صرف ہوں گے جو میرے نزدیک کاروبار کا آخری شعبہ ہے، جسے میں اور ہاشو فاؤنڈیشن قابل قدر حد تک وسعت دیں گے۔ ہاشو فاؤنڈیشن کا ہاشو گروپ کے کاروبار سے قطعی کوئی تعلق نہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ میں اس کی کوششوں کو مسلسل اپنی معاونت مہیا کرتا رہوں گا جن کے تحت یہ فاؤنڈیشن خاص طور پر پاکستان کے دیہی علاقوں میں صحت، تعلیم، زراعت اور پائیدار ضروریات زندگی جیسے شعبوں میں گہری سماجی سرمایہ کاری کر رہی ہے۔ میں اس سمت میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت صرف کر رہا ہوں۔ میری ذاتی خواہشات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ مجھے عنایت فرمایا ہے، میں اس سے کہیں زیادہ خوش ہوں۔ میں قسمت پر یقین رکھتا ہوں مجھے علم ہے کہ ایک دن جس کے متعلق مجھے علم نہیں اور نہ ہی میں اس کے متعلق کوئی پیشگوئی کر سکتا ہوں، میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ میری روح اپنے ازلی مستقر کی طرف روانہ ہو جائے گی اور اللہ کو جواب

دہ ہوگی۔ میں اس دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہوں گا، میرے پاس دولت نہیں ہوگی، مادی اسباب نہیں ہوں گے، بچے نہیں ہوں گے، دنیاوی تعلقات نہیں ہوں گے اور دوستوں کے جمگھٹے نہیں ہوں گے۔ میں اس صورت حال سے خوفزدہ نہیں۔ میرے ایمان نے مجھے حوصلہ بخشا ہے کہ میں اپنی زندگی ایمانداری اور سچائی کے ساتھ اپنی مرضی سے بے خوف ہو کر بسر کروں۔ میرے ایمان نے مجھے یہ حوصلہ بخشا ہے کہ میں موت سے قطعاً خوفزدہ نہیں۔

میرے ایمان نے ہی مجھے یہ مثبت سوچ بخشی ہے کہ میں پاکستان مستقبل کو انتہائی درخشاں اور روشن دیکھ رہوں۔ اپنے تمام مسائل اور مشکلات کے ساتھ یہ ایک ایسا ملک ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمتیں ہیں۔ پاکستان اللہ تعالیٰ کی قدرتی عنایات سے مالا مال خوش قسمت ملک ہے۔ کثیر زرعی علاقہ، توانائی کے وسائل، معدنی ذخائر، افرادی قوت اور جوہر قابل...... قدرت کی یہ وہ عنایات ہیں جن کے لیے کئی ممالک ترستے ہیں۔ بدقسمتی سے کسی بھی حکومت نے اس ضمن میں نہیں سوچا اور نہ سوچنے کی زحمت گوارا کی کہ ان قدرتی وسائل وعنایات کو پائیدار بنیادوں پر ملکی معیشت کی ترقی اور عام پاکستانی کی خوشحالی کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس حوالے سے سیاستدانوں کی سوچ انتہائی محدود رہی ہے۔ جرنیلوں کی نظریں ہمیشہ امریکہ کی طرف رہیں۔ صرف چند ہی لوگ ایسے ہوں گے جنھوں نے کبھی پاکستان کے متعلق سوچا ہو۔ دو جنگوں کے باعث افغانستان میں ایک نسل تو بالکل ہی معدوم ہوگئی اور پاکستان کو بھی مصائب ومشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔

کچھ پہلوؤں کے لحاظ سے ہمارے معاشرے کو قبل از ضیا اور بعد از ضیا، ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ 1977ء تا 1988ء ضیا الحق کے فوجی راج نے ہمارے معاشرے میں بدترین رجحانات اور تبدیلیوں کو رواج دیا۔ ہم ابھی تک مکمل طور پر ان بدترین رجحانات اور تبدیلیوں سے نجات حاصل نہیں کر سکے۔ ضیا الحق نے ہمیں سپر طاقتوں کی چپقلشوں میں ملوث کر دیا اور یہ باور کرایا کہ جہاد اور اسلام کے نام پر سب کچھ جائز ہے۔ اس نے انتہا پسندی کی تعلیم دینے والے مدرسوں کی سرپرستی کی اور امن، محبت اور عفو ودرگزر کے پیغام کو عام کرنے والے دین اسلام کے روشن خیال پہلو کے برعکس نظریات کے پھیلاؤ کی حوصلہ افزائی

کی ۔اس نے اسلام کے ہر عقیدے کا غلط استعمال کیا۔ مسلمانوں کے ہاں ضرورت مندوں اورمحتاجوں کے لیے زکوٰۃ کا ایک نظام قائم کیا ہے جس کے تحت ایک مسلمان اپنی آمدن کا 2.5 فیصد حصہ اس مد میں دے سکتا ہے۔ ضیاالحق نے زبردستی زکوٰۃ وصول کرنی شروع کردی اور بینک کھاتوں سے اس کی کٹوتی شروع ہوگئی۔اس سے بھی بدتر یہ کہ اس نے زکوٰۃ کی رقم کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ سچے اور پرہیز گار مسلمانوں کے ہاں اس بات کا کوئی تصور نہیں۔ اپنے کئی ایک مذہبی قوانین کے ساتھ ساتھ اس نے ایک ایسا معاشرہ تشکیل دے دیا جس کا تعلق اسلام کی حقیقی تعلیمات سے نہیں بلکہ محض ظاہری پہلوؤں سے تھا۔ بہر حال کسی بھی موڑ پر اور کسی بھی طرح ہمیں ضیاالحق کے اس دور کی باقیات کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ ضیا دور کے اثرات بد کی ہم ابھی تک قیمت ادا کر رہے ہیں۔ کسی بھی موڑ پر اور کسی بھی طرح، ہمیں ضیا اور ضیا ازم کا نظریہ دفن کرنا ہوگا......اور...... اسلام کو اس کی تمام تر زندہ جہتوں اور ان گنت خوبصورتیوں کے ساتھ دریافت کرنا ہوگا۔ ہمیں کسی بھی موڑ پر اور کسی بھی طرح عام پاکستانیوں بالخصوص نوجوان مرد و خواتین کو بااختیار بنانا ہوگا۔ ہمیں پاکستان کی معاشی نشاۃِ ثانیہ کے لیے تمام وسائل، تمام توانائیوں اور تمام ذرائع کو بروئے کار لانا ہوگا۔ ہمیں یہ سب کچھ کرنا ہوگا، حیات اجتماعی کے کسی بھی موڑ پر اور کسی بھی طرح...... مجھے اپنے ہم وطنوں کی اہلیتوں پر اعتماد ہے اور جلد ایک دن آئے گا جب ہم یہ سب ضرور کر پائیں گے۔

مجھے اپنے لوگوں کی لائقِ رشک صلاحیتوں پر بھروسا ہے، میں پاکستان کی بقا اور مستقبل پر یقینِ کامل رکھتا ہوں...... اور......سب سے بڑھ کر میں ذات باری تعالیٰ پر غیر متزلزل ایمان اور یقین رکھتا ہوں۔

باب 13

ایک نئے دَور کا آغاز

پاکستان میں انتخابات مئی 2013ء میں منعقد ہوئے۔ پی ایم ایل (این) نے قومی اسمبلی کی 342 نشستوں میں سے 166 نشستیں جیت لیں۔ نواز شریف وزیراعظم بن گئے اور اس ضمن میں یہ حقیقت بھی ممد ثابت ہوئی کہ ان کے بھائی شہباز شریف نے پنجاب کے وزیراعلیٰ کی حیثیت سے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور صوبائی معیشت کو بحال کیا۔ امن، خوشحالی، بچوں کے لیے معیاری تعلیم، کم قیمتیں ملازمتیں اور بجلی کی فراہمی کی توقعات پر عوام نے ووٹ دیے۔ عوام زرداری اور پی پی پی کے عہد حکومت سے بیزار ہو چکے تھے۔ کسی بھی چیز سے بڑھ کر وہ اس جنگ سے اکتا چکے تھے جس کی انہیں خواہش نہیں تھی یا جو اُن پر مسلط کی گئی تھی۔ 14 جون 2013ء کو میں پاکستان واپس آ گیا۔ ساڑھے چار سالوں میں اپنے وطن کو یہ میرا پہلا سفر تھا۔ اس دن میں انتہائی خوش تھا اور بہت زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ میں اپنے وطن سے اتنی دیر دور رہوں گا۔ زرداری ابھی تک صدر تھا (اس کی مدت صدارت کا اختتام ستمبر 2013ء میں ہوا) لیکن اب وہ ایک بے اختیار شخص تھا۔ جس حکومت کو اس نے بے رحمی سے چلایا تھا...... اب جا چکی تھی...... اور...... نواز شریف نئے وزیراعظم بن چکے تھے۔

میں گھر پہنچا اور برسوں بعد پہلی بار اسلام آباد میں اپنے بستر پر سویا۔ میں نے نئے وزیراعظم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے مجھے اور میری بیٹی سارہ کو خوش آمدید

کہا۔ ان کا رویہ نہایت حوصلہ افزا اور ہمدردانہ تھا۔ وہ میری جلاوطنی کے حالات اور پس منظر سے آگاہ تھے۔ انہوں نے کہا، ''آپ ایک بہادر اور جنگجو آدمی ہیں۔'' میں نے انہیں بتایا کہ خاص طور ایک حکومت جب کسی کو نقصان پہنچانے پر تُلی ہو، اس کے ساتھ لڑنا بہت مشکل ہو جاتا ہے لیکن میں نے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اسے بغیر کسی گلے شکوے، شکایت اور افسوس کے ساتھ برداشت کیا۔ میں نے نواز شریف کو ان نئے ہوٹلوں کے متعلق بتایا جو میں پاکستان میں بنانا چاہتا تھا اور میں نے انہیں یقین دلایا کہ پاکستان میں سرمایہ کاری اور اپنے ملک کے ساتھ میری وابستگی کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ بعد ازاں سارہ اور میں ہوائی جہاز کے ذریعے لاہور آئے اور شہباز شریف سے ملاقات کی۔ میں نے لاہور میں اپنی ذاتی حیثیت سے ایک آرٹ گیلری کے قیام کے لیے معاونت فراہم کی جو اس مفکر شاعر علامہ اقبال کے فلسفے کی عکاس تھی جس نے برطانوی ہند کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا خواب دیکھا اور پاکستان کے بنیادی نظریے کو عملی جامہ پہنانے میں معاونت اور رہنمائی مہیا کی تھی۔ ابتدائی طور پر اس گیلری میں سید صادقین احمد نقوی، جنہیں محض صادقین بھی کہا جاتا ہے، ان کی تصاویر رکھی گئی تھیں۔ پاکستان کے ایک نہایت ہی ماہر، باصلاحیت اور مشہور مصور، صادقین مجھے ذاتی طور پر بھی پسند ہیں۔ ان کا انتقال 1987ء میں ہوا۔ اس گیلری کا افتتاح، 24 جون 2013ء کو شہباز شریف کے ہاتھوں ہوا جو بلاشبہ صادقین اور عظیم اقبالؒ دونوں کو خراجِ تحسین تھا۔

نواز شریف کو ایک بڑا اور مہیب چیلنج درپیش تھا۔ 2014ء کے اواخر میں امریکی افواج افغانستان سے واپس چلی جائیں گی جس کے باعث سکیورٹی کا خلا پیدا ہو جائے گا اور ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں، جن کا اندازہ ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کو معاشی بحران سے نجات دلانے کی ضرورت ہے۔ سابق حکومت نے ملک کے لیے بے تحاشا قرضے چھوڑے۔ انفراسٹرکچر تباہ ہو چکا تھا، توانائی کا بحران شدید تر تھا، اشیائے خورونوش کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھی اور روزگار کے مواقع بالکل بھی نہیں تھے۔ نواز شریف کو ایک بحرانی اور طوفانی صورت حال ورثے میں ملی تھی۔ پاکستان کے زخموں کو مندمل کرنا ان کی

بنیادی ذمہ داری تھی.....نواز شریف کو اس نقصان کی تلافی بھی کرنی تھی جو مشرف کے آخری برسوں اور زرداری کے پانچ سالوں میں پاکستان کو پہنچا تھا۔ میں نے ان کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور میں ہر صبح ان کے لیے دعا کرتا ہوں۔ پاکستان کی خاطر انہیں ہر حال میں کامیاب ہونا چاہیے۔

سچ کا سفر

صدرالدین ہاشوانی

TRUTH
ALWAYS PREVAILS

پاکستان کے ممتاز ترین بزنس مین کی خودنوشت

وہاں پہنچنے پر مجھے بہت لگن سے تعمیر کیا گیا خوبصورت ہوٹل نہیں بلکہ کسی جنگ زدہ علاقے کا منظر دکھائی دیا... میرے سامنے میرے مہمانوں، میرے ساتھیوں اور میرے دوستوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ چہرے جو شناسا تھے، چہرے جن کے ساتھ میں کام کرتا اور ہنستا مسکراتا رہا۔ مگر وہ منظر جس نے مجھے دم بخود کر دیا، 60 فٹ چوڑے اور 20 فٹ گہرے اُس گڑھے کا تھا جو ایک ہزار کلوگرام دھماکہ خیز مواد پھٹنے سے بنا تھا۔ ہوٹل پر حملہ نہیں ہوا تھا... بلکہ اسے تاراج کر دیا گیا تھا۔ لاشیں اور بکھرے انسانی اعضا، خون کے تالاب... قتل عام کا سا سماں تھا۔ میں خود کو مضبوط اعصاب کا مالک سمجھتا تھا جو زندگی میں ایسے کریہہ اور متشددانہ مناظر بارہا دیکھ چکا تھا... مگر جو منظر میں نے اُس روز دیکھا، وہ میری یادداشت پر تاعمر نقش رہے گا۔

ISBN 978-969-652-001-6

Jumhoori Publications